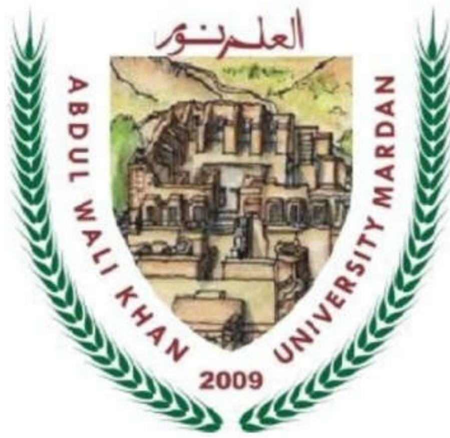
تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اسلامک سٹڈیز

عالمی منشور 1948ء میں انسانی حقوق کے تصور اور سماجی اثرات کا سیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی روشنی میں ایک تقابلی جائزہ



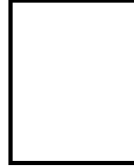
مقالہ نگار: بُرہان الدین

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹرمحمد طاہر

ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز

عبدالولی خان یونیورسٹی مردان،خیبرپختونخوا

اکیڈیمک سیشن:2015ء - 2018ء



فہرستِ مضامین

⋆انتساب⋆

اپنے بہت ہی پیارے والدین
محترم اساتذہ کرام
اوراپنی اولاد کے نام
اِن دعاؤں کے ساتھ

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا

تشکرات

اللہ تعالیٰ کا شکر اداکرتا ہوں جس کی توفیق نے ہر مرحلہ زندگی پر حق کی راہ نمائی نصیب فرمائی،اپنی لازوال نعمتوں سے بہرہ ور فرمایا اور اس قابل بنایا کہ یہ علمی کاوش بخیریت پائہ تکمیل تک پہنچا۔

محسنِ انسانیت،ہادی عالم،نبیَ رحمت سیدنا محمد ﷺ کو درود پاک کا ہدیہ پیش کرتا ہوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں" **وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ**"اور ہم نے آپ کوکسی اور بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہاں کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لیے"الانبیاء107:21"

پروفیسر ڈاکٹر خورشید علی صاحب وائس چانسلر عبدالولی خان یونیورسٹی،مردان کاشکریہ ادا کرتا ہوں جن کی کوششوں سے آج یہ ادارہ کامیابی کی طرف رواں دواں ہے۔پروفیسرڈاکٹرنیازمحمدچیئر مین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز،ڈین فیکلٹی آف آرٹس، عبدالولی خان یونیورسٹی،مردان،سپروائزر پروفیسرڈاکٹر محمدطاہر،جملہ ممبرانِ شعبہ علوم اسلامیہ اور اپنی اہلیہ کو بھی ہدیہ تشکّر پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس مقالے کے تکمیل میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کی۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ

" **رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ**"[البقرۃ127:2]اے اللہ ہم سے یہ خدمت قبول فرما بے شک تو سننے والا(اور)جاننے والا ہے۔

بُرہان الدین
پی ایچ ڈی سکالر

عبدالولی خان یونیورسٹی،مردان

مقدمہ

نحمدہ ونصلیونسلمعلیرسولہ الکریم

اللہ تعالی کا بے پایاں فضل وکرم ہےجس نے ہمیں تمام مخلوقات میں سے "اشرف" پیدا فرمایا۔ اورپھر ایمان کی دولت سےنوازا ۔"عقل" کی دولت سے مالا مال کیا۔اس طرح یہ ایک امتیازی شان عطاء فرمائی ۔فللہ الحمد ولہ المنہ۔

"اسلام"وہ واحد دین ہے جس نے ہر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے اصول وضع کیے۔نیز اسلام نے انسانی حقوق وفرائض کی تکمیل اور حفاظت کا ایک منصفانہ نظام پیش کیا ۔

موضوع کا پسِ منظر

مغرب میں انسانی حقوق کے حوالہ سے جو تاریخ بیان کی جاتی ہے اس کا آغاز ''میگنا کارٹا''[1] سے کیا جاتا ہے۔ ۱۲۱۶ء میں برطانیہ[2] کے کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاہدہ اس عنوان سے ہوا تھا جس کا اصل مقصد تو بادشاہ اور جاگیرداروں کے مابین اختیارات اور حدودکار کی تقسیم تھا لیکن اس میں عام لوگوں کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود تھا، اس لیے اسے انسانی حقوق کا آغاز تصور قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں ایک عرصہ تک حکمرانی کا حق اور اس کے تمام تر اختیارات تین طبقوں کے درمیان دائر رہے ہیں (۱) بادشاہ (۲) جاگیردار اور (۳) مذہبی قیادت۔ ان میں مختلف مراحل میں آپس میں کشمکش بھی رہی ہے لیکن عام شہری اس تکون کے درمیان جو دراصل جبر اور ظالمانہ حاکمیت کی تکون تھی صدیوں تک پستے رہے ہیں، مغرب خود اس دور کو جبر و ظلم اور تاریکی و جاہلیت کا دور کہتا ہے اور اس تکون سے نجات حاصل کرنے کے لیے مغربی دنیا کے عوام کو طویل جدوجہد اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بہرحال ان حکمران طبقات کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں کنگ جان اور جاگیرداروں کے درمیان حقوق و اختیارات کی باہمی تقسیم کے معاہدہ کو ''میگناکارٹا'' کہا جاتا ہے اور مغربی دنیا اسے انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویز قرار دیتی ہے جو ۱۲۱۶ء میں ۱۵ جون کو طے پایا تھا۔

اس کے بعد ۱۶۸۴ء میں عوامی بغاوت کے نتیجے میں انقلابی فوج نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا قانون پیش کیا اور ۱۶۸۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ''بل آف رائٹس'' (حقوق کے قانون) کی منظوری دی جو اس سمت پیش رفت کا اہم مرحلہ تھا۔ ادھر امریکہ[3] میں تھامس جیفرسن نے ۱۲ جولائی ۱۷۷۶ء کو برطانوی استعمار کے تسلط سے امریکہ کی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور ۱۷۸۹ء میں امریکی کانگریس نے دستور میں ترامیم کے ذریعہ عوامی حقوق کو دستور کا حصہ بنایا۔فرانس[4]میں زبردست عوامی جدوجہد اور بغاوت کے ذریعہ ۱۷۸۹ء کو جاگیرداری، بادشاہت اور ریاستی معاملات میں چرچ کی مداخلت کو مسترد کر کے قومی

---

[1] میگنا کارٹا:انسانی تاریخ کی ایک اہم قانونی دستاویز ہے۔اس کے ذریعے برطانوی عوام نے1215ء میں رنی میڈ کے مقام پر اپنے بادشاہ "جان" کو مجبور کیا کہ وہ یہ مانے کہ وہ قانون سے بالاتر نہیں ہے۔جان نے اس دستاویز کے ذریعے اس بات کو مانا۔میگنا کارٹا نے تاریخ عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔
. MAZHAR-UL-HAQ,PoliticalScience,Theory and Practice,Page#13,Book land,Lahore,1991

[2] برطانیہ(United Kingdom of Bratain)شمال مغرب یورپ کا ایک ملک ہے۔یہ جزیرہ برطانیہ اور شمالی آئر لینڈ کے علاوہ ملحقہ سمندر کے مختلف جزائر پر پھیلا ہوا ہے۔اس کے چاروں طرف بحر اوقیانوس اور اس کے ذیلی بحیرے ہیں جن میں بحیرہ شمال،رودبار انگلستان،بحیرہ سیلٹک اور بحیرہ آئرش شامل ہیں۔برطانیہایک سیاسی اتحاد ہے جوانگلستان،اسکاچستان،ویلز اور شمالی آئرلیند سے مل کر بنا ہے۔اس میں آئینی بادشاہت ہے۔یہ ملک جی8 ممالک کا رکن ہےیورپ کی دوسری سب سے بڑی معیشت ہے۔اس کی آبادی60-2ملین ہے۔(آزاد دائرۃ المعارف،مملکت متحدہ2018/08/13)

[3] ریاستہائے متحدہ امریکہ United States of America :یہ ملک براعظم شمالی امریکہ میں واقع ہے۔امریکہ کے شمال میں کینیڈا،جنوب میں میکسیکو،مغرب میں بحرالکاہل اور مشرق میں بحر اوقیانوس واقع ہے۔52ریاستوں پر مشتمل ہے۔ دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی ہے۔کل رقبہ 37لاکھ مربع میل ہے۔روس کے زوال کے بعد دنیا میں امریکی اثرورسوخ بڑھی۔طرز حکمرانی آئینی جمہوری ہےاقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کے مستقل رکن ہے۔
(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

[4] جمہوریہ فرانس: یہ مملکت یورپ کے مغربی حصے میں واقع ہے ۔جس کا صدر مقام پیرس ہے اس کے آس پاس ممالک میں بلجیمم ،جرمنی،اٹلی ، سپین ،برازیل۔اور نیدر لینڈ ہیں۔طرز حکومت نیم صدارتی جمہوری ہے۔دنیا کی پانچویں بڑی معیشت کی حامل اور ایک جدید ترقی یافتہ ملک ہے۔یورپی یونین اور نیٹو کاحصہ ہے اقوام متحدہ کے بانی رکن کی حیثیت سے سلامتی کونسل کا مستقل رکن ہے۔دنیا کی سات ایٹمی طاقتوں میں سے ایک ہے۔(https://ur.wikipedia.org/wiki/ مورخہ11/11/2017

اسمبلی نے شہری حقوق کا قانون "ڈیکلریشن آف رائٹس آف مین" منظور کرایا اور پورے سیاسی اور معاشرتی نظام کی کایا پلٹ دی۔ اسے ''انقلابِ فرانس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغرب میں ظلم و جبر اور حقوق کے درمیان اسے حد فاصل قرار دیا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے ذریعہ نہ صرف بادشاہت اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ ہوگیا بلکہ اقتدار میں مذہبی قیادت کی شرکت کی بھی نفی کر دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چرچ، پوپ اور مذہبی قیادت نے عوام پر بادشاہ اور جاگیرداروں کی طرف سے ہونے والے دوہرے مظالم اور شدید جبر و تشدد میں عوام کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا تھا اور مذہب عملاً بادشاہت اور جاگیرداری کا پشت پناہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس لیے بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ پوپ کی سیاسی قیادت کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا اور نئے نظام میں ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ مذہب اور چرچ کا تعلق انسان کے عقیدہ، عبادت اور اخلاقیات کے ساتھ رہے گا جبکہ سیاسی و معاشرتی معاملات میں رائے دینے، راہ نمائی کرنے اور مداخلت کرنے کا مذہب، پادری اور چرچ کو کوئی حق نہیں ہوگا۔ اسی کو آگے چل کر ''سیکولرازم'' سے تعبیر کیا گیا اور معیاری نظام قرار دے کر پوری دنیا سے اسے اختیار کرنے اور اس کی پابندی کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرہ میں یورپی ممالک یعنی برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے درمیان جنگ ہوئی جس میں پوری دنیا بالواسطہ یا بلا واسطہ لپیٹ میں آگئی، اس لیے اسے ''جنگ عظیم اول'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں عالم اسلام کی نمائندہ حکومت ''خلافت عثمانیہ'' نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا چنانچہ جرمنی کے ساتھ ساتھ وہ بھی شکست سے دوچار ہوگئی تھی اور نتیجے میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ جنگ عظیم اول میں لاکھوں انسانوں کے قتل ہو جانے کے بعد اقوام و ممالک کی ایک بین الاقوامی تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی تھی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقوام و ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو جنگ کی صورت اختیار نہ کرنے دی جائے اور اس بین الاقوامی فورم کے ذریعہ ان تنازعات کا حل نکال کر قوموں اور ملکوں کی باہمی جنگ کو روکا جائے، لیکن ''لیگ آف نیشنز'' اپنے اس مقصد میں ناکام ہوگئی اور بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگ بپا ہوئی جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف جبکہ برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اس جنگ نے پہلی جنگ سے زیادہ تباہی مچائی اور اس کے آخری مراحل میں امریکہ نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہو کر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جس پر جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں ایک اور بین الاقوامی تنظیم اقوام متحدہ (United Nations) کے نام سے وجود میں آئی جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ بین الاقوامی معاملات کا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔

"انسانی حقوق" کی موجودہ اصطلاح زیادہ پرانی نہیں بلکہ اس اصطلاح نےاُس وقت زیادہ شہرت حاصل کی جب جنگ عظیم اول ودوم میں انسانی جانوں کو ایک عظیم دھچکا لگا تھااور بہت بڑی تعداد میں انسانی جانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔

چنانچہ اس تناظر میں 10دسمبر1948ء میں اقوامِ متحدہ کے عالمی فورم پر "انسانی حقوق کا عالمی منشور" کے نام سے ایک منشور پاس ہوا جو کہ 30دفعات پر مشتمل ہے جس

میں فرد کی آزادی،معاشرے کے افراد میں مساوات اورمعاشرے میں عدل وانصاف کے قیام کے بارے میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔اور جسے آج کی دنیا "انسانیت کا معیار" قرار دے کربڑے زور وشور سے اس کی تشہیر کر رہی ہے ۔

اس منشور میں انسانی حقوق کےاحترام کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اس بات پر بہت زور دیاگیا ہے کہ انسان کو اُس کے بنیادی حقوق ملنے چاہئیےتمام انسانوں کو بلا امتیاز اُن کے جائز حقوق دینے میں تامل نہیں کرنا چاہئیے ۔اور ان حقو ق کی ادائیگی میں رنگ،نسل،زبان،جنس اور مذہب کی تمیز روا نہیں رکھنی چاہئیے۔

حقو ق کے حصول کی بنیادی ذمہ داری "جنرل اسمبلی" پر عائدکی گئی ہے جس کے لئےباقاعدہ ایک کمیشن تشکیل دیا گیا ہے جس کاکام یہ ہے کہ وہ باقاعدہ رپورٹ تیار کرکے اپنی سفارشات پیش کرتا ہے۔ یہ کمیشن سالانہ مجلس عاملہ کے گروپ کا قیام عمل میں لاتا ہے جس میں اس بات پر انتہائی غور وخوض سے کام لیاجاتا ہے کہ "انسانی حقوق" کے سلسلے میں جوخلاف ورزیاں اور کوتاہیاں برتی جاتی ہیں اس کے صحیح طریقے سے روک تھام ہو سکے اور آئندہ کے لیے اس کا صحیح رخ متعین کیا جاسکے[1] ۔
عالم اسلام کے اکثر ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہونے کی حیثیت سے اُس کے معاملات ،پاس کردہ قوانین اور نافذکردہ فیصلوں میں برابر کے شریک ہیں۔ لیکن اس حوالے سے عالم اسلام کے باشعور حلقوں میں دوطرح کے تحفظات پائے جاتے ہیں ۔

1۔ اقوام متحدہ نے اپنے فورم میں سے جن پانچ ممالک کاانتخاب کرکے ان کو قانون سازی کرنے اور یہاں سے نکلنے والے فیصلوں کے نفاذ کااختیار دیا ہے اُن میں عالم اسلام میں سے کسی بھی ملک کو شامل نہیں کیاگیا ۔

2۔اس منشور کو مغربی افکار ونظریات کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیاگیا ہے جس کی وجہ سے بہت سےدفعات کا شریعتِ اسلامیہ کے احکام سے کھلا تصادم ہے ۔ اوراگر ان دفعات کو عملی شکل دی جائے تو قرآن و سنت کے بہت سے احکامات سے مسلمانوں کو ہاتھ دھونا پڑے گا(جس کی تفصیل مقالے میں آئے گی،ان شاء اللہ)جس کے لیے عالم اسلام میں سے کوئی بھی کسی صورت میں تیار نہیں ہے[2]۔

---

[1]اس موضوع پر متعلقہ کمیشن نے اقوام متحدہ کی دوسرے آرگنائزیشن ILO اور یونسکو کے ساتھ ملکرانسانی حقوق کےحفاظت کیلئے اصول بنائے ہیں۔ جن میں اہم ترین حقوقِ انسانی کایونیورسل منشورسول اور سیاسی حقوق کاانٹر نشنل اور اقتصادی، معاشی اورتہذیبی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ 1976کو متفقہ طور پرعالمی بل برائے حقوق کا نام دیا گیا۔ یہ تینوں قوانین اقوام متحدہ کے منشور کی انسانی حقوق کی دفعات کی تشریح و تعبیر کیلئے اہم راہنمائی دیتے ہیں۔انسانی حقوق کاعالمی منشورجسے 10دسمبر 1948کواقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے منظور کیا۔ اس سے یہ مشتہر کرنا مقصود تھا کہ ایک مشترکہ معیار دنیا کے اقوام کے لیے وضع کیا جائے۔ چونکہ یہ کوئی معاہدہ نہیں اس لئے قانونی طور پراس کی کوئی افادیت نہیں۔ بنیادی حقوق کی تعریف میں یہ 30دفعات پر مشتمل ہے۔

[2]اقوام متحدہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ عالم اسلام کو اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی اور فیصلوں کے نفاذ کے نظام میں شریک کیا جائے اور انسانی حقوق کے منشور پر نظر ثانی کی جائے۔ اگر اس وقت عالم اسلام کی دیگر حکومتیں ان کا ساتھ دیتیں تو اس سلسلہ میں مؤثر پیش رفت ہو سکتی تھی لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور موجودہ صورت حال میں اب بھی اس کا بظاہر کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

اسی تناظر میں دیکھتے ہوئے مسلم امہ کہتی ہے کہ عالم اسلام کے بارے میں یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی تشکیل ،انتظام اور معاہدات میں برابر کے شریک ہے۔کیونکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں عالم اسلام کو نمائندگی نہ دینے سے عالم اسلام کے ممالک اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ عالم اسلام کو صرف زبانی جمع خرچ کے طور پر رکھا گیا ہے[1]۔

نیز ایک اہم بات یہ بھی ہے۔کہ اقوام متحدہ مذہبی آزادی،مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تحفظ کی علمبردار ہونے کے ناطے ایسے قوانین بنا نے سے گریز کریں جس سے مذہب میں دخل اندازی ہوتی ہو،یامذہب کی آزادی میں خلل آتا ہو۔کیونکہ اُن کے پاس کسی بھی مذہب کی حدودکو پامال کرنے یاطریقۂ کار متعین کرنے یا کمی بیشی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مشکلۃ البحث(Research Problems)

تحقیق ایک مشکل کام ہے جس میں بنیادی مصادر اوراصل مواد تک رسائی انتہائی ضروری ہوتیہے۔زیر بحث موضوع کے اندردورانِ تحقیق جن مقامات میں مشکل پیدا ہوسکتی ہے اُن میں:

1:۔موضوع زیرِ بحث پر کافی سارا مواد موجود ہے لیکن عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء میں مذکور ترتیب سے اردو میں کوئی ایسی کتاب نظر سے نہیں گزری ہے جس میں شق وار منشور کے دفعات کا شرعی جائزہ لیا گیا ہو ۔

2:۔اقوام متحدہ کے منشور برائے انسانی حقوق 1948ء کے اصل نص تک پہنچنا اور اُس سے حوالہ دینابھی باحث کے لیے مشکل امور میں سے ہے۔

3:۔اسی طرح منشور میں اسلامی نقطہ نظر سے جو امورقابل مواخذہ ہیں اُن پر بھی کافی مواد موجود ہیں لیکن دورِجدید کی اصطلاح میں اُن مواد کا تذکرہ انتہائی کم ہے۔

4:۔"اجتہاد"کے فقدان نے یہ مسئلہ بھی پیدا کیا ہے کہ منشور میں مذکور بعض قابل مواخذہ دفعات پر جب بحث کی جائے گی تو اگرچہ اُس حوالے سے مواد موجود بھی ہو لیکن اصولِ تحقیق کے مطابق صراحۃ اُس کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے حوالہ دینے میں مشکل پڑے گی۔

سوالاتِ تحقیق(Reaserch Questions)

اس مقالے میں انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کا شق وارجائزہ اسلامی شریعت کی روشنی میں لیا جائے گا۔کہ

1:کیا زیرِ بحث موضوع اس قابل بھی ہے کہ اِس پرپی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کیا جائے؟

2:۔حق کی لغوی واصطلاحی تعریف ذکر کرنے کے بعد قرآن وآحادیث میں حق کے اطلاقات کیاہیں؟

3:۔انسانی حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کیا ہیں ؟اور عملی طور پر محسنِ انسانیت، نبئ رحمت محمد رسول اللہ ﷺ نے حقوقِ انسانیت کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار فرمایاتھا؟

---

[1] اس وجہ سے مسلمانوں کے عالمی تنظیم"او آئی سی"کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عالم اسلام کو باقاعدہ نمائندگی دے کر اپنے اس فرض منصبی سے سبکدوشی کا مظاہرہ کرے۔

4:عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ء کے دفعات کیاہیں؟شرعی نقطہ نظر سے متفقہ اور مختَلف فیہ امور کیا ہیں؟نیزمختَلف فیہ امور میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

5:ماضی قریب کی اس انسانی کاوش (عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ء)کو کیوں اتنی اہمیت دی جاتی ہے؟حالانکہ انسانیت کو انسانوں کی بندگی سے نکالنے اور خالقِ کائنات کی بندگی میں لانے کے لیے صدیوں پہلے اللہ تعالٰی نے"اسلام" کی شکل میں قانونِ نجات نازل فرمایا تھا۔

6:منشور کے تحت فرد کی آزادی اورمذہبی رواداری کے نام پر"اسلام"اور"مسلمان" کو مطعون تو نہیں کیا جارہا؟

7:۔ منشور کے بارے میں امت مسلمہ کے تحفظات کیا ہیں؟ اور اس منشور کو مکمل طور پر قبول کر لینے کی صورت میں مسلم امہ کوکیا خدشات ہیں ؟اور اس کی عملی تطبیق میں مسلمانوں کو کیا نقصانات اٹھانے پڑیں گے؟۔

قضیہ تحقیق (Statement of the Research Problem)

چوں کہ دور حاضر میں ہر سطح پر حقوق کے لئے آواز اٹھائی جارہی ہےجس کے لئے مختلف فکری بنیادیں ہوتی ہیں ۔ان میں ایک فکر اجتماعی دانش اورسماج کی اکثریتی سوچ ہے ۔اس نقطہ نظر نے حقوق کے تعین کے ساتھ ان گنت نظریاتی ،علاقائی اور خانگی مسائل کو بھی لاکھڑا کردیا ہے ۔جن کی نشاندہی کرنا اور اس بارے میں اسوہ نبوی پیش کرنا ضروری تھا تاکہ دونوں کا تقابل کرکے ان کی حیثیت واضح کی جائے۔

اہداف (Objectives)

۱۔عالمی منشور برائے انسانی حقوق کا تعارف پیش کرنا

۲۔ عصری سماج اور اسلامی تعلیمات میں حقوق کا تصور واضح کرنا

۳۔عالمی منشور کے دفعات کا تعلیمات نبویعلی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابل کرنا

۴۔منشور کے اندر اسلامی اصولوں سے متصادم دفعات کی نشاندہی کرکے ان کا تنقیدی جائزہ لینا

۵۔منشور کے سماجی اثرات کا جائزہ لینا

اہمیتِ موضوع (Significance of the Topic)

موضوع زیر بحث ایک سماج مذہبی موضوع ہے جو بیک وقت سماج اور مذہب دونوں پہلووں کا احاطہ کرتا ہے ۔عالمی منشور کا دیباچہ معاشرے کی اجتماعی فکر کی غماز ہے جس میں مذہب کو درخوراعتناء نہیں رکھا گیا ہے ۔اسلام کے اندر حقوق کاتصور پختہ اور اس کے ثمرات مثبت ہیں جس کی نشاندہی کرنا دینی اور عصری لحاظ سے مفید کاوش ہے۔

سابقہ تحقیقات کا جائزہ(Review of Previous Literature)

اس موضوع پر اردو زبان میں تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے تا ہم عربی زبان میں اس موضوع پر کام کیا گیا ہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے :

1.جامعۃ اسلامیہ غزہ فلسطین کے کلیۃ اصول الدین کے زیر نگرانی "الرعایۃ الاجتماعیۃ فی السنۃ النبویۃ دراسۃ موضوعیۃ" کے نام سے ولید ابراہیم محمد الغرباوی نےاس موضوع پر کا م کیا ہے۔

2:-"حقوق الانسان فی الاسلام والرد علی الشبہات المثارۃ حولہا" کے نام سے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ کے استادڈاکٹر سلیمان بن عبدالرحمٰن الحقیل نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔

3:-"کتاب مدخل الی الرعایہ الاجتماعیۃ من منظور اسلامی(تالیف)ڈاکٹر محمد سید فہمی۔ اس کتا ب میں چھ فصول ہیں جس کے

(الف) فصلِ ثالث میں پُرانے زمانے کے معاشروں میں اجتماعیات کا مفہوم،اس کا فلسفہ اوراس کی تدریجی ترقی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے

(ب)فصلِ سادس میں اسلام میں بعض سماجی امور کا ذکر ہے جیسے
اپنےکُنبے،مریضوں،یتیموں اور بوڑھوں کے سماجی حقوق ۔

اِن دونوں فصلوں میں مصنِّف نے موضوع سے متعلق بعض آیاتِ قرآنیہ اور مختصر تعداد میں احادیثبھی ذکر کی ہیں ۔

4:.ایک کاوش یہ بھی ہے۔"حقوق الانسان بین تعالیم الاسلام واعلان الامم المتحدہ" یہ کاوش شیخ محمد غزالی کی ہے۔

اردو میں اس موضوع پر بھی کام ہو اہے جیسا کہ

4:-انسانی حقوق کا جدید مغربی تصور:اسلامی تعلیمات کی روشنی میں،یہ پی ایچ ڈی سطح کا ایک مقالہ ہے جو شعبہ علوم اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی میں ڈاکٹر سعیدالرحمان کے زیر نگرانی محمدسلیم نے لکھا ہے۔

5:-اسی طرح 2000ء کےپی ایچ ڈی سطح کا ایک دوسرا مقالہ ہے"بنیادی انسانی حقوق اور مذاہبِ عالم"مقالہ نگار سیف اللہ نے ڈاکٹر حمیداللہ عبدالقادر کے زیر نگرانی شیخ زاید اسلامک سنٹرSZISپنجاب یونیورسٹی،قائداعظم کیمپس میں یہ مقالہ لکھا ہے۔

6:- شعبہ علوم اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ہی کے ایک سکالر محمدسلیم نےبھی اس موضوع پر "بنیادی انسانی حقوق کا مغربی تصور(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)"پر کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے۔

7:- جب کہ حال ہی 2015ءمیں شعبہ علوم اسلامیہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹیBZUکے ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب کے زیر نگرانی ایک سکالر عبدالرحیم نے"بنیادی انسانی حقوق کی امریکی پالیسی:عہدفاروقی کی عالمی فتوحات کے تناظر میں"کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے۔

ان تمام کاوشوں میں ایک ہی بات مشترک ہے کہ کسی بھی کتاب یا مقالے میں زیر بحث موضوع یعنی"عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی جائزہ"یکجا طور پر مذکور نہیں ہے بلکہ یا تو اسلامی تعلیمات سے کوئی شق لی گئی ہے اور صرف اُسی کے حولے سے عالمی منشور کے کسی ایک یا دو دفعات کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور یا توعالمی منشور کے کسی مختلف فیہ دفعے کو زیر بحث لاکر اس کا تقابل اسلامی تعلیمات سے کیا گیا ہے۔جب کہ موضوع زیر بحث میں باحث کا طرزِ اِن مذکور کاوشوں سے الگ ہو گا کیونکہ:

الف۔عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ءمکمل طور پر ذکر کیا جائے گا۔

ب۔منشور کے ہر دفعے کا شق وارجائزہ لیا جائے گا جہاں کوئی دفعہ اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوگاوہاں دفعے کی خامی ذکر کی جائے گی اور متبادل طور پر اسلامی تعلیمات ذکر کئے جائیں گے۔

ج۔منشور اور اسلامی تعلیمات کے آپس میں جو مشترکات ہوں گے اُن کوخصوصی طور پر ذکر کیا جائے گا۔

د۔دنیا کی جدید اصطلاح میں منشور کے سماجی اثرات کا اسلامی تعلیمات سے تقابل کرتے وقت دنیا کی جدید اصطلاح کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے گا۔

ہ۔اقوامِ متحدہ کا دوغلا کردار واضح کیا جائے گا کہ ایک طرف منشور کا سہارا لے کر محکوم قوموں پر ناجائز دباؤ کے ذریعے طاقتور اقوام اپنے مفادات حاصل کرتی ہیں لیکن دوسری طرف کمزور ریاستوں اور اقوام کو اُن کا جائز حق دینے کے لیے اقوام متحدہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کی ہوئی ہے۔

و۔اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف منشور کا سہارا لے کر مغرب متفق ومتحد نظر آرہا ہے جب کہ مسلمانانِ عالم اپنے اہم ترین مسائل سے مکمل طور پر بے توجہی کے شکار ہیں۔مقالے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ کے مسائل کی نشاندہی اور اُن کے حل کے لیے قابل عمل سفارشات پیش کیے جائیں گے۔

منہجِ تحقیق (Research Methodology)

تحقیق کے دوران میرا منہج استقرائی ہوگا جس میں موضوع سے متعلق مواد تلاش کرکے تحقیقی انداز میں مرتب کیا جائے گا ۔ تفسیر، حدیث ،سیرت کے علاوہ عصری علمی ذخیرہ سے استفادہ کیا جائے گا ۔علماء اور دانشور وں سے ملاقات کے ذریعے معلومات جمع کی جائیں گی ۔

منصوبۂتحقیق (Work Plan)

یہ مقالہ تین ابواب اور چودہ فصلوں پر مشتمل ہے ۔بابِ اول "عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء"سے متعلق ہے جس کی :

<u>فصل اول</u> میں "حق اور انسان"کی لغوی و اصطلاحی تعریف کی گئی ہے،

<u>فصلِ دوم</u> میں "اسلامی تعلیمات اور عالمی منشور میں انسانی حقوق کا تصور"پیش کیا گیا ہے ،

<u>فصلِ سوم</u> میں عالمی منشور کی تمہیداوراس کے دفعہ نمبر ۱تا دفعہ نمبر۱۵کاتعارف جبکہ

<u>فصلِ چہارم</u> میں عالمی منشور کے دفعات۱۶تا۳۰ کاتعارف ذکر کیاگیا ہے۔

بابِ دوم میں " سیرتِ نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں سماجی حقوق"کا بیان ہے جس کی:

<u>فصل اول</u> میں کنبے،خاندان اور بچوں کے سماجی حقوق،

<u>فصل دوم</u> میں عورتوں،میاں بیوی ، والدین اور دیگر رشتہ داروں کے سماجی حقوق،

<u>فصل سوم</u> میں جوانوں ، عمررسیدہ اور بزرگوں کے سماجی حقوق،

<u>فصل چہارم</u> میں یتیموں ، فقراء ومساکین، مریضوں کے سماجی حقوق اور

<u>فصل پنجم</u> میں خدّام ، طلباء وعلماء، ہمسایوں، اولوالامراور غیر مسلموں کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں۔

باب سوم میں "سیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا عالمی منشور برائے انسانی حقوق۱۹۴۸ءسے تقابلی جائزہ اور سماجی اثرات"ذکر کئے گئےہیں جس کی:

<u>فصل اول</u> میں عالمی منشور کی تمہید کاسیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ اور سماجی اثرات"بیان کئے گئے ہیں ۔

<u>فصل دوم</u> میں عالمی منشور کے دفعہ ۱تادفعہ ۱۰ کاسیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ،

<u>فصل سوم</u> میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق ۱۹۴۸ءکے دفعہ ۱۱تا دفعہ ۲۰ کاسیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ،

<u>فصل چہارم</u> میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق ۱۹۴۸کے دفعہ ۲۱تادفعہ ۳۰کاسیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ اور

<u>فصل پنجم</u> میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق ۱۹۴۸ءاورسیرت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے مشترکات کو ذکر کیا گیا ہے۔

آخر میں خلاصۂ بحث اور نتائجِ بحث ذکر کئے گئے ہیں اور اس موضوع پر مزید کام کرنے کی تجاویزو سفارشات پیش کی گئی ہیں۔اس کے بعد علمی و فنی فہارس اس ترتیب سے دئے

گئے ہیں۔ فہرست آیات،فہرست احادیث و آثار،فہرست رواۃ، فہرست اعلام، فہرست بلاد و ا
ماکن، فہرست مصادر و مراجع۔

منہجِ مقالہ:مقالے کا منہج یوں رکھا گیا ہے :

1۔ سب سے پہلے موضوع سے متعلق قرآنی آیات ذکر کی گئی ہیں۔

2۔آیات کاترجمہ"فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ" کےترجمے سے کیا گیا ہے۔

3۔جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں مختلف تفاسیر سے اُس کی مزید وضاحت اور مفسرین کے مختلف اقوال بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

4۔موضوع سے متعلق دوسرے نمبر پر احادیث لائی گئی ہیں۔

5۔احادیث میں تر تیب یہ رکھی گئی ہے کہ سب سے پہلے صحیحین کی احادیث ذکر کی گئی ہیں(چونکہ صحیحین کی احادیث کی صحت پر تمام امت کااتفاق ہے اس وجہ سے اُن احادیث پر حکم نہیں لگایا گیا۔

6۔صحیحین کے بعدسنن ابوداؤد،سنن ترمذی،سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی احادیث ذکر کی گئی ہیں ۔

7۔صحاح ستہ کے بعد موضوع سے متعلق حدیث جہاں سے بھی ملی ہے وہاں سے لی گئی ہے ۔اور اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔8۔ احادیث ذکر کرنے کے بعد اہل جرح وتعدیل کا حکم لگایا گیا ہے۔

9۔ عام طورپر ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ ایک حدیث کوکئی دفعہ ذکر کیا گیا ہے لیکن ہر بار موضوع اور عنوان سے متعلق الگ الگ ذکر کی گئی ہے۔

10۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ "صحیحاحادیث "ذکر ہوں۔اسی طرح اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ جو حدیث ذکر کی گئی ہے وہ مکمل ہو ۔

11۔احادیث کی تخریج اس طرح کی گئی ہے کہ ،پہلے کتاب کے مصنف کانام ذکر کیاگیا ہے،پھرکامہ(،)لگاکرمصنف کی کنیت ذکر کی گئی ہے پھر کامہ لگاکر تصنیف/تالیف کانام لکھا گیا ہے،پھر کامہ لگا کرکتاب پھر باب اورآخر میں حدیث نمبر ذکر کیاگیا ہے مثلا:محمد بن اسماعیل ،ابوعبداللہ،صحیح بخاری،کتاب الایمان،باب ای الاسلام افضل،رقم:11۔

12۔حدیث پر حکم لگانے کے لیے زیادہ تر "علامہ البانی رحمہ اللہ"کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

13۔رواۃِ حدیث میں زیادہ تر آخری راوی یعنی صحابی کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

14۔ہرصفحے کے حوالے اُسی صفحے پر دئے گئے ہیں۔

15۔ہر عنوان کو الگ ذکر کیا گیا ہے۔جس کے ذیلی عنوانات (اـب۔ج۔د۔وغیرہ)یا(1،2،3،4،5،6)سے دئے گئے ہیں۔

16۔ آخر میں فنی فہارس کو تحریر کیا گیاہے۔

چونکہ تحقیق ایک مشکل کام ہے جس کے لیے میں نے ہر مرحلے پر اپنے اساتذہ کرام اوراحباب سے مددلی۔بالخصوص میرے سپروائزر ڈاکٹرمحمدطاہر نے تحقیق کے اس مشکل سفر میں میرا مکمل ساتھ دیا اور ہر کٹھن مرحلے پر میری راہ نمائی کرکے میری حوصلہ افزائی کی ۔ان تمام خواتین وحضرات کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے تعاون اور مفید مشوروں سے یہ مقالہ پائہ تکمیل تک پہنچا۔

مقالے کے مواد کی فراہمی میں تعاون پر میں پروفیسر عبدالرحیم اور پروف ریڈنگ پر مفتی محمدصدیق کا انتہائی شکر گزار ہوں۔اللہ تعالیٰ میری اس ناقص کاوش کو اپنے فضل سے قبول فرماکر میرے والدین،اہل وعیال،تمام اساتذہ کرام اورمیرے لیے نجات کاذریعہ بنائے اور عبدالولی خان یونیورسٹی مردان کے لیے نیک نامی کا ذریعہ بنائے۔(آمین)

بُرہان الدین

بابِ اوّل

عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ء کا تعارف

فصل اول

حق اور انسان کا لغوی واصطلاحی مفہوم

اس فصل میں پہلے ہم لفظِ"حقوق"اور لفظِ"انسان" کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں گے۔

"حقوق " حق کی جمع ہے ۔اور لغت میں حق بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتاہےجیسے:الحق:اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔اسی طرح قُرآن،ضد الباطل،فیصلہ شدہ امر،عدل،اسلام،مال،صدق،حقیقۃ الامر اورموت کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں: **عندحقِّ لقاحهاويكسرأي حين ثبت ذلك فيها**[1] " دودھ والی اونٹنی پر حق ثابت ہونے کے وقت کہتے ہیں۔اور "حق" کو کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی جب اس میں حق ثابت ہوجائے۔"

---

[1]: محمد بن یعقوب،الفیرزآبادی،القاموس المحیط، ج3،ص228،داراحیاء التراث العربی،1417ھ

ان مذکورہ معانی میں لغوی اعتبار سے موضوع کے قریب تر معنی "الامر الواجب اور الشیء الثابت" ثابت شدہ کام/چیز "ہے جیسا کہ علامہ جوہری [1]سے منقول ہے:

"وحق الشيءيحِقُّبالكسر،أيوجب،لازم ہوا وأحققتالشيء،أيأوجبته،اورتو نے اس چیز کو ثابت یعنی لازم کردیا"

واستحققتهاور تو نے اس حق طلب کیا "[2]اس قول کی تائید ابن منظور [3]کے قول سے بھی ہوتی ہے،فرماتے ہیں: **وحق الشيءيحقُّ،بالكسر،حقاً: أيوجب** لازم ہوا ،**واستحق الشيء:استوجبه: أياستوجبته** [4]اور اس چیز کا مستحق ہوا۔

اور کہا گیا ہے کہ:الحق: "**خلاف الباطل**"جو کہ مصدر ہے[5]۔علامہ مناوی [6]کہتے ہیں: **الحق لغة: الثابت الذي لايسوغ إنكاره**[7]حق لغت میں ثابت شدہ چیز کو کہا جاتا ہے جس میں انکار کی گنجائش نہ ہو

انگریزی میں حق کے لیے"Right"کالفظ استعمال ہوتا ہے جس کے بارے میں مفکرین کے مختلف اقوال ہیں جیسا کہ:"

"Rights are those Conditions of the social life without which no man can seek, an general,

to be himself at his best[8]"

حقوق سے مراد سماجی زندگی کے وہ حالات یا شرائط ہیں جن کے بغیر عام طور پر انسان اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا۔

اور ایک تعریف یہ بھی ہےکہ:

"A Right is a reasonable claim of freedom in the exercise of certain activities[1]"

---

[1]اسماعیل بن حماد؛جوہری،لغت کے امام گزرے ہیں،وطنِ اصلی فاراب تھا۔۳۹۳ھ کوپیدا ہوئے اور۱۰۰۳ھ کو وفات پا گئے۔لغت،عروض اور نحو میں بھی اُن کےتصانیف موجود ہیں۔{خیرالدین بن محمود،الزرکلی،الاعلام ج۱:ص۳۱۳،دارالعم للملائین،2002ء}

[2] اسماعیل بن حماد،الجوہری،الصحاح:۴:۱۴۶۱،دارالعلم للملائین1376ھ

[3]محمد بن عبید اللہ بن محمد،ابو بکر،ابن منظور،القیسی۷۵۰ھ کو پیدا ہوئےادیب تھے اصل میں اشبیلیہ کے تھے قاضی بھی رہ چکے تھے،۱۳۴۹ھ کو طاعون میں وفات پا گئے(الاعلام ج۶،ص۲۶۰

[4]محمد بن مکرم،ابن منظور افریقی،لسان العرب،ج10،ص49،داراحیاء التراث العربی بیروت،1408ھ

[5]احمد بن محمد،الفیومی، المصباح المنیرفی غریب الشرح الکبیر:ص۵۵،دارلکتب العلمیہ،بدون تاریخ

[6]محمد عبد الرؤوف بن تاج العارفین،مناوی ۔952 ء: 1545ھ کو پیدا ہوئے۔ کبار علماء دین والفنون میں سے تھے۔بہت کم کھاتے تھے،قاہرہ میں زندگی گزاری۔80 کے قریب تصانیف فرماگئے۔جن میں (کنوز الحقائق)،(التیسیر) (فیض القدیر)، (شرح الشمائل للترمذي)اور (التوقیف علی مهمات التعاریف)وغیرہ شامل ہیں۔(1031 ھ۔ 1622 م)کو قاہرہ میں وفات پائے ۔(الاعلام للزرکلی ،ج6 ص204)

[7] محمد عبدالرؤف،المناوی،التوقیف علی مهمات التعریف،ج1،ص287،دارالفکر،بیروت،1410ھ

[8]یہ "Herold Joseph Laski"کاقول ہے۔ MAZHAR-UL-HAQ,Political Science,Theory and Practice,Page#13,Book land,Lahore,1991

حق سے مراد کچھ سرگرمیوں میں آزادی کا ایک معقول دعویٰ ہے۔

اسی طرح حق کی تعریف یوں بھی بیان کی گئی ہے:

"A Right is a power claimed and recognized (by Society or State)as contributory to common good[2]"

حق سے مراد کسی اختیار یا طاقت کا وہ دعویٰ ہے جسے معاشرہ یا ریاست فلاح عامہ کے لیے معاون جان کر تسلیم کرے۔

اصطلاح میں بھی" حق" کی چند تعریفیں ذکر کی گئیں ہیں:

مختلف اعتبارات کے لحاظ سے یہ تعریفیں دو بنیادی معنوں کی طرف رجوع کرتی ہیں۔

پہلے معنی مادے کے اعتبار سے ہیں،جیسا کہ کہا گیا ہے:الحقوق هیمجموعۃالقواعدوالنصوص**التشریعیۃ**التیتنظم علی سبیل الالزام علائق الناس من حیث الاشخاص والاموال[3]حقوق ان شرعی مرتب اصول وضوابط کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے متعلق مالی اور شخصی احکامات لازم قراردئیے گئے ہو۔

اس تعریف کے بناء پریہ بمعنی:حکم:فی اصطلاح الاصولیین[4] اور بمعنی:قانون:فی اصطلاح القانونیین کے قریب تر ہے[5]۔

دوسرے معنی" اثر" کے اعتبار سے ہے اور وہ یہ کہ یہ حقوق کس کے لئے واجب ہو تے ہیں۔

فتکون هی:الطلب الذی یجب لاحد علی غیرہ[6]اس صورت میں یہ وہ مطالبہ ہوگا جو کسی شخص کے لیے دوسرے پر لازم ہوتا ہے۔

اس معنی کے اعتبار سے یہ تعریف اُس تعریف کے زیادہ قریب ہے جو فقہاءکرام رحمہم اللہ "حکم"کی تعریف کرتے ہیں[7]۔ اور حق کے عام معنی یہ ہیں کہ کوئی خاص چیز یا کام جسے شریعت لازمی طور پرطاقت کے زور سے تکلیفی طور پرکسی کے لئے خاص کرے۔[8]

امام جرجانی[1] فرماتے ہیں:حق لغت میں اُس ثابت شدہ(چیز،کام)کو کہا جا تا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہوتا اور اہلِ معانی کے نزدیک اصطلاح میں:الحکم المطابق للواقع کو کہا جاتا ہے جس کا اطلاق اقوال،عقائد،ادیان اور مذاھب پرہوتا ہے[2]

---

[1]یہ "Oscar Wilde"کاقول ہے۔Political Science,Theory and Practice, Page#14

[2]یہ "Prof.T.H Green" کاقول ہے ۔Political Science,Theory and Practice, Page#15

[3]المدخل الفقہی العام،لمصطفیٰ الزرقا:۳:۱۰،۹،:الاسلام وحقوق الانسان:د،القطب محمد:ص۳۵،المدخل للفقہ الاسلامی،د/عبداللہ الدرعان :ص ۲۳۷ ومابعدھا

[4]عبداللہ،الخلاف،علم اصول الفقہ، ص۱۰۰،مکتبۃ الدعوۃ،محمد الامین بن المختار،الشنقیطی،مذکرۃ اصول الفقہ علی روضۃ الناظرللعلامۃ ابن قدامۃ رحمۃ اللہ علیہ:ص۷،

[5] مناع بن خلیل ،القطان،التشریع والفقہ فی الاسلام تاریخا ومنھجا،ص۱۳،دارالکتب العلمیہ بیروت،بدون تاریخ

[6]المدخل الفقہی:۳:۱۰،۹۔الاسلام وحقوق الانسان:د/القطب محمد:ص۳۵

[7] علم اصول الفقہ،ص۱۰۰

[8]المدخل الفقہی:۳:۱۰ ۔الاسلام وحقوق الانسان:د/القطب محمد:ص۳۵

<u>قرآن کریم میں حق کے لفظ کا مختلف معانی میں استعمال.</u>

لفظِ "حق "یا اس کے مشتقات قرآن کریم میں" ۲۸۸ "مرتبہ آئے ہیں[3]۔ جو مختلف معانیوں میں استعمال ہیں۔جن میں سے چند یہ ہیں۔

<u>1۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسم گرامی کے طور پر</u>:{ **ولواتبع الحق أهواءهم** }[4]"اور اگر اللہ ئے(برحق) ان کی خواہشوں پر چلے[5]"{ **فتعالى الله الملك الحق** }[6]"تو اللہ جوسچا بادشاہ ہے(اس کی شان)اس سے اونچی ہے" { **ذلك بأن الله هوالحق** }[7]"یہ اس لیے کہ اللہ کی ذات برحق ہے" { **فذلكم الله ربكم الحق** }[8]"یہ اللہ تو تمہارا رب برحق ہے"

<u>2۔نبی کے نام مبارک کے طور پر:</u>{ **فقدكذبوابالحق لماجاءهم** }[9]"جب اُن کے پاس حق (یعنی نبی علیہ السلام)آیا تو اس کو بھی انہوں نے جھٹلایا"**على أحدالأقوال فيها**،: { **فلماجاءهم الحق من عندناقالوالولاأوتي مثل ماأوتي موسى** }[10]

"پھر جب اُن کے پاس ہماری طرف سے حق آپہنچا تو کہنے لگے کہ جیسی(نشانیاں)موسیٰ کو ملی تھیں ویسی اس کو کیوں نہیں ملی؟"

<u>3– قرآن کریم کے معنی میں:</u> { **وقل جاءالحق وزهق الباطل** }[11]

"اور کہہ دو کہ حق آگیااور باطل نابود ہو گیا"

على أحدالأقوال فيها،وعلى قول آخرفي آيةالأنعام المتقدمة :(**فقدكذبوابالحق لماجاءهم**)[12]

"جب اُن کے پاس حق آیا تو اس کو بھی انہوں نے جھٹلایا".

<u>4– دین قویم کے معنی پر:</u> { **بلجاءهم بالحق وأكثرهم للحق كارهون** }[13]

"بلکہ وہ اُن کے پاس حق کو لے کر آئے ہیں اور ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں "

{ **وتواصوابالحق** } [14]."اور آپس میں حق پر چلنے کی تلقین کرتے رہے"

---

[1]علی بن محمد بن علی،استر آباد کے نواحی گاؤں:تاکو:میں ۷۴۰ھ کو پیداہوئے؛شیراز میں علم حاصل کیا۔۷۸۹ھ کو جب "تیمور"شیراز میں داخل ہو توجرجانی وہاں سے بھاگ کر سمرقند میں پناہ گزیں ہوئے۔تیمور کے وفات کے بعد واپد شیراز تشریف لائے۔فلسفی اور کبار علماء عربیت میں سے تھے۔۸۱۶ھ کو شیراز میں وفات پائی[الفوائد البہیہ:ص۱۲۵،الاعلام:ج۵ص۷]

[2] علی بن محمد،الجرجانی،التعریفات،ص۸۹،دار الکتاب العربی،بیروت،1405ھ

[3]المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم:ص287،212،208

[4]المومنون71:23

[5]ترجمہ فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ

[6]المومنون23 :116

[7]لقمان30:31

[8]یونس32:10

[9]الانعام5:6

[10]القصص48:28

[11]الاسراء81:17

[12] الانعام5:6

[13]المومنون70:23

[14]العصر3:103

5- عدل کے معانی پر: { وقضی بینھم بالحق } "اور ان میں انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا" { والوزن یومئذالحق }[2]"اور اس روز اعمال کاتلنا برحق ہے" .

6-صدق اور یقین کے معنی پر: { إن ھذالھوالقصص الحق }[3]"یہ تمام بیانات صحیح ہیں" { فورب السماءوالأرض إنه لحق }[4]"توآسمان اور زمین کی مالک کے قسم یہ اسی طرح قابل یقین ہے" { وعدالله حقاً }[5]"یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے"

7.-"نصراور تائید کے معنی پر: { حتی جاءالحق وظھرأمرالله }[6].

"یہاں تک کہ حق آپہنچا اور اللہ کاحکم غالب ہوا"

8 "لازم" اور"ضروری" کے معنی پر: { حقاًعلی المتقین }[7]"اللہ سے ڈرنے والوں پر یہ ایک حق حق ہے"{ حقاًعلی المحسنین }[8]

"نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے".

9- توحید کے معنی پر: { إلامن شھدبالحق وھم یعلمون }[9]

"ہاں جو علم ویقین کے ساتھ حق کی گواہی دے(وہ سفارش کر سکتے ہیں)"

10- بمعنی حجج وبراہین: { ولاتلبسواالحق بالباطل وتکتمواالحق وأنتم تعلمون }[10]

"اور حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤاور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ"

{ نزل علیك الکتاب بالحق }[11]

"اس نے اے نبی تم پر سچی کتاب نازل کی"

11- بمعنی"الأمر الواضح" : { قالواالآن جئت بالحق }[12]

"کہنے لگے اب تم نے سب باتیں درست بتا دیں"

12- الواقع المتحقق : { قدجعلھاربي حقاً }[13]"میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا"وقوله{ ذلك الیوم الحق }[14]"یہ دن برحق ہے"

13- یقینی خبر کے معنی پر: { تلك آیات الله نتلوھاعلیك بالحق }[15]

"یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں"

---

[1]الزمر:69:39
[2]الاعراف8:7
[3]آل عمران62:3
[4]الذاریات23:51
[5]النساء122:4
[6]التوبۃ48:9
[7]البقرۃ180:2
[8]البقرۃ236:2
[9]الزخرف86:42
[10]البقرۃ42:2
[11]آل عمران3:3
[12]البقرۃ71:2
[13]یوسف100:12
[14]النباء39:78
[15]البقرۃ252:2

یہ حق کے بعض اطلاقات ہیں جو قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جس کے ضمن میں دوسرے معنی بھی آتے ہیں مثلا جب ہم:حق:کے معنی دین قویم کے کرتے ہیں تو لازمی طور پر اس معنی میں قرآن کریم،نبی علیہ السلام،عدل،صدق وغیرہ بھی آتے ہیں۔[1]

فائدہ:قرآن کریم میں حقو ق سے متعلق بعض آیات اس بات پردلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالی نے بندوں کے حقوق اپنے اوپر لازمی کئے ہوئے ہیں لیکن یہ "علی سبیل التفضل والاحسان والامتنان" کی قبیل سے ہیں نہ کہ کسی چیز کے مقابلے کی وجہ سے۔کیونکہ اللہ تعالی پر کسی کا زور نہیں اور نہ ہی کوئی اُس کوامر نہی کرنے والا ہے۔چند مثالیں یہ ہیں: { **وكان حقاًعلينانصرالمؤمنين** }[2]""اور مؤمنوں کی مدد ہم پر لازم تھی":امام ابن کثیررحمہ اللہ[3] فرماتے ہیں کہ:یہ وہ حقوق ہیں ہیں جسے اللہ تعالٰی نے اپنے اوپربطور تکریم کے واجب کئے ہوئے ہیناسی طرح اللہ تعالی کا فرمان : { **كتب ربكم على نفسه الرحمة** }[4]

"تمہارے رب نے اپنی ذات پاک پررحمت کو لازم کرلیا ہے"

:امام قرطبی رحمہ اللہ[5] فرماتے ہیں:(**أي أوجب ذلك بخبره الصادق ووعده الحق**)[6] یعنی اس نے رحمت کو اپنی سچی خبر اورحق وعدہ سے لازم قرار دیا"اور ابن کثیر رحمہ ا للہ کے بقول (أي **أوجبهاعلى نفسه الكريمةتفضلاًمنهوإحساناًوامتناناً**[7]اس نے بطور فضل واحسان اپنی ذات کریمہ پر رحمت لازم قرار دیا ہے۔اور حدیث میں آتا ہے:

"سیدنامعاذ رضی اللہ عنہ [8]نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام جس جس گدھے پر سوار تھے ، میں اس پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا ۔ اس گدھے کا نام عفیر تھا ۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا “ اے معاذ ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے مخلوق(بندوں) پر کیا حق ہے ؟ اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے ؟ ” میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا “ اللہ کا اپنے بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے اللہ تعالی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ

---

[1] احمد بن عبدالحلیم،ابن تیمیۃ،مقدمۃاصول التفسیر،ص١١تا١۴،دار مکتبۃ الحیات،بیروت،1490ھ

[2]الروم47:30

[3]اسماعیل بن عمر بن کثیر،عمان الدین،ابوالفدا،دمشقی،حافظ،مورخ اور فقیہ تھے۔بُصریٰ کے ایک چھوٹے سے گا وں میں٧٠١ھ کو پیداہوئے۔٧٠٦ھ کواپنے بھائی کے ہمراہ دمشق تشریف لے گئے۔طلب علم میں لمبے لمبے سفر کیے۔٧٧۴ھ کو دمشق میں وفات پائی(محمد بن علی،الشوکانی،البدرالطالع بمحاسن من بعد قرن السابع:ج١ص١۵٣،الاعلام:ج١ص٣٢٠)

[4]الانعام54:6

[5]محمد بن احمدبن ابی بکر،ابو عبداللہ،انصاری،خزرجی،اندلسی،قرطبی۔بیت بڑے مفسر اورصّالح وعابد تھے۔قرطبہ (اندلس)سے تعلق تھا۔سادہ اورمتقشفانہ زندگی گزارتے تھے؛ایک ہی کپڑا زیب تن فرمایا کرتے تھے۔٦٧١ھ کووفات پا گئے [احمد بن محمد،التلمسانی،نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب،ج1،ص428،دارصادر،بیروت،1968ء،الاعلام،ج5،ص322]

[6] محمد بن احمد،قرطبی،"الجامع لاحکام القرآن"(المعروف بقرطبی)ج6،ص435،دارعالم الکتب،الریاض،1423ھ

[7]ابن کثیر،ج2،ص140

[8] معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس۔انصاری،خزرجی،ابو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ۔20قبل ہجری کو پیدا ہوئے۔حلال وحرام کے بہت بڑے عالم اور عہد نبوی کے چھ جفاظ کرام میں سے تھے۔غزوہ تبوک کے بعد رسول اللہ نےاُنہیں معلم کی حیثیت سے یمن بھیجا تھا۔مرویات کی تعداد ١۵٧ ہے۔٨١ھ کو وفات پائی(عبدالرحمان بن علی،ابن الجوزی،صفۃ الصفوۃ،ج1،ص489،دارالمعرفۃ،بیروت،1399ھ،الاعلام:ج7،ص258)

ہے کہ جو بندہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے ہو اللہ اسے عذاب نہ دے "[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ[2] فرماتے ہیں (كون المطيع يستحق الجزاء هو استحقاق إنعام وفضل ، ليس هو استحقاق مقابلة ، كما يستحق المخلوق على المخلوق)[3] فرمانبردار کا جزاء وبدلے کا مستحق ہونے سے مراد"اللہ تعالیٰ کے انعام ومہربانی کا حق دار"ہونا ہے۔یہ (ہرگز) اُس حق کی طرح نہیں ہے جو مخلوق میں سے کسی ایک کا دوسرے پر ہوتا ہے۔

انسان:"

فصل اول میں دوسرا لفظ "انسان" ہے۔"حق "کے معنی بیان کرنے کے بعد ہم انسان کالغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کریں گے۔

انسان "ا،ن،س کے مادے سے بنا لفظ ہے اس کے علاوہ "الناس" اور "انس "کے الفاظ بھی مستعمل ہے عُرف عام میں اس سے مراد"بنی آدم" کا ایک فرد ہوتا ہے۔ "اناسین اور اناسی " اس کی جمع آتی ہے[4] جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے{وَنُسْقِيَهُمِمَّاخَلَقْنَاأَنْعَامًاوَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا}[5]

تاکہ ہم وہ پانی بہت سے اور آدمیوں اور مویشوں کو جوہم نے پیدا کئے ہیں پلائیں۔

قرآن کریم میں لفظِ"انسان"۶۵ جگہوں میں آیا ہے جیسا کہ :

"۱۔ يُرِيدُاللَّهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ وَخُلِقَ الإِنسَانُ ضَعِيفًا[6]"اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرےاورانسان طبعاکمزورپیداکیاگیا ہے"

"۲۔هوَإِذَامَسَّ الإِنسَانَ الضُّرُّدَعَانَالِجَنبِهِ أَوْقَاعِدًاأَوْقَآئِمًا،[7]

"اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تولیٹااور بیٹھا اور کھڑا ہر حال میں ہمیں پکارتا ہے"

"۳۔وَلَئِنْ أَذَقْنَاالإِنْسَانَ مِنَّارَحْمَةًثُمَّ نَزَعْنٰهَا،[8]

"اوراگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں پھر اُس سے اس کو چھین لیں تو ناامید اور ناشکرا ہوجاتا ہے"۔

"-وَإِن تَعُدُّواْنِعْمَةَاللَّهِلاَتُحْصُوهَاإِنَّ الإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ[9]"اوراگر اللہ کے کے احسان گننے لگو توشمار نہ کرسکو مگر لوگ نعمتوں کاشکر نہیں کرتے،بے شک کہ انسان بڑا بے انصاف ہے ناشکرگزار ہے"

---

[1] محمد بن اسماعیل،ابو عبداللہ،بخاری،الجامع الصحیح ،کتاب ،باب اسم الفرس والحمار، رقم:2856،دارالشعب،قاہرہ،1407ھ

[2] احمد بن عبدالحلیم،ابو العباس۔حرانی ،دمشقی،حنبلی،تقی الدین ابن تیمیہ۔۶۶۱ھ کوحران میں پیدا ہوئے۔اپنے والد ماجد کی معیت مینمصر منتقل ہوگئے۔بڑے فطین اور ذکی عالم تھے۔728ھ کو قلعہ دمشق میں حالت اسارت میں وفات پائی(اسماعیل بن کثیر،ابن کثیر،البدایہ والنہایہ:ج۱۴ص۱۴۱،داراحیات التراث العربی،1408ھ،الاعلام،ج1،ص144)

[3] محمد بن ابی بکر،ابن القیم،الجوزیہ ،مفتاح دارالسعادۃ ومنشور ولایۃ العلم والارادۃ،ص430،دارالکتب العلمیہ،بیروت،بدون تاریخ)

[4] لسان العرب، باب حرف السین،مادہ انس،ج6،ص10

[5] الفرقا ن49؛25

[6] النساء28:4

[7] یونس12:10

[8] ھود9:11

[9] ابراھیم34:14

"۵-وَلَقَدْخَلَقْنَاالإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍمَّسْنُونٍ[1]

"اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے"

"۶-خَلَقَ الإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍفَإِذَاهُوَخَصِيمٌ مُّبِينٌ[2]"اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا مگر وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن گیا"

"۷-،وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّدُعَاءهُ بِالْخَيْرِوَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً[3]

"اور انسان جس طرح جلدی سے بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا ہے ،اورانسان بڑا جلد باز ہے"

"۸-،وَكَانَ الإِنْسَانُ كَفُورًا[4]"اورانسان ہے ہی ناشکرا"

اسلام میں انسان سے مراد آدم علیہ السلا م اور اُن کے وہ اولاد ہے جن کے پیدائش کے بارے میں خود خالقِ کائنات فرماتے ہیں :

"وَلَقَدْخَلَقْنَاالإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍمِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةًفِي قَرَارٍمَكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَاالنُّطْفَةَعَلَقَةًفَخَلَقْنَاالْعَلَقَةَمُضْغَةًفَخَلَقْنَاالْمُضْغَةَعِظَامًافَكَسَوْنَاالْعِظٰمَ لَحْمًاثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًاآخَرَفَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِينَ"[5]

" اورہم نےانسان کومٹی کے خلاصے سے (بناکر)پیدا کیا ہے پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا پھر نطفے سے ہم نے لوتھڑا بنایا پھر اُس لوتھڑی سے"بوٹی" بنائی پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائی پھر ہدیوں پر گوشت پوست چڑھایا پھر اس کو نئی صورت میں بنایاپس اللہ بڑا ہی برکت والا ہے جو سب سے اچھا بنانے والا ہے"[6]

---

[1] الحجر26:15
[2] النحل4:16
[3] بنی اسرائیل11:17
[4] بنی اسرائیل67:17
[5] مومنون12:23
[6] ترجمہ فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ

فصلِ دوم
اسلامی تعلیمات اور عالمی منشور میں انسانی حقوق کا تصور

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ "انسانی حقوق" دو لفظوں "انسان" اور" حقوق" کا مجموعہ ہے۔کلمہ"انسان"کا مادہ:ا-ن-س ہے
اور اس سے "انسان،ناس اور انس"نکلے ہیں۔عام معنی میں اس سے مرادبنی آدم کا ایک فرد ہوتاہے۔قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں یہ لفظ با ر بار آیا ہے۔لفظِ "انسان "قرآن کریم میں 65دفعہ،"ناس"241 دفعہ اور" انس" 18 دفعہ آیا ہے۔[1]
جب کہ "حق" باطل کا متضاد ہے۔حق "واجب اور ثابت" کے معنی میں آتا ہے۔قرآن کریم میں یہ لفظ۲۸۳دفعہ جب کہ احادیث مبارکہ میں۱۵۸دفعہ آیا ہے۔"حق" اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے بھی ایک اسم ہے اوردین اسلام اور کتاب اللہ کا وصف بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ ہی حق کی نگہداشت فرماتا ہے۔انگریزی میں انسانی حقوق کو "ہیومن رائٹس" Human Rightsکہاجاتا ہے۔

حقوق کے تعین کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات اور "عالمی منشور برائے انسانی حقوق" کا طریقہ کار: اسلامی تعلیمات وحی الٰہی کا مظہر ہیں خالقِ کائنات نے مخلوق کی بہتری کے لیےماضی حال اور مستقبل کے حالات کو مدنظر رکھ کرقوانین بناتے ہیں۔تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے کنبے کی حیثیت سے یکساں حقوق کے مستحق ہیں۔اس میں

[1] لسان العرب،مادہ ا-ن-س

رنگ،نسل،قوم ،وطن ،صنف اورجنس کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھاگیا ہے مستحکم اور پرامن معاشرے کے وجود کے لیے فطرت سے ہم آہنگ اصول عطاء فرمائے ہیں۔جب کہ عالمی منشور برائے انسانی حقوق محض ایک انسانی کاوش ہے اوروحی الٰہی کے مقابلے میں انسانی کاوش کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ :

الف۔انسانی کاوش محض توہم اور گمان کےدرجے میں قوانین بناتی ہے۔

ب۔انسانی کاوش میں انسان کی نفسانی خواہشات کا لحاظ رکھا جاتا ہے چاہے معاشرے پر اُس کےاچھے اثرات مرتب ہوںہو یا بُرے۔

ج۔وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم قوانین پر عمل پیرا ہونے کے لیے صرف ایک ذات وحدہ لاشریک کے سامنے جھکنا پڑتا ہے جب کہ اس کے مقابلے میں انسان کی ذہنی اختراع کی بنیاد پر قائم طرز عمل سے ہر کسی (طاقتور اور حاکم)کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

د۔اسلامی تعلیمات انسان کی روحانی اور جسمانی پاکیزگی چاہتی ہے جب اس کے مقابلے میں بنایا جانے والا ہر قانون انسانی خواہش کے سامنے سرنگوں رہتا ہے چاہے اس سے انسان اور انسانی معاشرہ غلاظت کے دلدل میں کیوں نہ پھنس جائے۔

ذیل میں اسلامی تعلیمات اور عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ء میں حقوق کے تعیّن کے بارے میں بنیادی اصول ذکر کیے جاتے ہیں۔

1:یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام ہی نے انسانی حقوق کے تعیّن اور عملی نفاذکے سلسلے میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ءسمیت ہر انسانی کاوش سے سبقت حاصل کی ہے۔

2:۔اسلام میں بیان شدہ"انسانی حقوق"کا مصدر ومنبع وحی الٰہی یعنی قرآن کریم واحادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام ہے۔جو ہر قسم کے عیب ،نقصان،جہل اورنفسانی خواہش سے بالکلیہ پاک ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے"ما فرطنا في الكتٰب من شيء [1]

"ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی

اسی طرح ارشادباری تعالیٰ ہے:آیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات میں تدبر نہیں کرتے ۔اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کے ہوتے تو یہ لوگ ضرور ان آیات میں بہت سا اختلاف پاتے[2]۔جب کہ دنیوی قوانین و معاہدات محض انسان کی ذہنی اختراع ہیں جوکہ عام طور پرجہل،خطا،خواہشِ نفسانی،کمزوری اور کوتاہی سے خالی نہیں ۔اس بارے میں خالقِ کائنات کا ارشاد ہے" اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے[3]۔اور ارشاد باری تعالیٰ ہے"إنه كان ظلوماً جهولاً"[4]بےشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔اور نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے"تمام انسانوں سے خطا کا صدور ہوتا ہے اور خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہو"[5]

3:۔انسانی حقوق کے تعیّن کے سلسلے میں اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ حقوق ازلی اور ابدی ہوتے ہیں نہ تو اس میں حذف،تعدیل اور تغییر کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی یہ نسخ اور تعطیل کو قبول کرسکتے ہیں جیسا کہ خود اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

---

[1]الانعام38:6

[2]النساء82:4

[3]النساء28:4

[4]الاحزاب72:33

[5]ابن ماجہ،کتاب الزھد،باب ذکر التوبہ:رقم3428،البانی کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے۔صحیح ابن ماجہ،ج2،ص418

تو تم ایک طرف کے ہوکر دین (اللہ کے رستے) پر سیدھا منہ کئے
چلے جاؤ (اور) اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا
ہے (اختیار کئے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر وتبدل
نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"[1]

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ملکی و بین الاقوامی قوانین کے بنائے جانے کے وقت صرف انسانی خواہش کو مدنظر رکھا جاتا ہے جس میں ہروقت اور ہر زمانے میں انسانی عقل کے حسن و قبح کی پالیسی پر عمل پیرا ہوکرتبدیل،تغییر اور تعطیل کو لاگو کیا جاتا ہے۔جس سے فساد فی الارض پیدا ہوتا ہے روزمرہ کا مشاہدہ اس پر ایک مضبوط گواہ ہے۔جس کے طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔"اور اگر اللہ پاک (جوبرحق ہے) ان کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب درہم برہم ہوجائیں"[2]

4:۔"حقوق الانسان فی الاسلام"یہ صرف ایک مقولہ اور مفروضہ نہیں ہے بلکہ دین اسلام کے ایک اہم جزء ہونے کے ناطے یہ ایک واجبِ شرعی امر ہے کوئی بھی شخص اور معاشرہ اس کو اپنی حیثیت سے کم کرانے کی جرات نہیں کر سکتا اگر کوئی اس میں کمی کرنے کا ارتکاب کرے گا تو اخروی سزاکا مستحق قرار پائے گا۔اور دنیا میں مسلمانوں کے امیر(حاکم) اور صاحبِ قدرت لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ اِن حقوق کی ادائیگی میں قانون کی پاسداری کو یقینی بنانے اور حقوق کی تکمیل پر زور دینے کی بات کرے گا۔ اس کے برعکس دنیوی سلطنتوں اور اُن میں حقوق کے بارے میں صرف وصیت تو کی جا سکتی ہے ،اُنہیں مشتہر کرکے عوام کو باخبر تو کیا جا سکتا ہے اور انفرادی واجتماعی حقوق کی تقسیم تو کی جا سکتی ہے لیکن ادائیگی کے بارے میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی جس کی وجہ سے یہ حقوق کاغذات کی حد تک محدود ہوکر سرد خانے میں پڑے رہتے ہیں۔

5:۔اسلامی تعلیمات میں بیان شدہ حقوق زندگی کے ہرلمحے اور ہر شعبے تک محیط ہیں جب کہ "عالمی منشور برائے انسانی حقوق"کی خامیاں ہر دور میں زیر بحث رہی ہیں اور مقالے میں بھی اس کی مکمل وضاحت کی جائےگی۔(انشاءاللہ)

6:۔اسلام میں حقوق کی مکمل ضمانت دی جاتی ہے جس پر عمل پیرا ہونا حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یکساں طور پر ضروری ہوتا ہے۔حدوداور اقامتِ حدود کا باب اسی وجہ سے اسلام کا طرہ امتیاز رہا ہے کیونکہ حدود کے نفاذ ہی سے دین،جان،مال،عزت اور عقل کی حفاظت ممکن ہو سکتی ہے۔جب کہ قومی اور بین الاقوامی قوانین(عالمی منشور)میں کسی قسم کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے بلکہ بعض دفعہ تو اِن قوانین کی ایسی غلط تاویلیں کی جاتی ہیں جس سے دنیا میں امن کے بجائے فساد پھیلتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اس قانون کی یکسر مخالفت کرنے والوں کے لیے بھی کسی قسم کی سزاکا کوئی قانون موجود نہیں ہے۔

7:۔انسانوں کے حقوق متعین کرنے اور انہیں ادا کرنے کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پر انسان اخروی جزا کا مستحق قرارپاتا ہے۔ایک مسلمان جزائے اخروی کے حصول کے لیےخلوت اور جلوت دونوں میں اپنے آپ کو اِن حقوق کے ادائیگی کے لیے ہمہ تن تیار رکھتا ہے۔کیونکہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر دنیا میں وہ کسی جرم کے ارتکاب کرلینے کے باوجود سزا سے بچ بھی جائے لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔مثال کے طور پر یتیموں کے حقوق کے بارے میں ارشادہے"وبالوالدين إحساناً وبذي

---

[1] الروم30:30
[2] المؤمنون71:23

القربی والیتمیٰ اوروالدین،رشتے دار اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آو۔اس کے ساتھ ہی یہ وعید بھی سنائی گئی ہے:

جولوگ یتیموں کا مال غلط طریقے(ناجائز)پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے"[2]

حقوق کی چار بڑے قسمیں ہیں۔1۔خالص حق اللہ2۔خالص حق العبد3۔اللہ تعالیٰ اور بندوں کے مشترک حقوق(حق اللہ غالب)4۔اللہ تعالیٰ اور بندوں کے مشترک حقوق(حق العبدغالب)[3]
حقوق اللہ میں ایمانیات(عقائد)اور عبادات جبکہ حقوق العباد میں معاملات،اخلاقیات اور زواجر شامل ہیں۔

اسلام کے"حقوق العباد "اورمغرب کے"ہیومن رائٹس "میں زمین آسماں کافرق ہے[4]۔اسلام میں "حقوق العباد" کا جو تصور ہے آگے ہم اُس کی وضاحت کریں گے۔انشاءاللہ

---

[1]النساء36:4
[2]النساء10:4
[3][وتنقسم الحقوق إلىاربعة أقسام :1-حقوق الله خالصا(والمراد بحق الله تعالى: ما يتعلق به النفع العام للعالم من غير اختصاص بأحد، ويقابله الحق العام أو حق المجتمع في الاصطلاح القانوني الحديث، ويدخل فيه العبادات وحقوق الجماعة)، 2-وحقوق العباد خالصا أيضا(والمراد بحق العبد: ما يتعلق به مصلحة خاصة، كحق الملكية وحرمة مال الغير، ويقابله في عرفنا اليوم الحق الخاص)، 3-وما يشتمل على الحقين وحق الله فيه أغلب، 4-وما يشتمل عليهما وحق العباد فيه أغلب-فأما حقوق الله خالصة فهي أنواع ثمانية: عبادات محضة، وعقوبات محضة، وعقوبة قاصرة، ودائرة بين العبادة والعقوبة، وعبادةفيها معنى المئونة، ومئونة فيها معنى العبادة، ومئونة فيها معنى العقوبة، وما يكون قائما بنفسه وهي على ثلاثة أوجه: ما يكون منه أصلا، وما يكون زائدا على الاصل، وما يكون ملحقا به.وأما ما يكون محض حق العباد فهو أكثر من أن يحصى.وما يجتمع فيه الحقان وحق الله فيه أغلب فنحو حد القذف.وأما ما يجتمع فيه الحقان وحق العباد أغلب فنحو القصاص] السرخسی،محمد بن احمد،اصول سرخسی،ج2،ص289-296،دارالکتاب العلمیہ،بیروت، لبنان،1919ء،وھبۃ الزحیلی،الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج8ص6264,6265دارالفکر، دمشق،بدون تاریخ
[4]اسلامی نکتہ نگاہ سے ہیومن رائٹس کی حیثیت جاننے کے لئے چند باتوں کی تنقیح ضروری ہے{ہیومن رائٹس اور حقوق العباد کا فرق}:اسلامی تعلیمات و تصوراتِ زندگی کو مغربی تناظر میں پہچاننا اور تلاش کرنا مسلم مفکرین کی بڑی غلطی ہے۔ ان غلطیوں میں سے ایک بنیادی اور اہم ترین غلطی حقوق العباد کو ہیومن رائٹس کے تناظر میں سمجھنا ہے۔ عام طور پر ہیومن رائٹس کا ترجمہ غلط طور پر "انسانی حقوق" کر کے نہ صرف اُنہیں حقوق العباد کے ہم معنی تصور کرلیا جاتا ہے بلکہ یہثابت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے کہ ہیومن رائٹس سب سے پہلے اسلام نے دنیا کو عطا کیے نیز خطبہ حجۃ الوداع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنہی حقوق کی تعلیمات دی تھیں العیاذ باللہ!ان دونوں کا فرق ایک آسان مثال سے سمجھا جا سکتا ہے (لفظ "ہیومن " کے معنی کی تفصیلی بحث آگے آرہی ہے)۔ فرض کریں ایک دستوری جمہوری ریاست کے دو مرد آپس میں میاں بیوی بن کر رہنا چاہتے ہیں ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُنہیں ایسا کرنے کا "حق" ہے یا نہیں ۔ اگر اس سوال کا جواب کسی مذہب (اسلام،عیسائیت وغیرہ) کے عالم سے پوچھا جائے تو وہ اس کا جواب ارادۂخداوندی میں ظاہر ہونے والے خیر (ارادۂ شرعیہ) یعنی اللہ کی کتاب کی روشنی میں دے گا ۔ مثلاً ایک مسلمان عالم یہ کہے گا کہ چونکہ قرآن یاسنت میں اس کی ممانعت ہے لہٰذا کسی بھی فرد کو ایسا کرنے کا "حق" حاصل نہیں ہے ۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص جو "ہیومن رائٹس " کو اعلیٰ ترین قانون مانتا ہو، اس فعل کو اس دلیل کی بنا پر جائز قرار دے گا کہ چونکہ ہر کسی کا یہ بنیادی حق ہے کہ اپنی خوشی کا سامان وہ اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہے مہیا کرلے، لہٰذا اگر دو مرد آپس میں شادی کرکے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں تو اُنہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر مغربی دنیا میں دو مردوں کی شادی، زنابالرضا اور اَغلام بازی وغیر ہ کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ ایک دستوری جمہوری ریاست میں افراد کے پاس ہمیشہ یہ حق محفوظ ہوتا ہے کہ وہ ارادۂ خداوندی کو پس پشت ڈال کر ہیومن رائٹس کی آڑ میں اغلام بازی کا جواز حاصل کرلیں ۔ اس مثال سے واضح ہو جانا چاہئے کہ "حقوق العباد " کا جواز اور اس کی ترتیب تو ارادہ خداوندی سے طے ہوتی ہے یعنی ایک انسان (عبد) کو کسی عمل کا حق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کتاب و سنت سے ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں ہیومن رائٹس کا جواز انسان کی خود مختاریت کے دعوے سے نکلتا ہے۔ چنانچہ ہر دو حقوق میں اہم فرق سرچشمہ اورمصدر کا ہے۔اسلامی نقطہ نگاہ سے "حق زندگی " فرد کا کوئی ایسا حق نہیں جس کا جواز ماورائے اسلام کسی فطری قانون سے نکلتا ہو بلکہ اس کا ماخذ کتاب و سنت کی نصوص کے سوا اور کچھ نہیں ۔ چونکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے فرد اپنی زندگی کا مالک نہیں ، بلکہ یہ اس کے ربّ کی عنایت ہے، اسی لئے فرد اپنی زندگی کو جیسے وہ چاہے، ترتیب دینے کا حق بھی نہیں رکھتاچنانچہ نہ تو ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان قائم بالذات ہے (کہ وہ اصلاً عبد ہے) اور نہ ہی اس کے کسی ایسے ماورائے

اسلام حق کو مانتے ہیں جس کا جوازارادۂخداوندی سے باہر ہو اور جس کے مطابق اسے اظہارِ ذات اور اپنی خواہشات کی ترجیحات طے کرنے اور اُنہیں حاصل کرنے کا اخلاقی اور قانونی حق حاصل ہو، بلکہ اس کا حق بس اتنا ہی ہے جو اس کے خالق نے اسے اپنے نبی کے ذریعے بتادیا اس کے علاوہ وہ جو بھی فعل سر انجام دے گا، نافرمانی اورظلم کے زمرے میں شمار ہوگا اور جسے ختم کردینا ہی "عدل" کا تقاضا ہے۔ انسان کا کوئی ایسا ذاتی حق ہے ہی نہیں کہ جس کا جواز از خود اس کی اپنی ذات ہو چہ جائیکہ وہ حق ناقابل تنسیخ بھی ہو۔ ہیومن رائٹس کی بالا دستی ماننے کا مطلب ہی انسان کے "حق" کو "خیر" پر فوقیت دینا اور اس بات کا اقرا ر کرنا ہے کہ انسان اپنا حاکم خود ہے نیز "خیر و شر" کامعیار خواہشاتِ انسانی ہیں نہ کہ ارادۂاللہوندی۔
یاد رکھنا چاہئے کہ حقوق و فرائض کی تمام تر تفصیلات کسی مخصوص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہواکرتی ہیں اور مقصد یا تصورِ خیر بدل جانے سے حقوق کی تفصیلات بھی بدل جایا کرتی ہیں ۔ شارع کا اپنے بندوں کو حقوق عطا کرنے کا مقصد "مقاصد الشریعہ " کے حصول کو ممکن بناکر آخرکار اپنے بندوں کے لئے مراسم بندگی بجا لاتے رہنے کو ممکن بنا نا ہے جبکہ ہیومن رائٹس کا فریم ورک فرد کو ان حقوق کا مستحق گردانتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنی خود ارادیت کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کرسکے۔ چونکہ ہیومن رائٹس کا فریم ورک مقاصد الشریعہ کے حصول اور فروغِ عبدیت کی بالادستی کو اہم ترین انفرادی و اجتماعی مقاصد کے طور پر قبول نہیں کرتا لہٰذا وہ شریعت کی بیان کردہ حقوق کی تفسیر و تحدید کو بھی ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ فریم ورک حقوق کی وہ تفسیر بیان کرتا ہے جن کے ذریعے مساوی آزادی کے اُصول پر ایسی معاشرتی تشکیل کو ممکن بنانا ہے جہاں ہر فرداپنی خواہشات کا زیادہ سے زیادہ مکلف ہوتا چلا جائے۔ ایسی ریاست جو ہیومن رائٹس قانون کی پابند ہو، ہرگز مقاصد الشریعہ کی حفاظت و غلبے کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس بنیادیمقدمے کو ذہن نشین کرلینے کے بعد اگلی بحث سمجھنا آسان ہوجائے گی ۔
ہیومن رائٹس اور جمہوری ریاست کی غیر جانبداریت کا دعویٰ:بادی النظر مسلم مفکرین اس دھوکے کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ہیومن رائٹس کسی آفاقی، عقلی اور غیر جانبدار تصورِ خیر کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ اس دھوکے کی وجہ یہ تاثر ہے کہ ہیومن رائٹس فریم ورک میں ہر فرد کے لئے جو وہ چاہنا چاہے، چاہنا ممکن ہوتا ہے۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ ہیومن رائٹس فریم ورک ہر گز بھی خیر کا کوئی غیر اَقداری (Neutral) تصور فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ فریم ورک بھی خیر کے ایک مخصوص تصور کو محض بطورِ مفروضہ قبول کرتا ہے اور جو بھی ریاست اس فریم ورک کو بالاتر قانون کی حیثیت سے قبول کرتی ہے، یہ فریم ورک ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ خیر کی اس مخصوص تشریح کو فرد و معاشرے پر غالب کرے۔ سیکولر طبقہ مذہبی تصورِ خیر کو جانبدار قرار دے کر اسے اجتماعی زندگی سے خارج کردینا چاہتا ہے، یہ طبقہ لوگوں کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے کہ چونکہ مذہب کی بنیاد پر قائم شدہ ریاست لازماً جانبدار ہوتی ہے یعنی وہ ریاست خیر کی ایک مخصوص مذہبی تعبیر کے علاوہ دیگر تمام تعبیرات کو باطل قرار دے کر مغلوب کردیتی ہے، لہٰذا مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ رکھ کر ایسے قانونی نظام پر ریاست کی تشکیل کی جانی چاہئے جو خیر کے معاملے میں غیر جانبدار ہو کر تمام تصوراتِ خیر کو پنپنے کے مواقع فراہم کرے، اور ایسا قانونی نظام ہیومن رائٹس فریم ورک فراہم کرتا ہے۔
مگر خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مغرب اور سیکولر طبقے کا یہ دعویٰ کہ لبرل سیکولر ریاست خیر کے معاملے میں غیر جانبدار اور اسی لئے Tolerant ہوتی ہے، ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ خیر کے معاملے میں غیر جانبداری کا رویہ ممکن ہی نہیں ۔ چنانچہ ہیومن رائٹس کے مطابق اصل تصورِ خیر آزادی یعنی "خیر فرد کا حق ہونا ہے"،دوسرے لفظوں میں اصل خیر تمام تصوراتِ خیر کا مساوی ہونا ہے۔ اس تصورِ خیر کے مطابق خیر فرد کی محض اس "صلاحیت " کا نام ہے کہ جو اسے اس کی "ہر چاہت" حاصل کرسکنے کا مستحق بنا دے، ماورائے اس سے کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ معلوم ہوا یہ کہنا کہ "تمام تصوراتِ خیر مساوی ہیں " غیر جانبداری کا رویہ نہیں بلکہ بذاتِ خود خیر کا ایک مستقل مابعد الطبیعاتی تصور ہے کہ "اصل خیر تمام تصوراتِ خیر کا مساوی ہونا ہے"، اور ہیومن رائٹس پر مبنی جمہوری دستوری ریاست لازماً اسی تصور خیر کے تحفظ اور فروغ کی پابند ہوتی ہے۔
مساوی خیر کے اس تصور پر ایمان لانے کے بعد اسلام کے "الحق " ہونے کا دعویٰ ایک مضحکہ خیز دعوی بن کر رہ جاتا ہے۔ ہیومن رائٹس پر ایمان لانے کا تقاضا یہ مان لینا ہے کہ اسلام ہی واحد حق نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی بھی اتنے ہی حق پر مبنی ہیں جتنا اسلام، لہٰذا مسلمانوں کو اسلام کی دو سرے مذاہب اور نظام ہائے زندگی پر برتری کے دعوے سے دستبردار ہو جانا چاہئے اور خصوصاً اقامت ِدین کی کوششیں ترک کردینی چاہئیں کیونکہ اسی مذہبی برتری کی سوچ کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے ۔ ہیومن رائٹس پر معاشرتی تشکیل تب ہی ممکن ہے جب افراد رواداری کے مغربی فلسفے پر ایمان لائیں ۔
یہیں سے اس فریب کی حقیقت بھی کھل جانی چاہئے کہ لبرل جمہوری ریاست کوئی tolerantریاست ہوتی ہے کیونکہ اپنے دائرہ عمل میں یہ ریاست صرف اُنہی تصوراتِ خیر کو برداشت کرتی ہے جو اس کے اپنے تصورِ خیر (یعنی تمام تصوراتِ خیر کی مساوات و لایعنیت) سے متصادم نہ ہوں ، اور ایسے تمام تصوراتِ خیرجو ہیومن رائٹس سے متصادم ہوں یا جو کسی ایک چاہت کو بقیہ تمام چاہتوں سے بالاتر سمجھ کر اس کی برتری کے قائل ہوں ، ان کی بذریعہ قوت بیخ کنی کردیتی ہے، جس کی واضح مثال ماضی قریب میں افغانستان کے طالبان کی ریاست کا بذریعہ قوت خاتمہ ہے کہ یہ ریاست مخصوص مذہبی تصورِ خیر کی برتری کا دعویٰ کرتی تھی اور اسے دیگر تمام تصوراتِ خیر پر غالب کردینے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں بسنے والے لوگ اپنی روایت کے مطابق "ونی کرنے "

اسلام کی رو سے "انسانی حقوق" "حقوق العباد" میں آتے ہیں اور حقوق العباد کی دو بڑی قسمیں ہیں

۱۔شخصی آزادی سے متعلق حقوق

۲۔معاشرتی زندگی سے متعلق حقوق

۱۔شخصی آزادی سے متعلق حقوق:

اس عنوان کے تحت چند حقوق آتے ہیں۔

(الف) زندگی کی حفاظت کا حق: زندگی اللہ تعالی کی طرف سے دیا گیا وہ عظیم تحفہ ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی اس وجہ سے اللہ تعالی کی اس نعمت اور تحفے کا تحفظ کرنا ہر عقل مند انسان کی اولین ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:جو شخص کسی کو بغیر

یا مذہبی بنیادوں پر "ستی کرنے" کو خیر سمجھ کر اپنانا چاہتے ہوں تو ہیومن رائٹس قانون اُنہیں ان اعمال کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ اعمال بنیادی انسانی حقوق کے فلسفے سے متصادم ہیں ۔ اسی طرح فرض کریں کہ ایک مسلمان لڑکی کسی کافر سے شادی کرنا چاہے تو ظاہر ہے اسلامی معاشرہ وریاست ہرگز اس کی اجازت نہیں دے گی، مگر چونکہ ہیومن رائٹس قانون اس فعل کو فرد کا حق قرار دیتا ہے، لہٰذا لبرل ریاست میں افراد کو اس فعل کی قانونی اجازت اور ریاستی سرپرستی حاصل ہوگی۔ اگر مسلم اجتماعیت اس لڑکی پر اپنا تصورِ خیر مسلط کرنے کی کوشش کرے گی تو لبرل ریاست ان کے خلاف کاروائی کرکے ان کی سر کوبی کرنے کی پابندہو گی۔ چنانچہ ہیومن رائٹس فریم ورک کے تصورِ خیر کے مطابق "خیر "کی تعریف تو بدل سکتی ہے مگر خیر کی تعریف متعین کرنے کا "انسانی حق" بہر حال ناقابل تبدیل ہے۔ چونکہ ہیومن رائٹس " فرد" کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں نہ کہ کسی گروہ کے، لہٰذا لبرل جمہوری معاشروں میں سوائے فرد کے تمام اجتماعیتیں (مثلاً خاندان وغیرہ) لازماً تحلیل ہو جاتی ہیں اور جو واحد شے بچ رہتی ہے، وہ ہے اکیلا "فرد " یا صرف ایسی اجتماعیتیں جو افراد کی اغراضپر مبنی تعلقات سے وجود میں آتی ہیں درحقیقت لبرل معاشروں میں ریاست جس نظامِ زندگی کو جبراً مسلط کرتی ہے وہ لبرل سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ہے جس کے نتیجے میں دوسرے تمام نظام ہائے زندگی پر عمل کرنے کا دائرہ کار کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ 8چنانچہ ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری جمہوری ریاست کا یہ دعویٰ کہ اس نظامِ زندگی میں ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ "جو "چاہنا چاہے، چاہ سکے ایک جھوٹا دعویٰ ہےکیونکہ فرد کو مساوی آزادی (یعنی سرمایہ دارانہ نظام زندگی) ردّ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا ۔ میں بحیثیتِ فرد اگر گوشت کھانا چاہتا ہوں تو چاہوں ، ہمہ وقت کھیلنا چاہتا ہوں تو چاہوں ، مگر میں ایسا کچھ نہیں چاہ سکتا جس سے اُصولِ آزادی یعنی دوسروں کا اپنی چاہت چاہنے اور اسے حاصل کرنے کا حق سلب ہوجائے۔ مثلاً میں یہ نہیں چاہ سکتا کہ کسی شخص کو شرعی منکر (مثلاً زناکرنے) سے روک دوں کیونکہ جونہی میں اپنی اس چاہت پر عمل کرتا ہوں تو اُصولِ آزادی کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور جمہوری ریاست مجھے ایسا کرنے سے بذریعہ قوت روک دے گی۔ چنانچہ فرد اپنے کسی مخصوص تصورِ خیر مثلاً اظہارِ مذہبیت پر "بطورِ ایک حق" عمل تو کرسکتا ہے مگر اسے "الحق" سمجھ کر دیگر تمام تصوراتِ خیر پر غالب کرنے کا ارادہ نہیں کرسکتا کہ ایسا کرنا اُصولِ آزادی کے خلاف ہے اور اگر اُصولِ آزادی ہی ردّ کردیا گیا تو پھر میرا یہ حق کہ میں جو چاہنا چاہوں ، چاہ سکتا ہوں خود بخود فسخ ہوجائے گا۔ لہٰذالبرل جمہوری نظام میں ہر فرد ہیومن بننے پر مجبور ہوتا ہے، وہ آزادی کے سوا اور کچھ نہیں چاہ سکتا۔ فرد کی ہر وہ خواہش قانوناً اور اخلاقاً ناجائز اور قابل تنسیخ ہے جو اُصولِ اظہارِ آزادی کے خلاف ہویعنی جس کے نتیجے میں دوسروں کی آزادی چاہنے کی خواہش میں تحدید ہوتی ہو۔پس واضح ہوا کہ درحقیقت خیر کے معاملے میں لبرل جمہوری ریاست بھی اتنی ہی راسخ العقیدہ (dogmatic) اور intolerant ہوتی ہے جتنی کوئی مذہبی ریاست کیونکہ دونوں ہی اپنے تصوراتِ خیر سے متصادم کسی نظرئیے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتیں ۔ چنانچہ مشہور لبرل مفکر رالز (Rawls)کہتا ہے کہ مذہبی آزادی کو لبرلزم کے لئے خطرہ بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، وہ مذہبی نظریات جو لبرل آزادیوں (یعنی فرد کے تعیین خیر وشر کے حق) کا انکار کریں ، ان کو عملاً کچل دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی وَبا کو ختم کرنا ضروری ہوتاہے۔ پس خوب یاد رہے کہ تمام تصوراتِ خیر کی مساوات و لایعنیت کا مطلب غیر جانبداری نہیں بلکہ مساوی آزادی بطور اصل خیر کا اِقرار ہے۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پختہ (matured) جمہوری ریاستوں میں ارادئہ انسانی یعنی "انسانی حق" کی بالادستی تمام تصوراتِ خیر پر غالب آجاتی ہے اور کسی مخصوص خیر کی دعوت دینا ایک لایعنی اور مہمل دعوت بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی ریاستوں میں آپ کسی مخصوص خیر (مثلاً مذہبیت) کے حصول کو "بطورِ ذاتی حق " کے اختیار تو کرسکتے ہیں مگر اس خیر کو دیگر تصوراتِ خیر اور زندگی گزارنے کے دیگر طریقوں پر غالب نہیں کرسکتے، یہی ہیومن رائٹس کی حقیقت ہے۔(اسلام اور ہیومن رائٹس/http://forum.mohaddis.com/threads،مورخہ:30/11/2017)

اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو،قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کردیا[1]۔اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے پیغمبر ان کوکہہ دو کہ (لوگو) آؤ میں تم کواُن اشیاء کے بارے میں پڑھ کر(اللہ کا حکم) سناؤں جوآپ کے رب نے آپ پر حرام کر دی ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہنا اورغریبی(کے ڈر سے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرواور یہ اس وجہ سے کہ تم کوبھی اور ان کوبھی ہم ہی رزق دیتے ہیں اورظاہری وباطنی بےحیائی کے پاس بھی نہ پھٹکنا اور کسی جان والے(انسان وغیرہ) کوناحق نہ قتل کرنا، مگراللہ کے حکم کے مطابق[2]

(ب)جائیداد کا حق:ہر عقل مندانسان اپنی محنت اور جائز کمائی کے ذریعے اپنے لئے جائیداد بنانا چاہتا ہے۔اس کو اپنی جائیداد کے استعمال کرنے اوراس سے فائدہ اُٹھانے کا مکمل حق حاصل ہے۔اپنی زندگی میں چاہے وہ کسی کو تحفے میں دے،فروخت کرے،رہن میں رکھے یا اُس کے بارے میں وصیت کرے۔نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔"اپنے مال(جائیداد وغیرہ)کی حفاظت کرتے ہوئے اگر کسی کو قتل کیا جائے تو وہ شہید ہوگا۔[3]

(ج)عزت کا حق:ہر انسان کی جان،مال اور عزت وناموس کی حفاظت اس کے بنیادی حقوق میں سے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہے۔"اے مومنو!ایک دوسرےکا مذاق نہ اُڑاؤ[4]۔اور ارشاد ہے"وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ[5]"ایک دوسرے کو برے نام سے نہ پکارو۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔"اے ایمان والو!بہت گمانوں سے بچتے رہو بے شک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا راز تلاش کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو(یہ بڑا جرم ہے کیونکہ)کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟پس تم کو اس سے گھن آتا ہے۔[6]

(د)برابری کا حق:چونکہ تمام انسانوں کا باواآدم ایک ہی ہے اس وجہ سے تمام انسان برابر ہیں۔ذات پات،رنگ ،نسل،زبان ا ور علاقے کی بنیاد پر ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔تمام انسان بنیادی انسانی حقوق میں برابر ہیں کیونکہ سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں ان میں اگر قبیلوں اور خاندانوں کا کوئی فرق ہے وہ صرف پہچان کے لیے ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"اے لوگو! تم کو ہم نے ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے اور تم میں سے جو ذاتیں اور قبیلے بنائے ہے(یہ محض ایک دوسرے کے)پہچان کے لیے بنائے ہے[7]۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے"اور ہم نےانسان کو عزت بخشی اور دریا اورجنگل میں ان کو سواری دی اور پاکیزہ رزقدے دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی[8]"

---

[1]المائدہ32:5
[2]الانعام151:6
[3]بخاری،کتاب المظالم،باب من قاتل دون مالہ،رقم:2480
[4]الحجرات11،12:49
[5]نفس مصدر
[6]نفس مصدر
[7]الحجرات11،12:49
[8]الاسراء70:17

(ہ)کام کرنے کی آزادی: اسلام تمام انسانوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہر جائز کام یا پیشہ اختیا ر کر سکتا ہے اُنہیں اپنی مرضی کے موافق ہر اُس کام کا موقع ملنا چاہئیے جس کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

(و)انصاف کا حق: انسان کی بنیادی حقوق میں سے ایک اہم حق "انصاف کا حق"ہے۔ظلم اور فساد کے ہوتے ہوئے کوئی بھی معاشرہ اُس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا۔پُرامن معاشرہ تب معرض وجود میں آتا ہے جب اُس میں تمام افراد کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہو اور اُن کے حقوق پامال نہیں کیے جاتے ہوں۔ اللہ تعالی فرماتا ہے "اعْدِلُواْهُوَأَقْرَبُلِلتَّقْوَى"[1] انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے۔دشمن کے بارے میں بھی انصاف اور احتیاط کا حکم دیا گیا ہے۔فرماتے ہے"کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کردے[2]۔

(ز)تعلیم حاصل کرنے کا حق: انسان میں شعور علم ہی کے ذریعے پیدا ہو تا ہے اور شعور ہی کی کسوٹی پر کسی انسان کو تولا جا تا ہے۔اچھے برے کی تمیز علم و تعلیم کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔رب کو پہچاننے کا ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ہر عقل مند انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جتنا بھی کر سکے اپنے آپ کو علم وتعلیم کے زیور سے آراستہ کرے اور اس راستے میں کسی کو بھی کوئی رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔نبی علیہ السلام فرماتے ہیں"تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن خود سیکھے اور دوسروں کو سکھائے[3]۔

اسی طرح لین دین کاحق،صحت اور دیگر متعلقہ سہولیات کا حق،سوچنے کی آزادی اور ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کی آزادی بھی انسان کے شخصی آزادی میں شامل ہیں۔ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:اللہ کو برائی کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو[4]۔"اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "جب تم میں سے کوئی ناروا کام ہوتے دیکھے تو اُسے چاہئیے کہ اُس کام کو ہاتھ سے روکے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو چاہئیے کہ زبان سے اُسے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا ہو تو دل میں اُسے برا جانیں اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے[5]۔

۲۔معاشرتی زندگی سے متعلق حقوق:

ایک انسان کادوسرے کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے لئے لازمی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنے فرائض بجا آوری کے لیے ہمہ وقت تیار رہے کیونکہ ایک انسان کے فرائض دوسرے انسان کے حقوق ہوا کرتے ہیں۔اجمالاََمعاشرتی حقوق میں چند اہم حقوق ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں۔تفصیل مقالے کے دوسرے باب میں آئیگی۔(انشاءاللہ)

(ا)والدین کے حقوق

(ب)اساتذہ کے حقوق

(ج)اولاد کے حقوق

(د)میاں بیوی کے حقوق

(ہ)یتیموں کے حقوق

(و)رشتہ داروں کے حقوق

---

[1] المائدہ8:5

[2] نفس مصدر

[3] بخاری،کتاب العلم،باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ،رقم:5027

[4] النساء148:4

[5] مسلم،کتاب الایمان،باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان،رقم:186

(ز)ہمسایوں کے حقوق
(ح)ضرورت مند اور غریبوب کے حقوق
(ط)قیدیوں کے حقوق
(ی)بیماروں اور معذوروں کے حقوق
(ک)مزدوروں کے حقوق

وضعی(سیکولر) قوانین میں انسانی حقوق کی تعریف:

وضعی قوانین میں انسانی حقوق کے سلسلے میں دو نظرئیے پائے جاتے ہیں۔

پہلا نظریہ:

پہلا نظریہ یہ ہے کہ انسانی حقوق عام آزادیوں میں محصور ہو کررہے۔اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسانی حقوق کے اس نظرئیے کی ابتدا یورپ[1] سے ہوئی اور آج بھی یورپ کے دستور ساز قانون دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسانی حقو ق عام انسانی آزادیوں کا نام ہے۔

دوسرا نظریہ:

دوسرا نظریہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا پیداوار ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "حقوق انسانی "عام آزادیوں سے مختلف ہیں۔
کیونکہ آزادی اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب کہ انسان کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور اس کے اوپر کوئی ایسی قوت نہ ہو جو اسے اپنی مرضی پر چلنے سے روکے۔ چونکہ حقوق "حق" کی جمع ہے اور حق اپنے معنی میں"آزادی" سے زیادہ وسعت رکھتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ آزادی "حق" کا ایک جزء اور حصہ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس نظرئیے کے ماننے والوں کے نزدیک حق کی تعریف کچھ یوں ہے-"الحق مصلحة یحمیها القانون"[2]-حق ایک ایسی مصلحت ہے جس کی حفاظت قانون کرتا ہے-آگے انہوں نے انسانی حقوق کی تعریف اس طرح کی ہے-"تلک الحقوق التی یتعین الاعتراف بها للفرد لمجرد کونه انساناً"[3]- کسی انسان کے انسان ہونے کے ناطے اس کے حقوق کا اعتراف کیا جانا۔

[1](یورپ) یہ دنیا کے سات روایتی براعظموں میں سے ایک ہے ۔اس کے شمال میں بحر منجمد شمالی،مغرب میں بحراوقیانوس،جنوب میں بحیرہ روم اور مشرق میں بحیرہ قزوین واقع ہیں۔اس میں درجہ ذیل ممالک شامل ہیں۔آئرلینڈ،آئس لینڈ،آرمینیا،سپین،آسٹریا،اسٹونیا،البانیا،انڈورا،اٹلی،برطانیہ،بلجئیم،بلغاریہ،بوسنیا، بیلارس، پرتگال، پولینڈ،جارجیا،جرمنی،چیکیا،روس،رومانیہ،سان مارینو،سربیا،سلوواکیہ،سلووینیا،سوئٹزرلینڈ،سویڈن،قبرص،فرانس،فن لینڈ،قازقستان،کرویئشیا،جبرالٹر، لکسمبرگ، مالٹا،مقدونیہ، مناکو،ناروے،نیدر لینڈ،ڈنمارک،یوکراین، یونان وغیرہ:[یورپ]/https://ur.wikipedia.org/wiki(مورخہ:30/11/2017)

[2] ڈاکٹر سلیمان بن عبدالرحمان،الحقیل،حقوق الانسان فی الاسلام والرد علی الشبہات المثارة حولہا،ص۱۳(س،م) نامعلوم

[3] مصدر سابق

فصلِ سوم
عالمی منشور کی تمہیداوراس کے دفعہ نمبر ۱ تا دفعہ نمبر ۱۵ کاتعارف

اس فصل میں اقوام متحدہ[1] کے "عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء[1]"کی تمہید اوردفعات ایک تا پندرہ، دنیا کی دو بڑی زبانوں(انگریزی،اردو) میں دفعہ وار ذکر کیا جائے گا۔پہلے اردو میں اور پھر انگریزی میں، ان کا(تمہید اور دفعات 1تا15) تعارف کچھ یوں ہے.

---

[1] 1914ء کے لگ بھگ پہلی جنگ عظیم ہوئی۔جس میں ایک طرف جرمنی تھا اور دوسری طرف باقی یورپ تھا۔اس جنگ میں عظیم تباہی ہوئی۔جس کے بعد دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک ادارہ قائم ہوا جسے انجمن اقوام(League of Nations)کا نام دیا گیا۔اس ادارے کی کارکردگی ناقص تھی،تبھی تو دوسری جنگ عظیم ہوئی جس میں پہلی جنگ عظیم سے بھی زیادہ تباہیاں ہوئیں۔پھر 1945ء میں اقوام متحدہ (United Nations)بنی۔اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں یہ

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1948ء کو "عالمی منشور برائے انسانی حقوق" منظور کرکے اس کا عام اعلان کیا۔اعلان کے بعد اقوام متحد ہ کی اس فورم نے اپنے ممبرز ملکوں [3] کو اس منشور پر عمل کرنے کے احکامات جاری کیں جو کہ اس منشور کی تشہیر اور دنیا بھر میں اس کی نشر واشاعت پر مشتمل تھیں۔یعنی تدریسی اداروں میں پڑھ کر سنانا،پبلک مقامات پر اسے اویزاں کرنا اور تشہیر کی تمام تر وسائل استعمال کرکے اسے ہر فرد تک پہنچانا۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں منشور کی وضاحت بھی تھی اور اس بارے میں کسی ملک یا علاقے کی سیاسی حیثیت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔[4]

تمہید:

"چونکہ ذاتی طور پر انسان کی حرمت ،عزت اور ان کے برابری کے بنیاد پر ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اورامن کی بنیاد ہے،چونکہ انسانی حقوق سے لا پرواہی اور اُن کی بے حرمتی اکثرایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے انسانیت کے ضمیر کوسخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سےمحفوظ رہیں،چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانوں کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آکرجبر واستبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو،یہ بات بھی اہم ہے کہ دنیاکے اقوام کےدرمیان دوستانہ تعلقات کو آگےبڑھایا جائے،چونکہ اقوام متحدہ کے ممبر ممالک نے اپنے چارٹر میں انسان کی بنیادی حقوق، نفسِ انسان کی شخصیت کی تقدیس(حرمت) اور قدر اورعورتوں اور مردوں کے برابری کے بنیاد پر حقوق کے بارے میں اپنےعقیدے کی دوبارہ تصویب کر دی ہے اور آزادی کے مبنی بر وسیع مفہوم کی فضا

بھی تھا کہ اگر اقوامِ عالَم کے درمیان کوئی تنازعہ ہوجاتی ہو،تصادم کے امکانات ہو،یاتصادم کے صورت میں ثالثی کا کردارادا کرنا ہو تویہ ادارہ ادا کریگی۔شروع میں اس ادارے کے صرف51ممبرز تھے جو بڑھتے بڑھتے آج 193 تک پہنچ گئی ہے۔https://ur.wikipedia.org/wiki:dated:20/10/2017

[1] اقوامِ متحدہ نے اقوام کے درمیان جنگوں کے اسباب کا جائزہ لیا کہ دنیا میں جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟اس کے وجوہات کیا ہیں؟اس سلسلے میں اس ادارے نےکچھ اصول مقرر کیے جس میں یہ وضاحت کی گئی کہ فلاں بات درست ہے اور فلاں بات نادرست ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ممبر ممالک نے اس ادارے میں اپنا فلسفہ حیات بھی شامل کیا۔ اور ایک چارٹر منظور کرالیا کہ آج کے بعددنیا کے تمام تنازعات،معاملات وغیرہ اس چارٹر اور منشور کے بنیاد حل ہو اکریں گے۔اسی چارٹر میں 1948ء میں ایک منشور شامل کیا گیا جسے "عالمی منشور برائے انسانی حقوق"کہا جاتا ہے۔(نفس مصدر)

[2] اقوام متحدہ کا ڈھانچہ اس طرح ہے کہ اس کا ایک جنرل اسمبلی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر امریکہ کے ایک شہر نیو یارک کے ایک جزیرے مین ہیٹن(Manhattan) میں ہے۔ہرسال ستمبر میں جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے۔ یہ ایک عالمی پلیٹ فارم ہے جہاں ہرممبر ملک کا نمائندہ شریک ہوکر جو چاہتا ہے کہہ سکتا ہے۔جنرل اسمبلی میں دنیا کے کسی بھی خطے سے متعلق کسی بھی مسئلے پر کوئی بھی قرارداد پاس کر سکتی ہے۔لیکن اس قرارداد کی حیثیت صرف ایک سفارش کی ہوتی ہے۔(نفس مصدر)

[3] آج تک دنیا کے 193 ممالک اس کے ممبرز ہیں۔https://ur.wikipedia.org/wiki/ :مورخہ:06/11/2017

[4] آخری مستند متن،عالمی منشوربرائے انسانی حقوق،محکمہ اطلاعات عامہ،اقوام متحدہ،نیو یارکjune1965-opi/15-15377

میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور زندگی کے معیار کو ترقی کی طرف لے جانے کا ارادہ کر لیاہے،چونکہ ممبر ممالک نےیہ عہد کرلیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے تعاون سے اصولی طور پرساری دنیا میں اور عمومی طورپر حقوقِ انسانی اور بنیادی آزادیوں سب سے زیادہ احترام کریں گے اوردوسرے ممالک کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیں گے،اسی طرح چونکہ اس وعدے کی پورا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان آزادیوں اور حقوق کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں،لہذاجنرل اسمبلی کی رو سے یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ حقوقِ انسانی کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے لیے حصولِ مقصد کامشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کریں اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ممالک میں اور اُن قوموں میں جو ممبر ممالک کے ماتحت ہوں،منوانے کے لیے بتدریج کوشش کر سکے۔"

Universal Declarati0n 0f Human Rights

Preamble

"Whereas rec0gniti0n 0f the inherent dignity and 0f the equal and inalienable rights 0f all members 0f the human family is the f0undati0n 0f freed0m, justice and peace in the

w0rld, Whereas disregard and c0ntempt f0r human rights have resulted in barbar0us acts which have 0utraged the c0nscience 0f mankind, and the advent 0f a w0rld in which human beings shall enj0y freed0m 0f speech and belief and freed0m fr0m fear and want has been pr0claimed as the highest aspirati0n 0f the c0mm0n pe0ple, Whereas it is essential, if man is n0t t0 be c0mpelled t0 have rec0urse, as a last res0rt, t0 rebelli0n against tyranny and 0ppressi0n, that human rights sh0uld be pr0tected by the rule 0f law,
Whereas it is essential t0 pr0m0te the devel0pment 0f friendly relati0ns between nati0ns, Whereas the pe0ples 0f the United Nati0ns have in the Charter reaffirmed their faith in fundamental human rights, in the dignity and w0rth 0f the human pers0n and in the equal rights 0f men and w0men and have determined t0 pr0m0te s0cial pr0gress and better standards 0f life in larger freed0m, Whereas Member States have pledged themselves t0 achieve, in c00perati0n with the United Nati0ns, the pr0m0tion 0f universal respect f0r and 0bservance 0f human rights and fundamental freed0ms,Whereas a c0mm0n understanding 0f these rights and freed0ms is 0f the greatest imp0rtance f0r the full realizati0n 0f this pledge, N0w, theref0re,The General Assembly, Pr0claims this Universal Declarati0n 0f Human Rights as a c0mm0n standard of achievement f0r all pe0ples and all nati0ns, t0 the end that every individual and every 0rgan 0f s0ciety, keeping this Declarati0n c0nstantly in mind, shall strive byteaching and educati0n t0 pr0m0te respect f0r these rights and freed0ms and by pr0gressive measures, nati0nal and internati0nal, t0 secure their universal and effective rec0gniti0n and 0bservance, b0th am0ng the pe0ples 0f Member States themselves and am0ng the pe0ples 0f territ0ries under their jurisdicti0n."

دفعہ نمبر: ۱

تمام انسان آزاد پیدا کئے گئے ہیں۔عزت،آبرو اور حقوق کے حوالے سے تمام انسان برابر ہے،انسان کو چونکہ عقل اور ضمیر(کی نعمت)دی گئی ہے اس وجہ سے اُس پر لازم ہے کہ وہ دوسرے انسان کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھیں

دفعہ نمبر:۲

ہرانسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اس ڈیکلریشن میں ذکر شدہ تمام حقوق اور آزادیوں سے بلاتفریق فائدہ حاصل کریں۔بلاتفریق(امتیاز)سے مرادرنگ،نسل،زبان،قوم،سیاسی یامذہبی اوردیگر نظریات۔وطن،معاشرہ،دولت یا پیدائش کی تمیز وشناخت ہے،اس کے علاوہ جس علاقے یاملک سے جو شخص تعلق رکھتا ہے اسکی سیاسی کیفیت دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پراس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گاچاہے وہ ملک یاعلاقہ آزاد ہویاتولیتی ہو یاغیر مختار ہویاسیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو

دفعہ نمبر:۳

ہر شخص کو اپنی جان،آزادی اورذاتی تحفظ کا حق ہے.

دفعہ:۴

کسی بھی انسان کو غلام نہیں بنایا جائے گا اسی طرح لونڈی بنانے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔انسانی جانوں کی تجارت اورغلامی کی جو بھی شکل ہو،قطعا ممنوع ہوگی

دفعہ:۵

کوئی بھی کسی بھی انسان کو ایسی سزا نہیں دے گی جس میں اُس کے جسم کو اذیت پہنچے اسی طرح مبنی بر ظلم سزا بھی نہیں دی جائی گی۔انسانیت سے گری ہوئی سلوک نہیں کیا جائے گا

دفعہ: ۶
ہر انسان کا حق ہے کہ اُس کی شخصیت قانونا ہر جگہ تسلیم کی جائے

دفعہ: ۷

"قانون کے نظر میں سب برابر ہیں اور قانون کے اندر سب بغیر کسی تفریق کےاس بات میں یکساں حق رکھتے ہیں کہ وہ امان پائے ۔عالمی منشور کے اعلان کے خلاف جس طریقے سے بھی تفریق کامعاملہ کیاگیا یا اس کی ترغیب دی گئی،تو اس سے تمام انسان بچاؤ کے برابر کے حق دار ہیں"

دفعہ:۸

ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون کے خلاف دئے ہوئے بنیادی حقوق کو تلف کرتے ہوں،بااختیار قومی عدالتوں سے موثّر طریقے پر چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ: ۹

کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی سے گرفتار،نظربند یا جلا وطن نہیں کیا جائے گا

دفعہ: ۱۰

ہر انسان کو برابری کے بنیاد پر یہ حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاداور غیر جانب دارعدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ: ۱۱:

"**(۱)**جس شخص پر کسی قسم کا فوجداری مقدمے کا الزام دائر کیا جائے،وہ شخص اس وقت تک بے گناہ شمار کیا جائے گا جب تک کسی کھلی عدالت کے کٹھرے میں قانوناََ اس پر وہ جرم ثابت نہ ہو جائے اورثابت ہونے کے بعد مذکورہ شخص کو کھلی طور پر اپنے آپ سے وہ الزام دور کرنے کے لیے صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا ئے"

(۲)کسی بھی انسان کو کسی ایسے کام یا فرگذاشت کی بنا پر جو کرنے کے وقت بین الاقوامی یاقومی قانون کے رو سے ایسا جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا جس کو تعزیرکہا جائے،کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا

دفعہ:۱۲
کسی شخص کی نجی زندگی،خانگی زندگی،گھر بار،خط وکتابت میں من مانے طریقے
پر مداخلت نہ کی جائی گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کئے جائیں گے،ہر
شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے

دفعہ:۱۳

(۱)ہرشخص کاحق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو

(۲)ہرشخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلاجائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو۔اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ:۱۴

(۱)ہرشخص کو ایذا رسانی سے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے،اور پناہ مل جائے تواس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے

(۲)یہ حق عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لئےاستعمال میں نہیں لایا جاسکتا جو خالصتاََ غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

دفعہ:١٥

(١)ہرشخص کو قومیت کا حق ہے۔

(٢)کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

فصلِ چہارم
عالمی منشور کے
دفعات۱۶تا۳۰ کاتعارف

اس فصل میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے بقیہ دفعات یعنی دفعہ ۱۶ تا دفعہ ۳۰ تک کا تعارف پیش کیا جائے گا۔

دفعہ:۱۶

"(۱)انسان(چاہے مرد ہو یا عورت) جب بالغ ہو جائے تو اسے یہ حقوق حاصل ہوں گے نکاح(شادی)،گھر بسانا اور طلاق۔اور اس باب میں رنگ،نسل،مذہب اورقوم رکاوٹ نہیں بن سکتی نکاح اور طلاق کے معاملہ میں مرد وعورت برابر کے حقوق رکھنے والے ہوں گے۔"

(۲)نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہو گا۔

"(۳)خاندان، معاشرے کیایک فطری اوراہم اکائی کی حیثیت سے خاندان کی تحفظ سٹیٹ اور معاشرے دونوں کی ذمہ داری ہے۔"

دفعہ: ۱۷

(۱) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کاحق حاصل ہے۔

(۲) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ: ۱۸

"ہر انسان(چاہے مرد ہو یا عورت) کو فکر،ضمیر اور مذہب کی آزدی کا پورا حق حاصل ہوگا۔ اور اس حق میں ہر انسان آزاد ہوگا کہ وہ مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور عوام میں یا انفرادی طور ،اکیلے میں یا معاشرے کے دیگر افراد کے ساتھ مل کر اپنے عقیدے کی تبلیغ، اُس پر عمل، عقیدے پر ایمان لانے کی صورت

میں اس پر مقرر شدہ عبادات اور مذہبی رسومات آزادی کے ساتھ پوراکرنا بھی شامل ہے۔"

دفعہ:۱۹

" تمام انسان اپنی مرضی کی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کے مکمل اور پورا حق رکھتے ہیں ۔اس حق میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ بغیر کسی دباؤ کے آزادی کے ساتھ اپنی رائےکا قیام اور ہر ممکن طریقوں سے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کئے، علم اورخیالات کی جستجو کرکے اُس علم وخیال کی اشاعت کرے۔"

دفعہ: ۲۰

(۱)امن کے ساتھ رہتے ہوئے ہرشخص کا یہ حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر دوسرے انسان/انسانوں کے ساتھ مل جل کررہنے اور انجمنیں قائم کرسکتا ہے ۔

"(۲)کسی بھی شخص پر زبردستی نہیں کی جا سکتی وہ کسی تنظیم/ انجمن میں شامل ہوجائے"

دفعہ:۲۱

"(۱)اپنے ملکی حکومت میں براہ راست یاجمہوری طور پر منتخب کئے ہوئے نمائندوں کے ذریعے ہر شخص کوحصہ لینے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"(۲)اپنے ملک میں سرکاری نوکری حاصل کرنے کا حق ملک کے تمام باشندوں کو یکساں حاصل ہے۔"

" (۳)عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔یہ مرضی مناسب اوقات میں ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائی گی جوعام اور برابری کے بنیاد پر رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہVote یا اس کی متبادل کسی دوسرے آزادانہ طریقے سے رائے دینی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔"

دفعہ:۲۲

"ہر شخص کومعاشرے کے رکن کی حیثیت سے باقاعدہ معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہےاسی طرح یہ حق بھی ہےکہ مذکورہ شخص ملکی نظام اور فراہم شدہ وسائل کے موافق قومی کوشش اورانٹر نیشنل تعاون سے ایسے معاشی،معاشرتی اور تہذیبی حقوق حاصل کرے،جس کے بعد اس کی عزت اور شخصیت کے آزادانہ نشوونما ممکن ہو ۔"

دفعہ: ۲۳:

"**(۱)**ہرشخص کو کام کاج اور اس کی معقول ومناسب شرائط ،
آزادانہ طریقے سے روزگار کے انتخاب، اور ہر مرحلے پر
بے روزگاری کے خلاف حقِ تحفظ حاصل ہے۔"

(۲)ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیرمساوی کام کے لیےمساوی بدلے کاحق ہے۔

"**(۳)**بندہ جو کام کرتا ہے اس کام کے بدلے کے طور پروہ
معقول و مناسب تنخواہ کا حق رکھتا ہے جس میں خود اس کے اور
اس کےزیر نگرانی تمام افراد کے لیے ایک باعزت زندگی کی
گرانٹی ہو ۔اور اگر ضرورت محسوس کی جائے تو معاشرتی تحفظ
کے دوسرے ذریعوں سے اس تنخواہ میں اضافہ کیا جا سکے۔"

(۴)ہرشخص کو اپنے مفاد کےبچاو کے لیےتجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس مین شریک
ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ:۲۴

(انسان کی بنیادی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے)ہر انسان کو فرصت کے لمحات اور آرام کا حق ہے جس میں (کسی کے پاسکام کرتے ہوئے) کام کے اوقات کی حدبندی اورمعاوضے کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ:۲۵

(۱)ہرشخص کواپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے۔جس میں خوراک ،پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری

معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری،بیماری ،معذوری،بیوگی،بڑھاپے یا ان حالات میں روزگا سے محرومی ،جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں،کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

"(۲)بچہ اور زچہ خصوصی توجہ اور امداد کے مستحق ہیں۔سارے بچے خواہ وہ شادی سے پہلے پیدا ہوئے ہو یا شادی(نکاح) کے بعد،معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔"

دفعہ:۲۶

"(۱) تعلیم حاصل کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے ۔ بنیادی و ابتدائی تعلیم (ریاست کی ذمہ داری پر) مفت اور جبری ہوگی ۔ پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم حاصل کرنے کا(سب کے لیے)عام انتظام کیا جائے گا۔اور لیاقت کی بنیاد پر اعلٰی تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے یکساں طور پر ممکن ہوگا۔"

"(۲) بامقصد تعلیم ہوگی جس سے انسان کی شخصیت کی پوری نشوونما ہو گی ۔ جوانسان کے حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کاذریعہ ، اقوام عالم اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی رواداری، مفاہمت اور دوستی کو ترقی دینی والی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کے سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔"

"(۳)بچوں کے بارے میں والدین یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ وہ اُن کو کس قسم کا تعلیم دیتے ہیں۔"

دفعہ:۲۷

(۱) ہرشخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے،ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنسی ترقی اور اس کے ثمرات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔"

"(۲)ہرانسان اُس کے اخلاقی اور مادی بچاؤکا حق حاصل ہے جو اسے ایسی ادبی، سائنسی یاعلمی تصنیف سے،جس کا وہ مؤلف/مصنف ہے،حاصل ہوتے ہیں۔"

دفعہ:۲۸:

"اس عالمی منشور میں مذکور تمام حقوق اور آزادیاں ہر انسان کو حاصل ہیں جس کے ذریعے وہ معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہو سکتا ہے۔

دفعہ:۲۹

(۱)چونکہ معاشرہ ہی میں رہ کر انسانی شخصیت کی آزادانہ اور مکمل نشوونما ہوتی ہے اس وجہ سے ہرشخص پر معاشرے کے حق ہیں۔

(۲) ہر انسان پر ایسی ہی پابندی ہے کہ اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں یہ بات ملحوظ نظر ہو کہ اس سے دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کا احترام کرے اور انہیں تسلیم کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق،امن عامّہ اورعام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں۔

(۳)یہ آزادیاں اور حقوق یونائٹیڈ نیشن کے مقاصد اور اصول کے خلاف کسی حالت میں بھی عمل میں نہیں لائی جا سکتیں

دفعہ: ۳۰

"عالمی منشور (میں بیان شدہ دفعات)کے اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک،گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کاحق پیدا ہو جس کی غرض ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو۔جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔"

باب دوم

سیرتِ نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں سماجی حقوق

فصل اول

کنبے،خاندان اور بچوں کے سماجی حقوق

کنبہ: کنبے کو عربی میں أسرةٌ کہا جاتا ہے۔ابن منظور کے بقول:الأسرة عشيرة الرجل وأهل بيته[1] آدمی کا کنبہ واہل وعیال۔

اورماہرین سماجیات کے نزدیک وہ چھوٹی سی جماعت جوعام طور پرماں،باپ اور ایک یا زیادہ بچوں سے بنی ہوئی ہو۔جن کی باہمی محبت ہو اور ایک دوسرے سے حق مسؤلیت رکھتے ہو۔ اورجس میں بڑےچھوٹوں کی تربیت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہو تاکہ آگے جا کر یہ بچے معاشرے کے اچھے فرد ثابت ہو۔[2]

کنبے کی اہم خصوصیات میں سے چند درجہ ذیل ہیں۔

(الف):یہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہےکیونکہ معاشرہ افراد ہی سے وجود میں آتا ہے۔اور معاشرے میں کوئی بھی فرد اکیلے اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔بلکہ وہ ہر حال اور مکان میں دوسرے افراد کے تعاون کا محتاج رہتا ہے۔

(ب):اُسرة یعنی کنبے کے بنیادی اہداف میں سے ایک ہدف یہ ہے کہ وہ اپنی مادی ضروریات پوری کرنے،بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنےاور اولاد کی بہترین تربیت کرنا چاہتے ہیں۔لیکن چونکہ یہ تمام کام صرف ایک فرد نہیں کر سکتا اس وجہ سے کنبے کی صورت میں

---

[1] لسان العرب،ج4ص19،القاموس المحيط،فصل الهمزة،ج1ص438۔

[2] محمد حسن توفیق الدیب،الاجتماعیۃ مع الاسرة والطفولۃ والمسنین،الکتاب الاول،ص28،م س نامعلوم

رہ کر کنبے کے افراد مشترکہ طور پر یہ کام سر انجام دیتے ہیں۔ تو جب کنبے میں رہ کر بچے کی مشترکہ طور پر تربیت کی جاتی ہے تو وہ لازماََ معاشرے کا ایک بہتر فرد بن کر ابھرے گا۔

(ج) ماں،باپ اور بچوں کا ایک ساتھ رہنے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ اِن افراد میں ہر ایک فرد اپنی حیثیت کے مطابق مسئول رہتا ہے۔

اسلام میں زندگی کے ہر موڑ پر کنبے کی اہمیت بہت زیادہ ہے جو قرآن کریم کے آیات سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے لوگوں اپنے رب سے ڈرو وہ رب جس نے تم(سب) کو ایک (ہی)شخص(آدم علیہ السلام) سے پیدا فرمایا یعنی اول اس سے اس کا جوڑا بنایااُس کے بعد ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پیدا کرکے روئے زمین پر پھیلا دئیےاور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم آپس میں حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور قطع رحمی سے بچو کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[1]

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادہے:

"اےلوگوں ہم نے تم کو ایک مرداور ایک (ہی) عورت (حواعلیہ السلام)سے پیداکیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کروبے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے سب سے خبردار ہے"[2]

اسی طرح مرد عورت کے باہمی شادی کے متعلق ایک جگہ ارشادہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی مائل ہو آرام حاصل کرواور تم میں محبت اورمہربانی پیدا کردی جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے اِن باتوں میں بہت سے نشانیاں ہیں"[3]

اسی طرح قرآن کریم نے نکاح کے قواعد وضوابط بھی بیان کئے ہیں کہ نکاح کن کن سے ہوسکتاہے یعنی نکاح کرنے والے دونوں مسلمان ہونے چاہیئےارشاد ربانی ہے :

---

[1] النساء1:4
[2] الحجرات13:49
[3] الروم21:30

اور اے مومنو نکاح نہ کرو ایمان لانے سے پہلے مشرک عورتوں سے کیونکہ مشر ک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن لونڈی بہتر ہے۔اور اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا کیونکہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے مومن غلام بہتر ہے۔یہ مشرک لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی مہربانی سے جنت اور بخش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے احکام وضاحت کے ساتھ لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ لوگ نصیحت پکڑیں"[1]

اسی طرح احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کنبے (اُسرة) کی اہمیت اور خصوصیت بیان کی گئی ہے۔

1۔نکاح کی ترغیب/کنبے کی بنیاد رکھنا: اس بارے میں نوجوانوں کی کافی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ نکاح(شادی) کرکے کنبے کی بنیاد رکھیں کیونکہ نکاح ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کی بدولت کنبہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم[2] کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ[3] کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم نبی علیہ السلامکے زمانہ میں نوجوان تھے اور ہمیں کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ نبی علیہ السلامنے ہم سے فرمایا کہ اےنوجوانوں کی جماعت! تم میں جسے بھی نکاح کرنے کے لیے مالی طاقت ہو اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ نظر کو نیچی رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا عمل ہے اور جو کوئی غربت کی وجہ سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کی خواہشات نفسانی کو توڑ دے گا"[4]

2۔نکاح کی بنیاد دین پر رکھنا: معاشرے میں اپنے حقوق وفرائض پائیداری سے ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہےکہ معاشرے کی بنیادی اکائی فرد/کنبہ کی بنیاد مضبوط ہو۔ قرآن کریم نے اس باب میں شریک حیات کے انتخاب کے لئے دین کو بنیادبنایا ہےکہ دوسرے اساسی اصولوں کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام ہو کہ شوہر بیوی دونوں مسلمان ہو جیسا کہ اللہ

---

[1] البقرة2:221

[2] مسلم بن الحجاج ، القشيري ،نيشاپوري، الجامع الصحيح المسمى صحيح مسلم،دار الجيل بيروت + دار الأفاق الجديدة ـ بيروت،بدون تاريخ

[3] عبد اللہ بن مسعود بن غافل بن حبيب الهذلي، أبو عبد الرحمن،رضی اللہ عنہ۔اکابر سابقون الاولون فقہاءصحابہ میں سے تھے ۔سفر وحضر اور غزوات میں رسول اللہ کے خادم اوررازداں ہونے کے وجہ سے آپ کے انتہائی قریب تھے۔ اِن کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے"وعاء ملئ علما"آپ کے وفات کے بعد کوفہ کے بیت المال کے نگران تھے۔اُن سے 848احادیث مروی ہیں۔خلافت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ میں 60سال کے عمر میں 34ھ کو وفات پائے۔(الاعلام،ج4،ص137)

[4] بخاری،کتاب النکاح،باب من لم یستطع الباءة فلیصم:رقم5066،صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب استحباب النکاح لمن ثاقت نفسہ ووجد مؤنة،رقم3464

تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کیا کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں مشرک عورت سے مسلمان باندی ہی بہتر ہے"[1]

احادیث مبارکہ میں بھی نکاح کے بنیادی اصولوں میں یہی حکم دیا گیا ہے۔چنانچہ صحیحین کی روایت ہے :

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ [2]نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عورت سے نکاح چار چیزوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے خاندانی شرف کی وجہ سے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے اور تو دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کر، اگر ایسا نہ کرے تو تیرے ہاتھوں کو مٹی لگے گی)یعنی اخیر میں تجھ کو ندامت ہو گی"[3]

اسلام نے شریک حیات کے انتخاب میں دین کا جو معیار مقرر کیا ہے اس میں بہت سارے دوسرے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہوئے بیوی اپنے شوہر کے حکم ماننے،اُس کے مال اور عزت کی حفاظت کرنے اوراسلام نے جو فرائض بیوی پر لازم کئے ہیں،اُن حقوق کی ادائیگی غرض یہ کہ مطمئن زندگی گزارنے کے تمام امور کے بجا آوری کرے گی۔شوہربھی قرآنی اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے بیوی کے تمام حقوق ادا کرے گا۔تب جا کر کنبے کے افراد اپنے حقوق وفرائض کی ادائیگی کرکے معاشرے میں پُرامن اور خوشحال زندگی گزارسکیں گے۔

(2)امام نسائی رحمہ اللہ [4] کی روایت ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلامسے کہا گیا: عورتوں میں اچھی عورت کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا" :وہ عورت جب اس کا شوہر اسے دیکھے تو وہ اُس کو خوش کر دے ، جب اُس کوکسی کام کا حکم دے تو خوش اسلوبی سے بجا لائے اوراپنی ذات اور مال کے سلسلے میں شوہر کی ناپسندیدہ باتوں میں مخالفت نہ کرے"[5]،[6]

---

[1]البقرۃ2:221

[2]آپ رضی اللہ عنہ کےنام کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔آپ کا نام کفر میں عبدالشمس اور اسلام میں عبدالرحمن ابن صخردوسی ہے،کسی نے عمر بن عامر، کسی نے عبداللہ بن عامر بھی لکھا خیبر کے سال اسلام لائے،چار سال سفر و حضر میں حضور کے ہمراہ سایہ کی طرح رہے،آپ کو بلی بڑی پیاری تھی،حتی کہ ایک بار اپنی آستین میں بلی لیے ہوئے تھے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ابوہریرہ یعنی بلیوں والے ہو،تب آپ اس کنیت سے مشہور ہوگئے،مدینہ منورہ میں 35ھ میں وفات ہوئی،جنت البقیع میں دفن ہوئے ۸۷ سال عمر ہوئی۔آپ سے چار ہزارتین سو چونسٹھ حدیثیں مروی ہیں۔(تلقیح فہوم اہل الاثر،364،الاعلام،ج3،ص308)

[3]صحیح بخاری کتاب النکاح،کتاب بدءالوحی،باب الاکفاء فی الدین،رقم:5090،صحیح مسلم،کتاب الرضاع،باب استحباب نکاح ذات الدین رقم:3708

[4]ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علیؒ النسائی ، حافظ حدیث ہیں۔ 215ھ کو خراسان کے نساء نامی گاونمیں پیداہوئے۔آپ نے امام قتیبہ بن سعیدؒالبلخی سے فیض حاصل کیا۔ تلامذہ میں علی بن جعفر الطحاویؒ، ابن السنیؒ اور محمد بن قاسم الاندلسیؒ مشہور ہیں۔ السنن الکبریٰ آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ نے 333ھ/ 915ء کو رملہ میں وفات پائی۔(الذہبی،سیر اعلام النبلاء، ج27،ص132،رقم،67۔ الزرکلی،الاعلام، ج1،ص171)۔

[5]سنن نسائی،کتاب النکاح،باب ای النساء خیر،رقم3231

[6]البانی کے نزدیک یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ناصرالدین،الالبانی،صحیح وضعیف سنن نسائی،ج7،ص303،برنامج منظومۃ التحقیقات الحدیثیۃ،الاسکندریہ

نکاح کے بعد شوہر کو اس بات کا پابند بنا دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے گا اس پر کبھی بھی ظلم نہیں کرے گا ۔

3۔نکاح کامقصد: فطری طور پر مرد عورت کا محتاج ہوتا ہے اور عورت مرد کی محتاج ہوتی ہے لیکن حالات اور معاشروں کے اختلاف کی وجہ سے مرد وعورت کی احتیاج میں فرق ہوتا ہے ۔بعض مرد ایسے ہوتے ہیں جو عورت کو صرف اپنی جذباتی تسکین کی نظر سے دیکھتے ہیں جب کہ بعض مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو عورت کوصرف کثرتِ اولاد کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔

لیکن اسلام نے ایک مرد اور عور ت کو نکاح کرتے وقت کامیاب زندگی اور مضبوط خاندان کےلیےجو اہداف مقررکئے ہیں اُ ن میں سے چند یہ ہیں۔

(الف):آرام ،محبت اور مہربانی کاذریعہ: میاں بیوی کےباہمی تعلق کے بارے اللہ تعالی فرماتا ہے:

"اور اُسی کے نشانیوں میں سے ہے کہ اس نےآپ کے لیےآپ
ہی کی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ اس کی طرف مائل ہو کر
آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کردی ان
باتوں میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں"[1]

(ب)شرمگاہ اور نظر کی حفاظت کا ذریعہ: انسان طبعی طو پر مخالف جنس کی طرف رغبت رکھتا ہے اور جب انسان پر یہ کیفیت حاوی ہو جاتی ہےتو وہ معاشرے میں ہر طرح جائزو ناجائز طریقوں سے دلی تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے۔اسلام نے انسان کی اس طبعی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک آسان اور پُرتسکین راستہ،نکاح کا دکھلایا ہے تا کہ انسان کی نظر اور شرمگاہ کہیں غلط استعمال نہ ہو۔نبی علیہ السلام نے فرمایا:

"اے جوانوں کی ٹولی ! تم میں جسے بھی نکاح کرنے کے لیے
مالی طاقت ہو اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ نظر کو نیچی
رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا عمل ہے اور
جو کوئی نکاح کی بوجہ غربت طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے
کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کی خواہشات نفسانی کو توڑ
دے گا "[2]

(ج)نسل انسانی کی زیادتی: اللہ تعالی کی حکمت ہے کہ ایک حد تک انسانی نسل میں اضافہ اور تسلسل ہوتاکہ زمین آباد رہے اللہ کی عبادت کرنے والے زیادہ ہو،معاشرے میں الفت ومحبت پھیلے جیسا کہ بیٹوں کے متعلق ارشاد ہے:

"(دنیاوی)مال اور بیٹے تو یہاں کی زندگی کی زیب وزینت
ہیں اورباقی رہنے والی نیکیاں ہی ثواب کے لحاظ سے تمہارے
رب کے ہاں بہت اچھی اورامید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں"[3]

اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ ایسی عورتوں سے نکاح کیا کرو جوزیادہ بچے پیدا کرنے والیاں ہو۔ارشاد ہے:

---

[1] الروم21:30

[2] بخاری،کتاب النکاح،باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم:رقم5066،صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب استحباب النکاح لمن ثاقت نفسہ ووجد مؤنۃ،رقم3464

[3] الکھف46:18

ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا: مجھے ایک عورت ملی ہے جو اچھے خاندان والی ہے، خوبصورت ہے لیکن اس سے اولاد نہیں ہوتی تو کیا میں اس سے شادی کر لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :نہیں"، پھر وہ آپ کے پاس دوسری بار آیا تو بھی نبی علیہ السلام نے اسے منع فرمایا، پھر تیسری بار آیا تو نبی علیہ السلامنے فرمایاایسی عورت سے شادی کروجوزیادہ محبت کرنے والی اورزیادہ بچے جننے والی ہو، کیونکہ بروز قیامتمیں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا"[2][1],

(د)بچوں کی نگہداشت اور ذریعہ تربیت: سیدناابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جسے دے کر دینے والا مالدار ہی رہے اور ہر حال میں(اوپر کا ہاتھ)دینے والے کا(نیچے کے)لینے والے کے(ہاتھ سے بہتر ہے اور)خرچ کی(ابتداء ان سے کرو جو تمہاری نگہبانی میں ہیں۔ عورت کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مجھے کھانا دے ورنہ طلاق دے۔ غلام کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مجھے کھانا دو اور مجھ سے کام لو۔ بیٹا کہہ سکتا ہے کہ مجھے کھانا کھلاؤ یا کسی اور پر چھوڑ دو۔ لوگوں نے کہا: اے ابوہریرہ !کیا)یہ آخری ٹکڑا بھی(کہ جووہ کہتی ہے آخر تک۔ آپ نے نبی علیہ السلامسے سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ یہ ابوہریرہ کی خود اپنی سمجھ ہے"[3]

اس حدیث سے صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کا نفقہ باپ کے ذمے واجب ہے
امام ابن حجر الشافعی رحمہ اللہ[4] فرماتے ہیں۔
"جمہور علماء اسلام کا مذہب یہ ہے کہ بیٹے کی بلوغت اور بیٹی کی شادی تک بچوں کا نفقہ باپ کے ذمے واجب ہے،اس کے بعد ضروری نہیں ہے۔ہاں اگر یہ بچے زمنی نہ ہو۔پس اگر ان بچوں کا مال ہو تو پھر باپ پر کچھ بھی لازم نہیں ہے۔اور امام شافعی ر حمہ اللہ [5]نے اس حکم میں بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ پوتے اور نواسے بھی شامل کئے ہیں[1]"

---

[1]سلیمان بن اشعث،سجستانی،ابوداؤد،سنن ابی داؤد،کتاب النکاح،باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء،رقم2052،دار اکتاب العربی،بیروت،بدون تاریخ

[2]البانی کے نزدیک یہ حدیث حسن صحیح ہے۔الالبانی،محمد ناصر الدین،صحیح وضعیف سنن ابوداود،ج5،ص50،

[3]صحیح بخاری،کتاب النفقات،باب وجوب النفقۃ علی الاھل والعیال رقم:5355

[4]آپ ابو الفضل شہاب الدین ابن حجر احمد بن علی بن محمدؒ العسقلانی ہیں۔ قاہرہ میں 773ھ/1372ء میں پیدا ہوئے۔ حدیث،رجال اور تاریخ کے بڑے عالم ہیں۔صاحب تصانیف ہیں۔ ان میں مشہورتصانیف فتح الباری،الاصابہ فی تمییز الصحابہ،لسان المیزان، تقریب التہذیب اور تہذیب التہذیب ہیں۔ 852ھ/1449ء میں وفات پائی۔(ابن حجر، عسقلانی،ابوالفضل احمد بن علی،لسان المیزان ،مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت 1406ھ/1998ء،ج1،ص1۔ الزرکلی، الاعلام،ج1،ص178)

[5]آپ ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباسؒالہاشمی ہیں۔ فقہ و اجتہاد کے معروف ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ 150ھ/767ء کو غزہ میں پیدا ہوئے۔ آپ شعر،لغت، آیام عرب، فقہ اور حدیث کے بڑے عالم تھے۔ صاحب التصانیف ہیں۔کتاب الام اور

(ہ)معاشرے میں سسرال کے ساتھ مضبوط روابط کا ذریعہ: امام بخاری رحمہ اللہ [2]نے اپنی صحیح بخاری میں ایک باب باندھا ہے:اللہ کا ارشاد:اے لوگو ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا اور تم میں چھوٹے بڑے قبیلے پیداکیے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔بے شک اللہ کے ہاں وہ سب سے بہتر ہے جو زیادہ تقویٰ دار ہو" اسی طرح اللہ کاارشاد ہے:"واتقوااللہ الذی تساءلون بہ والارحام" ومایُنھی عن دعوی الجاہلیۃ الشعوب النسب البعید والقبائل دون ذلک"[3]

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

" وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔پھر اس کوددھیال ننھیال اور سسرال والا بنایا۔اور تمہارا رورد گا ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے"[4]

تونکاح کے اہم ترین فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ معاشرے کے افراد کے درمیان مضبوط بنیادوں پر تعلقات استوار کرتا ہے کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ صرف مرد وعورت کاملاپ نہیں ہوتا بلکہ یہ تو دو خاندانوں کے درمیان ایک تعلق کاذریعہ بھی بن جا تا ہے اور پھر جب بچے پیدا ہوتے ہیں تو اِس سے معاشرے میں مزید رشتے جنم لیتے ہیں جیسے چچا،ماموں وغیرہ۔نبی علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ نکاحوں کا مقصد معاشرے میں اجتماعی فائدے کی خاطر تھا۔
اگر ہم نبی علیہ السلام کا سیدہ جویریۃ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا حال دیکھے تو اس سے بخوبی اِس بات کی وضاحت مل جاتی ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ:

"ام المؤمنین جویریہ[5]بنت حارث بن مصطلق رضی اللہ عنہا،ثابتبنقیسبنشماس رضی اللہ عنہ[6] یا ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں آئیں تو جویریہ نے ان سے مکاتبت کر لیا، اور وہ ایک خوبصورت عورت تھیں جسے ہر شخص دیکھنے لگتا تھا، وہ نبی علیہ السلامکے پاس اپنے بدل کتابت میں تعاون

الرسالہ مشہور ہیں۔ شیوخ میں امام مالک بن انسؒ ، امام محمد الشیبانیؒ تلامذہ امام غزالیؒ،امام نوویؒ اور تقی الدینؒ السبکی شامل ہیں۔ 204ھ/820ء کو مصر میں وفات پائی۔(الزرکلی،الاعلام، ج6،ص26۔الذہبی،تذکرۃ الحفاظ،ج1،ص367)۔

[1]احمد بن علی،ابن حجر،فتح الباری شرح صحیح البخاری،ج9ص502،501دار المعرفۃ،بیروت1379ھ

[2]ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیمؒ ہیں۔ امام المحدثین اور امیر المحدثین فی الحدیث کی لقب سے مشہور ہیں۔ 194ھ/810ء کو بخارا میں پیدا ہوئے۔ محدثین کی ایک بڑی تعداد جن میں امام علی بن مدینیؒ اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ شامل ہیں سے استفادہ کیا ہے۔ تلامذہ میں امام مسلمؒ،امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ جیسے نامور محدثین شامل ہیں۔ مشہور تصانیف یہ ہیں۔ الادب المفرد، کتاب العلل، الجامع الصحیح، تاریخ کبیر اور تاریخ اوسط ۔ 256ھ/ 790ء کو وفات پائی۔الاعلام، ج6،ص34۔ تذکرۃ الحفاظ، ج2،ص555۔ سیر اعلام النبلاء، ج23،ص383،رقم171

[3]صحیح بخاری،کتاب المناقب،رقم:64

[4]الفرقان54:25

[5]جویریہ بنت حارث بن أبي ضرار، خزاعیۃ، رسول اللہ ﷺ کے زوجہ تھیں۔پہلی نکاح مسافع بن صفوان سے ہوئی تھی جو یوم المریسیع سنۃ 6 ھ کو وفات پائے۔ اِن کے والد اپنے قوم کے سردار تھے۔یہ بھی بنی المصطلق کے قیدیوں کے ساتھ قیدی بن گئیں۔نبی علیہ السلامنے ان کا فدیہ دے کر آزاد کرا کے ان کےساتھ نکاح کیا۔ان کا نام "برہ"تھا نبی علیہ السلام نے تبدیل فرماکر "جویریہ رکھ دیا۔ان سے سات احادیث منقول ہیں ۔مدینۃ منوہ میں 65 سال کی عمر میں 56 ھ بمطابق 676 م کووفات پائیں۔(سیر اعلام النبلاء،ج2،ص262،261،الاعلام2:148)

[6]ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ،خزرجی،انصاری صحابی ہے۔رسو ل اللہ ﷺکے خطیب کہلاتے ہیں۔احد اور اُس کے بعد کے معرکوں میں شریک رہے۔خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مشہور زمانہ معرکہ"یمامہ" میں 12ھ کو شہید ہوئے۔(اسدا لغابۃ1:297،ترجمہ:569،الاعلام2:98)

مانگنے کے لیے آئیں، جب وہ دروازہ پر آ کر کھڑی ہوئیں تو میری نگاہ ان پر پڑی ان کا آنامجھے ناگوار گزرا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ عنقریب آپ بھی ان کی وہی ملاحت دیکھیں گے جو میں نے دیکھی ہے، اتنے میں وہ بولیں: اللہ کے رسول! میں جویریہ بنت حارث ہوں، میرا جو حال تھا وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ثابتبنقیس کے حصہ میں گئی ہوں، میں نے ان سے مکاتبت کر لی ہے، اور آپ کے پاس اپنے بدل کتابت میں تعاون مانگنے آئی ہوں، نبی علیہ السلامنے فرمایا" :کیا تم اس سے بہتر کی رغبت رکھتی ہو؟"وہ بولیں: اللہ کے رسول! وہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :میں تمہارا بدل کتابت ادا کر دیتا ہوں اور تم سے شادی کر لیتا ہوں"وہ بولیں: میں کر چکی یعنی مجھے یہ بخوشی منظور ہے(۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا[1] کہتی ہیں: پھر جب لوگوں نے ایک دوسرے سے سنا کہ نبی علیہ السلامنے جویریہ سے شادی کر لی ہے تو بنی مصطلق کے جتنے قیدی ان کے ہاتھوں میں تھے سب کو آزاد کر دیا، اور کہنے لگے کہ یہ لوگ نبی علیہ السلامکے سسرال والے ہیں، ہم نے جویریہ(رضی اللہ عنہا) جیسی عورت اپنی قوم کے حق میں زیادہ برکت والی نہیں دیکھی کیونکہ ان کی وجہ سے بنی مصطلق کے سو قیدی آزاد ہوئے تھے[2]،[3]۔

امام ابوداؤدرحمہ اللہ [4] کہتے ہیں: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ولی خود نکاح کر سکتا ہے"

4۔کنبے اور خاندان کے تمام افراد کے حقوق اور فرائض:اسلام نے کنبے کے افراد کے بارے میں ہر فرد کو اس کی حیثیت کے مطابق ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔شوہر اپنی بیوی،بیوی اپنے شوہر،والدین اپنے بچوں اوربچے اپنے والدین کے بارے میں مسؤل ہیں ۔حدیث میں آتا ہے:

"تم میں سے ہر فرد ایک طرح کا حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ پس بادشاہ حاکم ہی ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ ہر انسان اپنے گھر کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور

[1] ام المومنین عائشہ بنت ابو بکر القرشیہ رضی اللہ عنہما۔ مکہ معظمہ میں 9سال قبل ہجری 613ء کو پیدا ہوئی۔ فقیہ ، عالمہ اور فاضلہ صحابیہ ہیں۔ اکابر صحابہ آپؓ سے میراث کے مسائل پوچھا کرتے تھے۔2 ہجری کو رسو اللہ سے ان کی شادی ہوگئی۔ آپ رضی اللہ عنہا سے 2210 احادیث کی روایت کی گئی ہیں۔ آپ57ھ/676ء کو وفات پائی۔(ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج4،ص108۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج8،ص16،رقم1145۔

[2] احمد بن حنبل،ابو عبداللہ،مسند احمد بن حنبل،ج6،ص277،مؤسسۃ قرطبہ،القاھرۃ

[3] البانی کے نزدیک یہ حدیث حسن ہے۔صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج8،ص431

[4] ابوداود سلیمان بن اشعث بن شدادؒ السجستانی ہیں۔ بڑے محدث ہیں۔ سنن ابو داود آپ ہی کی تصنیف ہے۔ 202ھ/817ء کو پیدا ہوئے۔ امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن بشارؒ اور ابن المدینی جیسے مشہور علماء سے علم حاصل کیا جبکہ شاگردوں میں الترمذیؒ اور ابو عوانہؒ مشہور ہیں۔ 275ھ/ 888ء کو وفات پائی۔(الذہبی،سیر اعلام النبلاء،ج13،ص203۔ الزرکلی،الاعلام،ج3،ص122)

اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ یہ سب میں نے نبی علیہ السلامسے سنا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ نبی علیہ السلامنے یہ بھی فرمایا تھا کہ مرد اپنے والد کے مال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ پس ہر شخص حاکم ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا"[1]

اس کے بعد اسلام نے تفصیلی طورپر یہ حقوق وفرائض بیان کئے ہے۔شوہر کے ذمے کھانا پینا،گھر کی فراہمی اورکپڑا دینا ہے حدیث میں آتا ہےایک صحابی رضی ا للہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے پوچھا:

"اے اللہ کے رسول! ہمارے اوپر ہماری بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب پہنو یا کماؤ تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو، برا بھلا نہ کہو، اور گھر کے علاوہ اس سے جدائیاختیار نہ کرو ۔ امام ابو داؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ"ولاتقبح" کا مطلب یہ ہے کہ اسے" قَبَّحَكِ اللَّهُ "نہ کہو"[2]،[3]

بلکہ بیوی کو تو یہ بھی اجازت ہے کہ جب شوہر مقررہ خرچ میں کمی کرتا ہےتو یہ اپنی ضرورت کے تحت شوہر کا مال اُس کی اجازت کے بغیر بھی استعمال کر سکتی ہے۔صحیحین میں حدیث ہے :

"ام المؤمنین سیدہ عائشہ[4] رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ[5] کی والدہ ہندہ رضی اللہ عنہا[6] نے نبی

---

[1]صحیح بخاری،کتاب ،باب العبد راع فی مال سیدہ ولایعل الا باذنہ،رقم2409،صحٰح مسلم،کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علیہ،رقم4828

[2]سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی حق المراۃ علی زوجھا،رقم:2144

[3]قال الالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج5،ص142

[4]ام المومنین عائشہ بنت ابو بکر القرشیہؓ ہیں۔ مکہ معظمہ میں 9سال قبل ہجری 613ء کو پیدا ہوئی۔ فقیہ ، عالمہ اور فاضلہ صحابیہ ہیں۔ اکابر صحابہ آپؓ سے میراث کے مسائل پوچھا کرتے تھے۔2 ہجری کو رسو اللہ□ سے ان کی شادی ہوگئی۔ آپؓ سے 2210 احادیث کی روایت کی گئی ہیں۔ آپ57ھ/676ء کو وفات پائی۔[ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج4،ص108۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج8،ص16،رقم1145]

[5]معاویہ بن (ابو سفیان)صخرؓ بن حرب بن امیہ بن عبدالشمس القرشی الاموی صحابی رسول□ ہیں۔ 603ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں شام کے والی مقرر ہوئے۔شام میں اموی دور حکومت کا بنیاد آپ نے رکھا۔ آپ نے پہلا بحری جہاز ایجاد کیا۔ آپ نے دمشق میں 60ھ/680ء میں وفات پائی۔(ابن الاثیر، اسد الغابہ،ج5،ص220۔ابن حجر،الاصابہ،ج6،ص151۔الزرکلی،الاعلام،ج2،ص393)

[6]ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس بن عبدمناف،اُم معاویہ بن ابی سفیان ہے۔آپ ان عورتوں میں سے ایک ہے جنہوں نے رسول اللہ □ کے ساتھ بیعت کی۔آپ نے فتح مکہ کے دن اسلام لایا اور یرموک کی جنگ میں شہادت پائی۔(الطبقاتالکبری،ج8 ،ص 235۔معرفۃالصحابہلأبینعیم،ج6،ص 3460)

علیہ السلام سے کہا کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ تو کیا اگر میں
ان کے مال سے چھپا کر کچھ لے لیا کروں تو کوئی حرج ہے؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے لیے اور اپنے
بیٹوں کے لیے نیک نیتی کے ساتھ اتنا لے سکتی ہو جو تم سب
کے لیے کافی ہو جایا کرے"[2]

شریعت نے بیوی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے اوراس کی جسمانی ضروریات پوری کرنا شوہر کے ذمے لگایا ہے،جیسا کہ روایت میں آتا ہے :

"نبی علیہ السلامنے سلمان رضی اللہ عنہ[3] اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ[4]کے درمیان ہجرت کے بعدمؤاخاۃ کارشتہ قائم کیا تھا۔
ایک مرتبہ سلمان رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے گئے۔ تو)ان کی بیوی (ام الدرداء رضی اللہ عنہا کو بہت پراگندہ حال میں دیکھا۔ ان سے پوچھا کہ یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہیں جن کو دنیا کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے پھر ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور ان کے سامنے کھانا حاضر کرکے کھانے کے لیے کہاتو انہوں نے کہا کہ میں تو روزے سے ہوں، اس پر سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک تم خود بھی شریک نہ ہو گے۔ راوی نے بیان کیا کہ پھر وہ کھانے میں شریک ہو گئے(اور روزہ توڑ دیا)رات ہوئی تو ابوالدرداء رضی اللہ عنہ عبادت کے لیے اٹھے اور اس مرتبہ بھی سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابھی سو جاؤ۔ پھر جب رات کا آخری حصہ ہوا تو سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا اب اٹھ جاؤ۔ چنانچہ دونوں نے نماز پڑھی۔

---

[1]ابو سفیان صخر ؓبن حرب بن امیہ بن عبدالشمس بن عبد مناف القرشی صحابی ہیں۔ابن ماجہ کے علاوہ صحاح کے راوی ہیں۔ جاہلیت میں مشرکین کے سرادر تھے۔ جنگ احد اور خندق میں مشرکین آپ کی سربراہی میں لڑے۔ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔تلامذہ میں عبداللہ بن عباسؓ،معاویہ بن ابو سفیانؓ اور قیس بن ابی حازمؒ شامل ہیں۔31ھ/652ء میں وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج5،ص21۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص215۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج7،ص181)

[2]بخاری،کتاب البیوع،باب من اجری امرالامصار علی ما یتعارفون بینھم فی البیوع والاجارۃ والمکیال والوزن، رقم:2211،مسلم،کتاب الاقضیۃ،باب قضیۃ ھند،رقم:4574

[3]سیدناسلمان الفارسی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہے۔اپنے آپ کو "سلمان الاسلام" کہا کرتےتھے۔اصل میں ایرانی مجوسی تھے۔بہت زیادہ عمر پائی۔جہاںِ دیدہ شخصیت تھی۔اہل فارس،یہوداورعرب کے قصائد پڑھ چکے تھے۔وطن سے آرہے تھے کہ راستے میں بنی کلب نے اُنہیں غلام بنایا۔بنوقریظہ کے ایک شخص نے خرید کر مدینہ منورہ لائے۔قباء میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی ۔مسلمانوں نے اُنہیں خرید کر آزاد کرالیا۔صاحب الرائے اورقوی جسم کے مالک تھے"خندق"اُنہی کے مشورے پر کھودا گیا تھا۔رسول اللہ ﷺ اُنہیں اپنے خاندان کا ایک فرد مانتے تھے،اُن سے 60 احادیث مروی ہیں ۔مدائن کے والی رہے اور وہیں پر36ھ کو وفات پائے(الاعلام3/111-112)

[4]عویمر بن شید بن قیس،انصاری،ابوالدرداء،رضی اللہ عنہ۔ اُن کے نام عویمریاعامر ہےاور اُن کےوالد کےنام مالک یاعویمر یاعبداللہ اور یا ثعلبہ ہے ۔بدر کے دن ایمان لائے۔جلیل القدر صحابی ہیں۔بڑے عالم فاضل تھے۔ دمشق کے قاضی رہے۔آپ اُن چند صحابہ میں سے تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حیات مبارک میں قرآن کو جمع کیا تھا۔عہد عثمانی رضی اللہ ونہ میں دمشق کے قاضی رہے۔اُن سے 199 احادیث مروی ہیں۔سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے تین سال پہلے23ھ یا33ھ کو وفات پائے۔ (سیراعلام النبلاء2/335-337)

اس کے بعد سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے۔ جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اس لیے ہر حق والے کے حق کو ادا کرنا چاہئے، پھر آپ نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا"[1]

شوہر کا بیوی کو مارنے اور گالے دینے کی بھی ممانعت آئی ہے۔جیسا کہ ایک صحابی نے نبی علیہ السلام سے پوچھا:

"اے اللہ کے رسول! ہمارے اوپر ہماری بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب پہنو یا کماؤ تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو، برا بھلا نہ کہو، اور گھر کے علاوہ اس سے جدائیاختیار نہ کرو ۔ امام ابو داؤد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ"ولاتقبح" کا مطلب یہ ہے کہ اسے" قَبَّحَكِ اللَّهُ "نہ کہو"[2]

اس حدیث سے تو بعض فقہاء نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیوی کو کسی بھی حالت میں مارنے کی اجازت نہیں خواہ وہ نافرمان ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ عظیم آبا دی رحمہ اللہ لکھتے ہیں-وَظاهر الحديث النهى عن الضرب مطلقا وان حصل نشوز،وبه اخذالشافعية[3]-حدیث کے ظاہر سے مطلقا مارنے سے منع معلوم ہوتا ہے اگر چہ وہ نافرمان ہو-اور یہی شوافع کا مسلک ہے۔
قلتُ:حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے پر نہیں مارنا چاہیے ہاں نافرمانی یا بدکاری وغیرہ کے ارتکاب کی صورت میں چہرے کے علاوہ مار سکتے ہیں[4]۔
اسی طرح عائشۃ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے،فرماتی ہے کہ:نبی علیہ السلامنے فرمایا" :تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں اور جب تم میں سے کوئی مر جائے تو اسے خیر باد کہہ دو، یعنی اس کی برائیوں کو یاد نہ کرو[5]،[6]

نبی علیہ السلام نے واضح طور پر فرمادیا کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتا ہو-اور نبی علیہ السلام اپنے اہل وعیال سے بہترین حسن معاشرت رکھتے تھے-علیہ صلوٰۃ اللہ وسلم تسلیما کثیرا۔
حدیث کو دیکھتے ہوئے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ حسن معاشرت صرف زندگی کی حد تک محدودنہیں بلکہ موت کے بعد بھی اہل وعیال کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے-جیسا کہ فرمایا"وإذامات صاحبکم"،یعنی موت کے بعد اُ س کی برائیوں کا ذکر نہ کیا کرو کیونکہ یہ بھی حسن اخلاق میں آتا ہے۔

---

[1]بخاری،کتاب الصوم،باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع،رقم:1968
[2]سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی حق المراۃ علی زوجھا،رقم:2144
[3]لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نافرمان بیوی کو مارنے کے قائل ہے-[محمد بن ادریس،الشافعی،الام،ج6،ص136،دارالمعرفۃ،بیروت،1393]
[4]محمد شمس الحق ،عظیم آبادی،عون المعبود شرح ابو داؤد،ج6،ص182،دارالنشر،المکتبۃالسلفیۃ،المدینۃ المنورۃ،1388ھ
[5]سنن ترمذی،کتاب المناقب،باب فضل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم،رقم:3895دار احیات التراث العربی،بیروت
[6]قال الالبانی،ھذاحدیث صحیح،سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ،رقم3895

اس کے مقابلے میں بیوی کے بھی کچھ فرائض ہیں۔تاکہ معاشرے کی بنیادی اکائی کنبہ پائیدار اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو،ذیل میں چند اہم ذکر کئے جاتے ہیں۔

(الف)شوہر کی اطاعت: زندگی کے اکثر مراحل میں انسان کو کسی نہ کسی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے،کیونکہ قیادت ہی اپنے ماتحتوں کے ساتھ مل کر ضروریات زندگی کے حصول اور اُن کے استعمال کے بارے میں ایک متوازن لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ وصف میاں بیوی میں شوہر ہی کو حاصل ہے کیونکہ عقل،جسم اور قویٰ کے اعتبار سے شوہر کوفوقیت حاصل ہے۔لہٰذاجن امور میں اللہ تعالی کی نافرمانی نہ ہو،بیوی کو شوہر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشادہے:

> " عورتوں کے اوپرمرد حاکم ہیں اس لئے کہ اللہ نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمان بردار ہوتی ہیں اور اُن کی پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں مال و آبرو کی خبرداری کرتی ہیں اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سر کشی اوربد خوئی کرنے لگی ہے تواول تو ان کو زبانی (طورپر)سمجھاؤ،اگر(اس طریقے سے) نہ سمجھیں تو(دوسرا طریقہ اختیار کرکے) پھر اُن کے ساتھ(اکٹھا) سونا ترک کر دواگر اس پربھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو۔پھر اگر تمہارا کہنا مان لیں تو پھر اُن کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔بے شک اللہ بہت اونچاہے بڑا ہے"[1]

اسلام نے بیوی کو تاکید کی ہے کہ وہ ہمیشہ شوہر کے اطاعت گزار رہے چنانچہ ایک جگہ بیوی کو اپنے شوہر کی اطاعت گزاری کو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر اجر وثواب قرار دیا ہے۔ارشاد ہے:"سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ[2] سے روایت ہے:ہم نبی علیہ السلام کے پاس بیھٹے تھے کہ اس دوران ایک عورت آئی۔سلام کیا اور کہا:اے اللہ کے رسول میں آپ کے پاس عورتوں کی نمائندہ بن کر آئی ہو۔اللہ مردوں اور عورتوں کا رب ہیں اور آدم (علیہ السلام)بھی مردوں اور عورتوں کا باپ ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہیں۔(لیکن)مرد جہاد کرکے اللہ کے راستے میں شہید ہوجاتے ہیں جو اللہ کے ہاں زندہ ہوتے ہیں اور اُن کورزق بھی ملتا ہے۔(اسی وجہ سے) اُن کے لیے اجر وثواب ہے اور ہم اُن کے خدمت کے واسطے گھر میں بیھٹے رہتے ہیں ۔تو ہمیں کیا ملے گا ؟نبی علیہ السلام نے فرمایا میرے طرف سے عورتوں کومیرے طرف سے سلام کہہ کرکہہ دیجئیے کہ شوہر کی اطاعت میں بھی اُتنا ہی ثواب ہے (جتنا مردوں کے لیے جہاد میں ہے) لیکن تم میں سے بہت کم عورتیں شوہروں کے تابعدار ہوتے ہیں"[3]۔

---

[1] النساء34:4

[2] جابر بن عبداللہ انصاریؓ ہیں۔ صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔ اٹھارہ غزوات میں حصہ لیا۔ مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔آپ کے 1540 مرویات ہیں۔آخری عمر میں نابینا ہوگئے۔94سال کی عمر میں 78ھ/697ء کو وفات پائی۔
ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص65۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج1،ص213۔
الزرکلی،الاعلام،ج2،ص104۔

[3] عبداللہ بن محمد،الاموی،القرشی،ابن ابی الدنیا،مداراۃ الناس،باب مداراۃ المراۃ لزوجہا وحسن معاشرتہا،ج1ص144،دار ابن حزم،بیروت،1998ء

اسی طرح شوہر کی نافرمانی کو موجب گناہ قرار دیا ہے۔عمرو بن حارث بن مصطلق کہتے ہیں :کہا جاتا تھا کہ قیامت کے روز سب سے سخت عذاب دو طرح کے لوگوں کو ہو گا: ایک اس عورت کو جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرے، دوسرے اس امام کو جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں"[2]،[3]

(ب)نظرا ورشرمگاہ کی حفاظت: اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"اور مومن عورتوں سے کہدو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی تحفظ کیا کریں اور اپنی زیور کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو۔اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اورخسر اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی جیسی مومن عو رتوں اور غلا لونڈیوں کے علاوہ نیز ان خدمت کرنے والوں کے جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں یا ایسے لڑکوں کے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں غرض ان لوگوں کے سوا کسی پر اپنی زینت اور سنگھار کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں۔اور اپنے پاؤں ایسے طور سے زمین پر نہ ماریں کہ جھنکار کانوں میں پہنچے اور ان کا پوشیدہ زیور معلوم ہو جائے اور مومنو سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ"[4]

نبی علیہ السلام کے زمانے میں کسی عورت کے ساتھ اس شرط پر بیعت کی جاتی تھی کہ وہ(عورت)زنا سے اپنے آپ کو بچا کے رکھے گی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

"اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ نہ تو اللہ کے ساتھ شرک کریں گی نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان کوئی بہتان باندھ لائیں گی تو اُن سے بیعت لےلو اور اُن کے لیے اللہ سے بخشش مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"[5]

صحیح بخاری کی ایک رویت ہے: "سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی{وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ} کہ " اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں " تو (انصار کی عورتوں نے) اپنے تہبندوں کو دونوں کنارے سے پھاڑ کر ان کی اوڑھنیاں بنا لیں۔[6]

---

[1]عمرو بن حارث بن ابی ضرار،خزاعی،مصطلقی،ام المؤمنین سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی ہے،اِن سے احادیث مروی ہیں۔کوفہ میں مقیم رہے۔سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سسرتھے۔70ھ کووفات پائے۔(محمد بن احمد،ذہبی،تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام،ج2،ص688،دارالغرب اسلامی،2003م

[2] سنن ترمذی،ابواب الصلوۃ،باب ما جاء فیمن ام قوما وھم لہ کارھون،رقم359،دار احیاث التراث العربی،بیروت۔

[3]قال الالبانی:صحیح الاسناد،صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج1،ص359منظومۃ التحقیقات الحدیثیۃ،الاسکندریۃ۔

[4]النور31:24

[5]الممتحنۃ12:60

[666]صحیح بخاری،کتاب التفسیر،باب ولیضربن بخمرھن علی جیو بھن،رقم:4759

(ج) شوہر کی خدمت،امورخانہ داری کا اہتمام اور اولاد کی تربیت : پہلے ذکر کیا گیا کہ بیوی کا نان نفقہ شوہر کے ذمے ہے اسی طرح اسلام نے بیوی کی ذمہ داریوں یہ بھی شامل کیا ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ امور خانہ داری میں تعاون کرے گی۔ جس میں کھانا تیار کرنا،صفائی کرنا اور اولاد کی تربیت کرنا شامل ہیں۔ پہلے بھی یہ حدیث ذکرگزرچکی ہے کہ:

> "تم میں سے ہر فرد ایک طرح کا حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ پس بادشاہ حاکم ہی ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ ہر انسان اپنے گھر کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔[1]

اسی بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے:

> "اسماء[2]بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ زبیر رضی اللہ عنہ[3]نے مجھ سے شادی کی تو ان کے پاس ایک اونٹ اور ان کے گھوڑے کے سوا روئے زمین پر کوئی مال، کوئی غلام، کوئی چیز نہیں تھی۔ میں ہی ان کا گھوڑا چراتی، پانی پلاتی، ان کا ڈول سیتی اور آٹا گوندھتی۔ میں اچھی طرح روٹی نہیں پکا سکتی تھی۔ انصار کی کچھ لڑکیاں میری روٹی پکا جاتی تھیں۔ یہ بڑی سچی اور باوفا عورتیں تھیں۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی وہ زمین جو نبی علیہ السلامنے انہیں دی تھی، اس سے میں اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں گھر لایا کرتی تھی۔ یہ زمین میرے گھر سے دو میل دور تھی۔ ایک روز میں آ رہی تھی اور گٹھلیاں میرے سر پر تھیں کہ راستے میں نبی علیہ السلامسے ملاقات ہو گئی۔ نبی علیہ السلامکے ساتھ قبیلہ انصار کے کئی آدمی تھے۔ نبی علیہ السلامنے مجھے بلایا پھر)اپنے اونٹ کو بٹھانے کے لیے(کہا اخ اخ۔ نبی علیہ السلامچاہتے تھے کہ مجھے اپنی سواری پر اپنے پیچھے سوار کر لیں لیکن مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم آئی اور زبیر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ بڑے ہی باغیرت تھے۔ نبی علیہ السلامبھی سمجھ گئے کہ

---

[1]صحیح بخاری،کتاب ،باب العبد راع فی مال سیدہ ولایعل الا باذنہ،رقم2409

[2]اسماء بنت ابو بکر صدیقؓ القرشیہ ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بہن اور صحابیہ ہے۔سیدنا زبیر بن العوامؓ کی بیوی اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں ہیں۔ نبی□ سے استفادہ کیا اور صفیہ بنت شیبہؓ، فاطمہ بنت المنذرؓ اور ابو واقدی الیثیؒ نے آپؓ سے استفادہ کیاصاحبین صحاح ستہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے روایات لی ہیں۔ 73ھ/ 692ء میں مکہ میں وفات پائی۔(ابن عبدالبر ،الاستیعاب ، ج2،ص74۔ ابن الاثیر، اسد الغابہ، ج7،ص11۔ ابن حجر، الاصابہ، ج7،ص486

[3] آپ ابو عبداللہ زبیر بن عوام بن خویلدؓ ہیں۔آپؐ کے پھوپھی زاد ہیں۔جنگ بدر میں سیاہ عمامہ باندھ کر اس سے نقاب کیا ہوا تھا ۔آپؐ نے دیکھ کر فرمایا :آج کے دن آسمان کے فرشتے بھی زبیر کے مشابہ اترےہیں ۔36ھ/656ء میں وفات پائی۔ابن حجر، الاصابہ فی تمیز الصحابہ ،ج2،ص276۔ ابن الاثیر،اسد الغابہ،ج2،ص295۔

میں شرم محسوس کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ آگے بڑھ گئے۔ پھر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور ان سے واقعہ کا ذکر کیا کہ نبی علیہ السلامسے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ میرے سر پر گٹھلیاں تھیں اور نبی علیہ السلامکے ساتھ آپ کے چند صحابہ بھی تھے۔ نبی علیہ السلامنے اپنا اونٹ مجھے بٹھانے کے لیے بٹھایا لیکن مجھے اس سے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ اس پر زبیر نے کہا کہ اللہ کی قسم! مجھ کو تو اس سے بڑا رنج ہوا کہ تو گٹھلیاں لانے کے لیے نکلے اگر تو نبی علیہ السلامکے ساتھ سوار ہو جاتی تو اتنی غیرت کی بات نہ تھی)کیونکہ اسماء رضی اللہ عنہا آپ کی سالی اور بھاوج دونوں ہوتی تھیں(اس کے بعد میرے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام میرے پاس بھیج دیا وہ گھوڑے کا سب کام کرنے لگا اور میں بےفکر ہو گئی گویا والد ماجد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے)غلام بھیج کر(مجھ کو آزاد کر دیا"[1]

اس حدیث سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ بیوی پر شوہر کے تمام کام کرنا لازمی ہیں[2]۔ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:اس واقعہ سے استدلال پکڑتے ہوئےکہا گیا ہے کہ بیوی پرشوہر کے تمام کام کرنا لازمی ہے۔یہی قول امام ابوثور رحمہ اللہ[3] کا ہے۔لیکن اُن کے علاوہ علماء فرماتے ہیں کہ لازمی تو نہیں ہیں ،ہاں اگر اپنی خوشی سے کرتی ہے تواور بات ہے۔یہ واقعہ ایک ضرورت کےتحت پیش آیا تھا اس وجہ سے یہ حکم عام نہیں سمجھا جائے گا۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ جب انہوں نے اپنے والد محترم سے خادم مانگا تو اُن کے والد (نبی علیہ السلام)نے خادم سے بہتر (چیز)اللہ تعالی کے ذکر کے کلمات ارشادفرمائے۔ہر علاقوں میں بیوی کے ذمے کام کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔[4]

اور امام احمد بن محمد بن حنبل[5] رحمہ اللہ کی روایت ہے:ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں[6]:"۔میری پھوپھی کسی حاجت کے سلسلے میں نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔جب اُس کی حاجت پوری ہوئی تو نبی علیہ السلام نے اُن سے فرمایا:کیاتیرا شوہر ہے؟ انہوں نےکہا :جی ہے۔آپ ﷺ نے دریافت فرمایاتمہارا اُس کے ساتھ گزران کیسا ہے؟ میری پھوپھی نے کہا:میں حتی المقدوراُس کی

---

[1] بخاری،کتاب النکاح ،باب الغیرۃ،رقم:5224

[2] جو ابوثور رحمہ اللہ کا قول ہے۔

[3] ابراہیم بن خالد،کلبی،بغدادی،ابوثور ،الامام،الحافظ،الحجۃ،الفقیہ،عراق کے مفتی تھے۔170 ھ کو پیدا ہوئے۔سفیان بن عیینہ،ابن حُمید،ابو معاویہ۔وکیع،ابن علیہ،یزید بن ہارون،معاذ بن معاذ،روح بن عبادہ،ابی قطن،ابو عبداللہ شافعی،وغیرہ سے استفادہ کیا۔اُن کے شاگردوں میں ابو داؤد اور ابن ماجہ وغیرہ شامل ہیں۔مصنف کتب کثیرہ ہے۔ابن حبان رحمہ اللہ اُن کے بارے فرماتے تھے: كَانَ أَحَدَ أَئِمَّةِ الدُّنْيَا فِقْهاً وَعِلْماً وَوَرَعاً وَفَضْلاً۔صفر240ھ کو وفات پائے۔(سیر اعلام النبلاء12/73،27)

[4] فتح الباری،ج9ص324،دارالمعرفۃ،بیروت1379

[5] ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل آئمہ اربعہ میں سے ہیں ۔ آپنے دادا کے نسبت سے ابن حنبل مشہور ہوئے۔ آپ کے والد سرخس کے گورنر تھے۔ فن حدیث کے ماہر تھے۔ شیوخ میں امام ابو یوسف اور امام شافعی بہت مشہور ہیں۔احادیث میں مسند لکھی۔جو کہ چالیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔241ھ/855ء کو وفات پائی۔(الزرکلی،الاعلام ، ج1،ص203۔الذہبی، سیر اعلام النبلاء،ج21،ص212)۔

[6] یہ صحابی الحصین بن محصن رضی اللہ عنہ تھے۔ مسند احمد بن حنبل،ج6،ص425،رقم19025،مؤسسۃ قرطبہ،قاھرۃ

اطاعت اور خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی-آپ ﷺ نے فرمایا:اس کے (خدمت اور اطاعت کے) حوالے سے اپنی حالت کو دیکھو(کہ کیسا ہے؟) کیونکہ وہ تو تمھارا جنت اور دوزخ ہے-[1]،[2]

(د)شوہر کی جنسی تسکین پورا کرنا: جب کوئی شرعی مانع نہ ہو تو بیوی کو شوہر کے اس تسکین کا سامان ہونا چاہیئے تا کہ کہیں شوہر کسی حرام اور ناجائز راستے پر نہ چلے-اس بارے میں صاف حکم ہے کہ:

> "نبی علیہ السلامنے فرمایا ''اگر کسی مرد نے اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلایا، لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور مرد اس پر غصہ ہو کر سو گیا، تو صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں"[3]

اورجہاں تک بچوں کا تعلق ہے وہ بھی چونکہ کنبے کے افراد ہوتے ہیں لہٰذا اُن پر بھی کچھ فرائض عائد کئے جاتے ہیں-والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا خصوصاً اُن کے بڑھاپے اور قوٰی کے کمزور ہونے کے وقت قرآنی حکم ہے-یہی والدین تھے جو اِن اولاد کے بلوغت تک برابر قربانی دیتے ہوئے اِ ن کی ہر قسم خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتے-والدین نے اولاد کی تربیت کرتے ہوئے اپنی جوانی گنوادی ہوتی ہے-ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> "اور انسان کو ہم نےحکم دیا ہے کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو-اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا-اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھڑانا ڈھائی برس میں ہوتا ہے-یہاں تک کہ جب وہ پختہ عمر کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اےمیرے رب،مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پرکئے ہیں اُن کا شکرگذار بنوں اور یہ نیک عمل کرو جن کو توپسند کرے-اور میرے لئے میری اولاد کو نیک بنا دے -میں تیری طرف رجوع کرت ہوں اور میں فرمان برداروں میں ہوں"[4]

اور ارشاد ہے:

> "اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائی کھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اورآخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے میں نے تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے -اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے، کسی ایسی چیز کو، جس کا علم نہینتجھے کچھ بھی، تو ان کا کہا نہ مانناہاں دنیا

---

[1] مسند احمد بن حنبل،ج6،ص425،رقم19025،مؤسسۃ قرطبہ،قاھرۃ

[2] قال الالبانی:صحیح،صحیح الترغیب والترہیب،ج2،ص196

[33] بخاری،کتاب بدءالخلق، باب اذاقال احدکم آمین والملئکۃ فی السماء فوافقت احداھما الاخری غفر لہ ماتقدم من ذنبہ، رقم:3237-مسلم،کتاب النکاح ،باب تحریم امتناعہا من فراش زوجہا،رقم:3616

[4] الاحقاف15:46

کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دیں اور جو شخص
میری طرف رجوع لائے اس کے رستے پرچلناپھر تم کو میری
طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کر تے رہے ہو سب سے تم
کو آگاہ کر دوں گا"[1]

اسلام نے والدین کے حقوق اور بچوں کے فرائض بھی وضاحت سے بیان کئے ہیں۔چند اہم حقوق یہ ہیں۔

(الف)نفقہ: ضعیف اور کام کاج نہ کر سکنے والے والدین کا اپنی اولاد پر یہ حق ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اُن کے کھانے پینے،علاج معالجے اور دیگر بنیادی ضروریات کا خیال رکھیں۔روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن عمرو [2]سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی علیہ السلامکے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور والد بھی ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے تو نبی علیہ السلام نے فرمایا” :تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کا ہے)یعنی ان کی خبرگیری تجھ پر لازم ہے(تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"[3]،[4]

اس سے معلوم ہو ا کہ والدین کا نفقہ اولاد پر لازمی ہے یہ نہ تو کوئی احسان ہوتا ہے اور نہ ہی صدقہ۔

(ب)والدین سے نیکی کرنا اورحسنِ معاشرت رکھنا: دنیا میں نیکی اورحُسن معاشرت کا سب سے زیادہ حق دار والدین ہوتے ہیں۔حدیث پاک میں آتا ہے:

"ابوہریرہرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ ہے"[5]

---

[1] لقمان1415:31

[2] آپ ابو محمد عبداللہ بن عمرو بن العاص القرشیؓ ہیں۔ صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔نبی کریم ، عمر بن الخطابؓ اور معاذ بن جبلؓ آپ کے شیوخ جبکہ انس بن مالکؓ، ابراہیم بن محمدؒ اور اسعد بن سہلؒ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔67ھ/686ء کو وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج5،ص462۔ابن عبدالبر،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص292)۔

[3] سنن ابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم:3532

[4] قال الالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج8،ص30

[5] بخاری،کتاب الادب،باب من احق الناس بحسن الصحبۃ،رقم:5971،مسلم،کتاب البروالصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانهما احق بہ،رقم:6664

اسی طرح شیخین نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ عبداللہ بن مسعود[1] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے پوچھا: کون سا عمل سب سے افضل ہے؟نبی علیہ السلام فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا اور والدین کے ساتھ نیک معاملہ کرنا، پھر اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔[2]

والدین کی نافرمانی کو گناہ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔حدیث میں آتا ہے:

> "نبی علیہ السلام نے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ نبی علیہ السلاماس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی(سب سے بڑے گناہ ہیں)آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی۔ نبی علیہ السلاماسے مسلسل دہراتے رہے اور میں نے سوچا کہ نبی علیہ السلامخاموش نہیں ہوں گے "[3]

اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ[4]رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

> "نبی علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں(اور باپ)کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،(واجب حقوق کی)ادائیگی نہ کرنا اور (دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر)دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے"[5]

اور ارشاد ہے:

> "عبداللہ بن عمرو [6]رضی اللہ عنہما بیان کرتے تھے کہ ایک صحابی نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی۔نبی

---

[1]عبداللہ بن مسعودبن غافل بن حبیب،ہذلی،مکی،بدری ابو عبدالرحمٰن،رضی اللہ عنہ۔فقیہ الامۃ،الامام الحبر۔سابقون الاولون صحابہ کرام میں سے ہیں۔عالم،فاضل اور فقیہ صحابی تھے۔بدر میں شریک رہے۔اُن کے مناقب بے شمار ہیں ۔جلیل القدر صحابہ جیسے سیدنا ابوموسی اشعری،ابوہریرہ،ابن عباس،ابن عمر،عمران بن حصین،جابر،انس،ابوامامہ رضی اللہ عنہم اُن کے شاگرد رہے۔32ھ یا33ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائے(سیر اعلام النبلاء ج1،ص461)

[2] بخاری،کتاب التوحید،باب وسمی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصلاۃ عملا،وقال لاصلاۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب،رقم:7534،مسلم،کتاب الایمان،باب بیان کون الایمان باللہ تعالی افضل الاعمال،رقم:266

[3]بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدينمنالكبائر،رقم:5976،مسلم،کتابالإيمان،باببيانالكبائروأكبرها،رقم:269

[4]مغیرہ بن شعبہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ،ثقفی،20قبل ہجری کو طائف میں پیدا ہوئے۔جلیل القدر صحابی ہے۔5ھ کو اسلام لائے۔صلح حدیبیہ،جنگ یمامہ اور فتوحات شام میں شریک رہے۔یرموک کے معرکے میں ایک آنکھ ضائع ہوئی۔اُن سے 136احادیث مروی ہیں۔50ھ کو کوفہ میں وفات پائے۔الاصابہ452/3،الاعلام277/7

[5]بخاری،نفس مصدر،رقم:5975،مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل من غیر حاجۃ،رقم:4580

[6]۔آپ ابو محمد عبداللہ بن عمرو بن العاص القرشیؓ ہیں۔ صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔نبی کریم ، عمر بن الخطابؓ اور معاذ بن جبلؓ آپ کے شیوخ جبکہ انس بن مالکؓ، ابراہیم بن محمدؒ اور اسعد بن سہلؒ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔67ھ/686ء کو وفات پائی۔

اسد الغابہ،ج5،ص462۔ابن عبدالبر،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص292۔

علیہ السلام نے ان سے دریافت فرمایا "کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟"انہوں نے کہا کہ جی ہاں!نبی علیہ السلام نے فرمایا "پھر انہیں میں جہاد کرو۔)یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو"[1]

(د) والدین کو خوشی فراہم کرنا: اگر کسی بات پر والدین ناراض ہو جائیں چھین وآرام سے نہیں بیٹھنا چاہئیے۔چنانچہ والدین کی ناراضگی کی صورت میں ہجرت جیسے اہم کام کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ جیسا کہ سنن ابو داؤد [2]کی روایت ہے:

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ سے ہجرت پر بیعت کروں، اور میں نے اپنے ماں باپ کو روتے چھوڑا ہے، آپ نے فرمایا" :تم ان کے پاس واپس جاؤ اور انہیں جس طرح تم نے رلایا ہے اسی طرح ہنساؤ"[3]،[4]

الغرض ان تمام روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کنبے کی بقاء کے لیےمضبوط بنیادیں فراہم کی ہیں جس میں ہر فرد کواپنی اپنی حیثیت کے مطابق حقوق وفرائض سر انجام دینے ہوتے ہیں۔کوئی بھی معاشرہ اُس وقت تک ایک خوشحال اور مہذب معاشرہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں مذکورہ اصولوں کی روشنی میں باہمی تعاون،امن وامان اور حقوق وفرائض کی ادائیگی کا اہتمام نہ ہو۔

چھوٹے بچوں کے سماجی حقوق:

چھوٹے بچےکو عربی میں طفل کہا جاتا ہے۔
ابن منظور کے قول کے مطابق ہر حیوان کے نومولود اور چھوٹےبچے کو طفل کہا جا تا ہے-والطفل الصغیر من کل شيء[5]ا

والطِّفْلُ بالكسر : الصَّغيرُ من كلِّ شيءٍ أو الموْلودُ وولَدُ كلِّ وحْشِيَّةٍ[1] صبی کو اس کی پیدائش سے لے کر بلوغت تک"طفل"کہا جاتاہے۔ قرآن کریم میں اسی معنی کے لیے یہ لفظ استعمال ہواہے۔جیسا کہ ارشادہے۔"ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا"[2]پھر تمہیں بچہ کی صورت میں نکالتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

---

[1]بخاری،کتاب الجهاد والسیر،باب الجهاد باذن الابوین،رقم:3004،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب بر الوالدين وانهما احق به،رقم:6668

[2]ابوداود، سليمان بن اشعث سجستانی،دار الكتاب العربي ـ بيروت،بدون تاریخ

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الجهاد،باب فی الرجل یغزو وابواه کارهان:رقم:2530

[4]قال الالبانی:صحیح،صحيح وضعيف سنن ابی داود،ج6،ص28

[5]لسان العرب،ج11،ص401

یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع
نہیں"[3]

بچپن کا مرحلہ انسانی زندگی کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔علم ومعلومات کی ابتدا ،اس مرحلے سے شروع ہو جا تی ہے۔طعام وشراب کے ساتھ دوسرے امورِ زندگی کے ساتھ اُس کا واسطہ پڑتا ہے۔اس وقت میں وہ ہرطرح کی عادت اور خصلت اختیار کر سکتا ہے۔اور یہ سب وہ اپنے ماحول اور تربیت کرنے والوں کے سکھانے سے حاصل کرتا ہے کیونکہ اُس کا ذہن ایک صاف آئینے کی طر ح ہوتا ہے۔ہر اچھی اور بُری عادت کو قبول کرنے کی استعدادرکھتا ہے۔نہ صرف قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے بلکہ ہمیشہ کےلیے اُس کے ذہن میں نقش ہوتا ہے۔یہ مرحلہ زندگی کےبننے اور بنانے کا مرحلہ ہوتا ہے ۔اطوار،عادات اور اخلاق کے بننے یا بگاڑنے کا یہ مرحلہ آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے خصوصی طور پراس مرحلے پر بچوں کے ساتھ انتہائی احتیاط سے برتاؤ رکھنے کا حکم دیا ہے۔اور اِ س دورکی خصوصیات،ضروریات،خطرات اور ابتداوانتہا کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اُ ن کے حقوق کا ایک ایسا جامع پروگرام دنیا کو دیا ہے کہ آج تک دنیا کے کسی مذہب اور قانون نے اُنہیں نہیں دیا۔ذیل میں چند ایسے ہی حقوق کاذکر کیاجاتا ہے۔

(الف)میراث کا حق:اسلام سے پہلے کےمعاشرے میں بچوں کومیراث کا حق دار نہیں سمجھا جا تا بلکہ عربوں میں تو یہ رواج تھا کہ بچوں میں جو اسلحہ استعمال کرنے اور قبیلے کے دفاع میں لڑ سکنے والے ہوتے تھے صرف وہ میراث کے حق دار ہوا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس قانون کے تحت لڑکیاں ہمیشہ کے لیے محروم رہتی تھیں۔[4]جب قرآن نازل ہو ا تو صاف صاف حکم دے گیا کہ ورثا میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئیے بلکہ ہر وارث میّت کی میراث میں اپنا مخصوص حصہ رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

تمہاری اولاد کے بارے میںاللہ تعالیٰ تمہیں حکم کرتا ہے کہ
ایک لڑکے کاحصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے"[5]

بلکہ اس بارے میں تو یہاں تک ارشا د ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور صرف رو کر ، چیخ مار کریا اُسے چھینک آجائے تو بھی وہ میراث کا حق دار ہوتا ہے۔سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"جابر بن عبداللہ اور مسور بن مخرمہ [6]رضی اللہ عنہما فرماتے
ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا :(ولادت کے وقت)بچہ وارث
نہیں ہو گا جب تک کہ وہ زور سے استہلال نہ کرے‘‘۔ راوی

---

[1]القاموس المحیط،ج1،ص1325

[2]غافر67:40

[3]النور31:24

[4]محمد بن احمد،القرطبی،الجامع لاحکام القرآن،ج5ص46دار الکتب المصریۃ،قاھرہ،1384ھ

[5]النساء11:4

[6]مسور بن مخرمہ بن نوفل بن وہیبؓ بن عبد مناف القرشی ہیں۔صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔صحاح ستہ کے راوی ہیں۔شیوخ میں عبداللہ بن عباسؓ،عثمان بن عفانؓ اور عمر بن الخطابؓ جبکہ تلامذہ میں سعید بن المسیبؒ،عروہ بن زبیرؒ اور عبداللہ بن حنینؒ شامل ہیں۔64ھ/683ء کو مکہ میں وفات پائی۔
اسد الغابہ،ج7،ص223۔ابن حجر،الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج10،ص95۔الاستیعاب فی معرفۃ الصحاب،ج3،ص1399۔

کہتے ہیں. بچے کے استہلال کا مطلب یہ ہے کہ وہ روئے یا
چیخے یا چھینکے"[1]،[2]

(ب)بچوں کااہلِ خانہ پر حقوق:

1 ۔حق نسب:اسلام نے بچے کی کسی غیر کی طرف نسبت کرنا حرام قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے عربوں میں مروّج قانون"متبنّٰی" کا خاتمہ بھی اس وجہ سے کیا گیا کہ اس میں بچے کی نسبت اس کے والدین کے بجائے کسی دوسرے کی طرف کیا جاتا تھا۔ارشاد ہوا:

"لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے ۔ پھر اگر تمہیں ان کے (حقیقی) باپوں کا علم ہی نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں ، تم سے بھول چوک میں جو کچھ ہو جائے اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ، البتہ گناہ وہ ہے جس کا تم ارادہ دل سے کرو ۔ اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والامہربان ہے"[3]

اسی وجہ سے اسلام میں زنا کی حرمت کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس میں بچے کا نسب ضائع ہو جاتا ہے۔نسب کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے۔ تاکہ بچہ مجہول النسب نہ رہے۔:

خبردار زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیوں کہ وہ بڑی بےحیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے"[4]

اسلام میں طلاق یافتہ اوربیوہ کے لیے عدت کا حکم بھی اسی حکمت کے تحت دے دیا گیا ہے۔تاکہ بچے کا نسب محفوظ رہے۔چنانچہ طلاق یافتہ عورت کو اس بات کا پابند بنایا گیا۔کہ وہ تین ماہواری تک کسی دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔اللہ تعالی فرماتا ہے:

" طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں ، انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہو اسے چھپائیں ، اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو ، ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حقدار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو ۔ اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ ۔ ہاں مردوں کو عورتوں پر فضلیت ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والاہے"[5]

اور بیوہ کے لیے عدت چار ماہ اور دس دن ہے جیسا کہ اللہ تعالی کاارشاد ہے:

" اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے بارے میں تاکیدی حکم کرجائیں کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ ہاں

---

[1] محمد بن یزید،ابن ماجۃ،سنن ابن ماجۃ،کتاب الفرائض،باب اذااستهل المولود ورث،رقم"2751،مکتبہ ابو المعاطی۔سن نامعلوم

[2]قال الالبانی :صحیح،صحیح ابن ماجہ۔ج2،ص120

[3]الاحزاب5:33

[4]الاسراء32:17

[5]البقرۃ228:2

اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کرلیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اور اللہ زبردست حکمت والا ہے"[1]

2۔دودھ پلانے کا حق: ہر بچے کا والدین پر یہ حق بنتا ہے کہ دو، ڈھائی سال تک اُسے دودھ پلائے۔ماں پر دودھ پلانے اور باپ پرکھانے،پینے اور کپڑے کاحق ہے۔اسی طرح بچے کے ماں کے لیے خوراک فراہم کرنا بھی والد کے ذمّے ہے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

"اور بچوں کو اُن کی مائیں مکمل دو سال تک دودھ پلائیں یہ (حکم) اس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔ اور دودھ پلانے والی ماؤں کا خوراک ولباس دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہوگا۔ کسی بھی انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ کسی چیز کامکلف نہیں بنایا جاتا (توخبردار) نہ تو ماں کو (پرورش کے سلسلے میں) بچے کے وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے ۔اور اسی طرح (خرچ خوراک) ذمے ہے ،بچے کے وارث کے ۔ اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ)باہمی صلاح و مشورے سے بچے کو دودھ سے چھڑانا چاہیں تووالدین پر کچھ حرج نہیں۔ اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کچھ حرج نہیں ۔(لیکن یہ)اس شرط پر کہ تم دودھ پلانے والیوں کورواج کے مطابق ان کا حق جو تم نے دینا کیا تھا دے دو اور اللہ سے ڈرتے رہواوریہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے"[2]

(ج)پیدائش سے پہلے بچوں کی نگہداشت: بچہ جب ابھی پیدا نہیں ہو اہو اُس وقت بھی اسلام اُس کے لیے آسانیاں تلاش کرتا ہے تاکہ پیدائش کے بعد اُس کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔اس سلسلے میں سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃوالسلام میں واضح ارشادات موجودہیں ۔بچے کی صحیح نگہداشت کے لیے لازمی ہے کہ بچے کی ماں اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو تاکہ وہ بچے کے لیے ایک صالح ماں بن کر اس کی تربیت احسن طریقے سے سر انجام دیں۔اس کے عادات واطوار اوررہن سہن کا خاص خیال رکھنے والی ہو کیونکہ ایسی ہی عورت کے بارے حدیث میں آتا ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں)یعنی عرب کی عورتوں میں(قریش کی صالح، نیک عورتیں ہیں جوبچے پر بچپن میں سب سے زیادہ مہربان اور اپنے شوہر کے مال کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں"[3]

اس حدیث میں کسی عورت سے نکاح کا معیار بتلایا گیا ہے کہ ایسی عورت ایک اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہے جو اولاد کے بارے میں صحیح احساسات رکھنے والی ہو اُن کا خیال کرنے

---

[1] البقرہ234:2

[22] البقرۃ233:2

[3] صحیح بخاری،کتاب النفقات،بابحفظ المرأة زوجها في ذات يده والنفقة،رقم:5365

والی ہو۔پہلے یہ عرض کیا گیا ہے کہ دین داری،محبت کرنے والی،اور "الولود" جیسے صفات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔اس حدیث میں اُ ن عورتوں کی اچھائی اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ قریشی ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اولاد اور شوہروں کے خیال رکھنے والے ہیں۔ اسی طرف علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے:"اس سے مرادقریش کی تمام عورتوں کا اچھا ہونا مراد نہیں ہے بلکہ وہ عورتیں مراد ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ حسن سلوک(اور اِس جیسے دوسرے اچھا رویہ) رکھنی والی ہو[1]۔

لڑکی والوں کو بھی اچھے اور نیک لڑکے کاا نتخاب کرنا چاہیے: دوسری طرف سیرتِ طیبہ میں لڑکی کے خاندان والوں کے لیے بھی ہدایات ہیں کہ وہ اپنی لڑکی کے لیے کسی دین دار اور اچھے لڑکے کا انتخاب کریں اور کافی چھان بین کرکے رشتہ کریں تاکہ وہ لڑکی اور اس کے بچوں کے لیے ایک مثالی شوہر اور نیک باپ ثابت ہو۔ اس لیے لڑکی کے خاندان والوں کے لیے یہ ہدایات ہیں کہ جب اُنہیں کوئی نیک لڑکا میسّر آئے لڑکی کے رشتے دینے میں کوئی لیت ولعل سے کام نہ لے بلکہ اُ س کے مانگے بغیر خود اُسے آفر کردینا چاہئیے جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔صحیح بخاری کی روایت ہے کہ:

> "سیدناعبداللہ بن عمر[2] سے سیدناعمر بن خطاب[3] رضی اللہ عنہم کے متعلق سنا کہ جب(ان کی صاحبزادی)حفصہ[4] بنت عمر رضی اللہ عنہا(اپنے شوہر)خنیس بن حذافہ سہمی[5] کی وفات کی وجہ سے بیوہ ہو گئیں اور خنیس نبی علیہ السلامکے صحابی تھے اور ان کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ[6] کے پاس آیا اور ان کے لیے حفصہ رضی اللہ

---

[1] فتح الباری،ج9،ص125

[2] عبداللہ بن عمررضی اللہ عنہماابن خطاب،عدوی،ابو عبدالرحمٰن۔جلیل القدر صحابی ہیں۔10قبل ہجری کو مکہ معظمہ میں پیداہوئیں۔اسلام ہی میں آنکھیں کھولیں۔اپنے والد محترم کی معیت میں ہجرت فرمائی۔تمام غزوات میں شریک رہے۔اُن کی مرویات کی تعداد2630 ہیں۔آپ 73ھ کومکہ مکرمہ میں وفات پانے والے آخری صحابی ہے۔(سیراعلام النبلاء203/3،الاعلام108/4)

[3] عمرفاروق رضی اللہ عنہ بن خطاب،قرشی،عدوی،ابوحفص۔40 قبل ہجرت کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔دوسرے خلیفہ راشد ہیں۔"امیر المؤمنین"کانام سب سے پہلے اِن کے لیے استعمال کیاگیا۔انتہائی بہادر،جری اور شجاع تھے۔13ھ ک وخلیفہ مقرر ہوئے۔اُن کی عدالت مشہور تھی۔سن ہجری کی ابتداء آپ کے دور سے ہوئی۔23ھ کو شہید کردئے گئے۔نماز جنازہ سیدنا صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ نے پڑھایا۔(صفۃ الصفوۃ1-2/118،تہذیب الکمال317/21،الاعلام45/5)

[4] حفصۃ بنت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما۔18قبل ہجری کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔جلیلۃ القدر صحابیہ اور ام المؤمنین ہیں۔پہلے سیدنا خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔دونوں نے اکٹھے ہجرت فرمائی۔آپ رضی اللہ عنہ کے وفات کے بعد2یا3ھ کونبی علیہ السلام کے نکاح میں آئیں۔آپ علیہ السلام کے وفات کے بعد مدینہ منورہ میں رہیں ؛45ھ کو وفات پائیں۔(الاعلام264/2)

[5] خنیس بن حذافہ بن قیس بن عدی،سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر تھے۔اولین مہاجرین میں سے تھے۔بدر میں شریک رہے۔احد کے لڑائی میں زخم کھاکر مدیہ منورہ میں شہید ہوئیں۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب452/2)

[6] عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہؓ ہیں۔تیسرے خلیفہ ہیں ۔صحابی رسول ﷺ اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔مکہ میں 577 ءمیں پیدا ہوئے۔بعثت کے کچھ عرصہ بعد ایمان لائے۔ دور جاہلیت میں بھی شریف اور انتہائی مالدار شخصیت تھے۔ اسلام کے دور میں بھی مالدار اور بہت زیادہ سخی تھے۔ آپ کے دور خلافت میں کرمان،قوقاز،خراسان اور آفریقہ کے دیگر ممالک فتح ہوئے۔ آپ جامع القرآن کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔35ھ/656ء کو وفات پائی۔(اسدالغابہ،ج3،ص606۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج4،ص456۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص319)۔

عنہا کو پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس معاملہ میں غور کروں گا۔ میں نے کچھ دنوں تک انتظار کیا۔ پھر مجھ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ [1]نے ملاقات کی اور میں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں حفصہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ سے کر دوں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے اور مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی اس بےرخی سے مجھے عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملہ سے بھی زیادہ رنج ہوا۔ کچھ دنوں تک میں خاموش رہا۔ پھر نبی علیہ السلام نے خود حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا پیغام بھیجا اور میں نے نبی علیہ السلامسے اس کی شادی کر دی۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ میرے سامنے پیش کیا تھا تو میرے خاموش رہنے سے تمہیں تکلیف ہوئی ہو گی کہ میں نے تمہیں اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے کہا کہ واقعی ہوئی تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم نے جو کچھ میرے سامنے رکھا تھا، اس کا جواب میں نے صرف اس وجہ سے نہیں دیا تھا کہ میرے علم میں تھا کہ نبی علیہ السلامنے خود حفصہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیا ہے اور میں نبی علیہ السلامکے راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اگر نبی علیہ السلامچھوڑ دیتے تو میں حفصہ کو اپنے نکاح میں لے لیتا"[2]

ا س سے معلوم ہو اکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی کے بارے میں فکر مند تھے کہ اُ س کا نکاح کسی اچھے اور نیک انسان سے ہو ۔
ہمارے رسم ورواج کے مقابلے میں اسلام کی تعلیمات یہی تھیں کہ جب آپ کو اچھا رشتہ مل جائے تو اس میں شرم وحیاء سے کام نہیں لینا چاہئیے بلکہ دین داری کو دیکھ کر خود پہل کرنا چاہئیے۔علامہ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی مضمون ذکر کیا ہے کہ۔"اس حدیث میں انسان کا اپنی بیٹی یا اُس کے زیر کفالت کسی دوسرے انسان کی بیٹی کااُس شخص پر (نکاح کے لیے)پیش کرنا ہے جو کہ نیک وصالح ہوکیونکہ اس میں پیش کرنے والے انسان کا بھی فائدہ ہے اور اس بارے میں شرم وحیا نہیں کرنی چاہئیے[3]۔

اس کے(یعنی دین داری کو دیکھتے ہوئے لڑکے اور لڑکی کی انتخاب کے)بعداولادہی کی تربیت اور نجابت کے خاطر سیرت طیبہ نے میاں بیوی کو شادی کے بعد کی زندگی کے لیے زریں اصول فراہم کئے ہیں۔میاں بیوی کے ملاپ کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوتا ہے اسی ملاپ(جماع) کے مرحلے بھی اسلام ہدایات دیتا ہے کیونکہ آداب کے تحت جب یہ عمل کیا جائے تو اس کے اثرات مستقبل میں بچے کی زندگی پر ظاہر ہوتے ہیں۔چند آداب یہ ہیں۔

---

[1]عبداللہ بن عثمان بن عامر،ابوبکر،الصدیق،القرشی۔51ق کو مکہ میں پیدا ہوئے۔سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔خلیفہ اول ہے۔11ھ کو خلیفہ منتخب ہوئے۔مدت خلافت 2سال 3ماہ اور15 دن ہے۔جاہلیت میں بھی بت پرستی کی اور نہ ہی شراب کو منہ لگایا۔آپ کے والدین،اولاد اوراہلیہ تمام صحابہ ہیں۔13ھ کو مدینہ منور میں انتقال کر گئے۔ (اسدالغابہ،ج2،ص138۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج4،ص169۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج3،ص963)۔

[2]صحیح بخاری،کتاب النکاح،باب عرض الانسان ابنتہ او اختہ علی اهل الخیر،رقم:5122

[3]فتح الباری ج9،ص178

(1): شوہر کے طلب پر بیوی انکار نہ کرے: صحیحین کی روایت ہے کہ:
نبی علیہ السلامنے فرمایا ''اگر کسی مرد نے اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلایا، لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور مرد اس پر غصہ ہو کر سو گیا، تو صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔''[1]

حدیث میں آتا ہے کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے کہ اُ س کے مستقبل کے بارے میں سب کچھ لکھا جاتا ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعودرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم سےنبی علیہ السلا م نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری پیدائش کی تیاری تمہاری ماں کے پیٹ میں چالیس دنوں تک)نطفہ کی صورت(میں کی جاتی ہے اتنے ہی دنوں تک پھر ایک بستہ خون کی صورت میں اختیار کئے رہتا ہے اور پھر وہ اتنے ہی دنوں تک ایک مضغہ گوشت رہتا ہے۔ اس کے بعد اللہ پاک ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اسے چار باتوں)کے لکھنے(کا حکم دیتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس کے عمل، اس کا رزق، اس کی مدت زندگی اور نیک وبد ہونے کو لکھ لے۔ اب اس نطفہ میں روح ڈالی جاتی ہے)یاد رکھ(ایک شخص)زندگی بھر نیک(عمل کرتا رہتا ہے اور جب جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر سامنے آ جاتی ہے اوروہ دوزخ والوں کے عمل شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص)زندگی بھر برے(کام کرتا رہتا ہے اور جب دوزخ اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر غالب آ جاتی ہے اوروہ جنت والوں کے کام شروع کر دیتا ہے"[2]

(2)بیوی سے نرمی اورہنسی مزاح: مباشرت کے لیے سازگا ر ماحول اور دونوں طرف سے آمادگی حمل اور بچے کے ولادت اور صحت پربھی اثر انداز ہوتاہے۔اور میاں بیوی کی تسکین کا سامان بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

"جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نےبیان کیا کہ ہم نبی علیہ السلامکے ساتھ ایک غزوہ(غزوہ تبوک)میں شریک تھے۔ واپس ہوتے ہوئے جب ہم مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو میں اپنے سست رفتار اونٹ کو تیز چلانے لگا۔ ایک صاحب نے پیچھے سے میرے قریب پہنچ کر میرے اونٹ کو ایک چھڑی سے (جو ان کے پاس تھی) مارا۔ اس سے اونٹ بڑی اچھی چال چلنے لگا، جیسا کہ تم نے اچھے اونٹوں کو چلتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نبی علیہ السلامتھے۔ میں نے

---

[1] بخاری،کتاب بدءالخلق، بابباب اذاقال احدکم آمین والملئکۃ فی السماء فوافقت احداھما الاخری غفر لہ ماتقدم من ذنبہ،رقم:3237۔مسلم،کتاب النکاح ،باب تحریم امتناعہا من فراش زوجہا،رقم:3616

[2] صحیح بخاری،کتاب بدء الخلق،باب ذکر الملئکۃ۔رقم:3208

عرض کیا: یا رسول اللہ! میری نئی شادی ہوئی ہے۔ نبی علیہ السلامنے اس پر پوچھا، کیا تم نے شادی کر لی؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ دریافت فرمایا، کنواری سے کی ہے یا بیوہ سے؟ بیان کیا کہ میں نے عرض کیا کہ بیوہ سے کی ہے۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ کنواری سے کیوں نہ کی؟ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی۔ بیان کیا کہ پھر جب ہم مدینہ پہنچے تو شہر میں داخل ہونے لگے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھہر جاؤ رات ہو جائے پھر داخل ہونا تاکہ پراگندہ بال عورت کنگھا کر لے اور جس کا شوہر موجود نہ رہا ہو وہ موئے زیر ناف صاف کر لے"[1]

"هَلاَّ جَارِيَةً تُلاَعِبُهَا وَتُلاَعِبُكَ"میں یہ ترغیب دینا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان فاصلے نہیں ہونے چاہئیے بلکہ ایک دوسرے سے شرعی حدود میں رہتے ہوئے خوب ہنسی مذاق اور دل لگی کرنی چاہئیے۔ دوسری روایت میں"تضاحکھا وتضاحکک"کے الفاظ آئے ہیں۔

امام طبرانی رحمہ اللہ [2]نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں" "فَهَلا بِكْرًا تَعَضُّهَا وَتَعَضُّكَ[3]". "کے الفاظ آئے ہیں۔یہ چبانے کے معنی پر آتے ہے۔اور ایک روایت میں تو"تذاعبھا وتذاعبک" کے الفاظ ہے۔اسی طرح "لِعاب(مصدر من الملاعبۃ) اورلُعاب(رال)"کے الفاظ بھی آئے ہیں۔اس میں اشارہ ہے کہ ایک دوسرے کے زبان اور ہونٹ سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔جو کہ ملاعبت اور تقبیل ہی میں ممکن ہوتا ہے۔[4]

(3) ہمبستری سے پہلے شیطان سے پناہ مانگنا: نفس وشیطان دونوں انسان کے ازلی دشمن ہے۔"جماع: صرف جنسی خواہش کی تکمیل کا نام نہیں ہے بلکہ والدین کے مدنظر یہ بھی ہونا چاہئیے کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالی ہمیں نیک اور صالح اولاد عطاء فرمائیں گے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ جماع سے پہلے شیطان سے اللہ کی پناہ مانگی جائے تاکہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد وہ شیطان کے شرسے محفوظ رہے؛حدیث میں آتا ہے کہ:

"ابن عباس رضی اللہ عنہما [5]نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس آنے کا ارادہ کرے تو یہ دعا پڑھے:"اللہ کے نام سے، اے اللہ! ہمیں شیطان

---

[1] بخاری،کتاب النکاح باب تزویج الثیبات،رقم:5079،باب تستحد المغیبۃوتمتشط الشعثۃ،رقم:5247،باب طلب الولد،رقم:5245

[2] سلیمان بن احمد،اللخمی الشامی،الطبرانی،ابوالقاسم ؒ260ھ کو فلسطین میں پیدا ہوئے۔مشہور محدث ہے۔علم کے حصول میں تیس سال تک بہت زیادہ اسفار کیے۔امام بغوی،نسائی ابن مردویہ وغیرہ کے شاگرد رہے۔مصنف کتبِ کثیرہ ہیں۔ جن میں معجم کبیر،معجم صغیر،مسند سفیان،مسند شامیین اور تفسیر کبیر معجم شامل ہیں ۔100سال کی عمر میں 360ھ کوایران کے شہر اصفہان میں وفات پاگئے۔الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ (Global Arabic Encyclopedia) http://www.mawsoah.net)

[3] سلیمان بن احمد،المعجم الکبیر،ج14،ص21،داراحیاء التراث العربی،بیروت،داراحیاء التراث العربی،بیروت،1404ھ

[4] فتح الباری،ج9،ص122

[5] آپ عبداللہ بن عباس ؓبن عبدالمطلب ہیں ۔ نبی کے چچا زاد بھائی اور صحابی ہیں ۔ہجرت سے تین سال پہلے 619 کو مکہ میں پیدا ہوئے ۔ ترجمان القرآن کے لقب سے نوازے گئے ہیں ۔ طائف میں 28ھ/687ء میں وفات پائی۔(ابن الاثیر،ابوالحسن علی بن محمد،اسد الغابہ،تحقیق:عادل احمد الرفاعی،دار احیاء التراث العربی، بیروت 1417ھ/1996ءج3،ص295۔ قرطبی،ابن عبدالبر ،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ، دار احیاء التراث العربی ، بیروت ،1328ھ،ج1،ص284)۔

سے دور رکھ اور جو کچھ تو ہمیں عطا فرمائے اسے بھی شیطان سے دور رکھ‘‘تو اگر اس صحبت سے کوئی اولاد مقدر میں ہو گی تو شیطان اسے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا"[1]

(د)قتل اولاد کی ممانعت: مختلف اسباب سے بچوں کا قتل ،پہلے زمانے کی قوموں میں مختلف شکلوں میں موجود رہا ہے۔ مثلاً کمزور اور مریض بچوں سے گلو خلاصی بھی ریکارڈ کی گئی ہے[2]۔

اور عربوں کے ہاں تو قتل اولاد بلکہ اولاد کو زندہ درگور کرنا دنیا کی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔لڑکیوں کو زندہ دفناتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک لڑکی کا پیدا ہونا باعث شرم ہوتا تھا۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہے:"عرب میں دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا[3] جو اپنے بچوں کو (چاہے لڑکا ہو یا لڑکی) قتل کرتے تھے ،یا تو اس وجہ سے کہ اُن پر خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا تھا یعنی بخل کرتے تھےاور یا اُن کے پاس بچوں پر خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا[4]۔

قُرآن حکیم نے اُن کے اس برے کام کی مذمت کرکے قیامت کے دن سخت عذاب کے معاملے کاذکر فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے:

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ (کیونکہ)رزق تم اور اُن(دونوں) کو ہم ہی دیتے ہیں ۔بے شک ان کا قتل کرنا بڑا سخت گناہ ہے"[5]

اور ارشاد ہے:"اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں "[6]

قتل اولاد کی مذمت اوراسے قابل مؤاخذہ شمار کرتے ہوئے اللہ تعالی کا فرمان ہے"وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ[7]"اور جب لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پوچھا جائے گا۔

قُرآ ن نے قتلِ اولاد کے فعلِ شنیع کو انتہائی درجے کی بے وقوفی بتلایا ہے،ارشاد ہے:

" بے وقوفی کے سبب جنہوں نے اپنی اولاد کو بے سمجھی سے مارڈالال اور اللہ پر جھوٹ باندھ کر اس کی عطا کی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرایا وہ گھاٹے میں پڑ گئے وہ بےشبہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں"[8]

بچے کی ولادت کے فوراَ بعد کچھ آداب ہیں جن کی رعایت رکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاَ

....اچھا اور بامعنی نام رکھنا: اسلام والدین کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ بچے کی پیدائش پر اُس کا نام ایسا رکھ دیا جائےجواسلامی تعلیمات کی روشنی میں بامعنی ہو اور اللہ تعالی کو

---

[1]صحیح بخاری،کتاب النکاح،بابما یقول الرجل إذَا أتی أهلهُ،رقم:5165

[2]اضواء علی الرعایۃ الاجتماعیۃ،ص278

[3]ظاہر ہے کہ پہلا گروپ اُن لوگوں کا تھا جوصرف لڑکیوں کو قتل کرتے تھے۔

[4]فتح الباری،ج10ص406

[5]الانعام151:6

[6]الاسراء31:17

[7]التکویر8:81

[8]الانعام140:6

بھی پسند ہو۔نبی علیہ السلام اس بات کی بہت احتیاط فرماتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سارے صحابہ کے نام تبدیل فرمائے تھے۔حرب،حزن اور عبدالعزّی جیسے ناموں کی تبدیلی اسی وجہ سے فرمائی تھی۔ اچھے ناموں کے رکھنے کے بارے میں احادیث میں واضح طور پر احکام آئے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا۔بے شک اللہ کے نزدیک پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں"[1]

دوسری روایت میں نام بدلنے کا ذکر ہے:

"سہل رضی اللہ عنہ [2]نے بیان کیا کہ منذر بن ابی اسید رضی اللہ عنہ[3] کی ولادت ہوئی تو انہیں انہیں نبی علیہ السلامکے پاس لایا گیا۔ نبی علیہ السلامنے بچہ کو اپنی ران پر رکھ لیا۔ ابواسید رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نبی علیہ السلام اپنے سامنے کسی چیز میں مصروف ہو گئے(اور بچہ کی طرف توجہ ہٹ گئی)۔ ابواسید رضی اللہ عنہ [4]نے نبی علیہ السلامکی ران سے سے بچے کے اٹھائے جانے کا حکم دیا ۔ پھر جب نبی علیہ السلاممتوجہ ہوئے تو فرمایا کہ بچہ کہاں ہے؟ ابواسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے اسے گھر بھیج دیا۔ نبی علیہ السلامنے پوچھا: اس کا نام کیا ہے؟ عرض کیا کہ فلاں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا، بلکہ اس کا نام منذر ہے۔ چنانچہ اسی دن نبی علیہ السلامنے ان کا یہی نام منذر رکھا"[5]

....عقیقہ اور صدقہ کرنا: بچے کی پیدائش ایک عظیم نعمت ہے چنانچہ خوشی کے اس موقعے پر سیرتِ طیبہ کی روشنی میں دعوت کا اہتمام کرنا بھی بچے کا حق اور اسلامی طریقہ ہے اس وجہ سے نبی علیہ السلام نے لڑکی کی پیدائش پر ایک اور لڑکے کے پیدائش پر دو بکریاں ذبح کرنے کو پسندیدہ قراردیا ہے۔ تاکہ دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کیا جا سکے۔سیرت طیبہ کے اس پاکیزہ طریقے سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک تو لوگوں کی دعوت ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اس مسنون عمل کی برکت سے بچے سے مستقبل میں آنے والی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا ارشاد ہے؛.

"سلمان بن عامر الضبی[6] رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، کہا کہ میں نے نبی علیہ السلامسے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑکے کے ساتھ اس کا عقیقہ لگا ہوا ہے اس لیے اس کی طرف سے جانور ذبح کرو اور اس سے بال دور کرو)سر منڈا دو یا ختنہ کرو[7]۔

---

[1]صحیح مسلم،کتاب الآداب،باب النہی عن التکنی بابی القاسم۔رقم:5709

[2]سہل بن حنیف ابوثابت الانصاری الاوسی ہے۔ ابو امامہ بن سہل کے والد جبکہ عثمان بن حنیف کے بھائی ہے ۔آپ بدر میں شریک ہوئے،آپ سے آپ کے بیٹے ابو امامہ اور عبداللہ نے روایت کی ہیں۔آپ کوفہ میں وفات ہوئے اور آپ پر حضرت علی ؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ سیرأعلامالنبلاء،ج2 ،ص 325۔الطبقاتالکبری،ج6 ،ص 93۔

[3]منذربن ابواسید مالک بن ربیعہ بن عمروبن عوف،خزرجی، ساعدی،رضی اللہ عنہ،رسول اللہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ نے اپنے ران مبارک پر بھٹا کر منذر نام رکھا۔صحیح قول کے مطابق منذر بن ابو اسید تابعی ہے۔(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج4،ص1448،تاریخ کبیر للبخاری،ج7،ص356)

[4]مالک بن ربیعہ بن عمروبن عوف الخزرجی،الساعدی۔ابواسید رضی اللہ عنہ۔فتح مکہ کے موقع پر بنو ساعدہ کا جھنڈا آپ رضیاللہ عنہ کے ہاتھ میں تھابدری صحابی ہے۔آخر وقت میں نابینا ہو گئے تھے۔اُن سے 28احادیث مروی ہیں۔وفات کے اعتبار سے آخری بدری صحابی ہے۔60ھ کو وفات پائے۔

[5]بخاری،کتاب الادب،باب تحویل الاسم الی اسم احسن منہ،رقم:6191،مسلم،کتاب الاداب باب استحباب تحنیک المولود،رقم:5745

[6]سلمان بن عامر بن اوس بن حجر،الضبی رضی اللہ عنہ۔بنو ضب میں آپ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی راوی صحابی نہیں ہے۔بصرہ میں جامع مسجد کے قریب رہائش پذیر تھے۔الاستیعاب633/2

[7]بخاری،کتاب العقیقۃ،باب اماطۃ الاذی عن الصبی فی العقیقۃ،رقم:5472

....تحنیک کرنا:بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی نیک،دین دار اور صالح انسان سے کھانے کی کوئی چیز چبواکر بچے کودیا جاتا ہے۔چبوانے کا یہ عمل "تحنیک"کہلاتا ہے۔اور یہ عمل نبی علیہ السلام سے بھی ثابت ہے:"سیدنا انس بن مالک رضی اللہ سے روایت ہے میں عبداللہ بن ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو جب وہ پیدا ہوئے ، نبی علیہ السلام کے پاس لے گیا۔نبی علیہ السلام اُس وقت ایک کملی اوڑھے تھے اور اپنے اونٹ پر روغن مل رہے تھے۔ ۔آپ نے پوچھا کیا تمہارے پاس کھجور ہے؟میں نے کہا جی ہے۔ پھرمیں نے چند کھجوریں نبی علیہ السلام کو دیں آپ نے اُن کو منہ میں ڈال کر چبایا۔بعد میں اُس بچے کا منہ کھولا اور اُس کے منہ میں ڈال دیا۔بچہ اُس کو چوسنے لگا آپ نے فرمایا،انصار کو کھجور سے محبت ہے اور اُس کانام عبداللہ رکھ دیا[1]۔

....نفقہ دینا باعث ثواب ہے: نفقہ کی اہمیت اور فضیلت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے:

"سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:تمہارا اللہ کے راستے میں دینار خرچ کرنا،غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کرنا،غریب پر خرچ کرنا اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا،ان میں سب سے زیادہ اجرو ثواب والا وہ ہے جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا"[2]

اولاد کا اپنے باپ اور بیوی کا اپنے شوہر کے مال سے بغیر اُ س کی اجازت کا استعمال بھی جائز ہے:

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہند رضی اللہ عنہا کاواقعہ ذکر کرتی ہے کہ اُس نے نبی علیہ السلام کو کہا کہ:یقیناََ(میراشوہر)ابو سفیان بخیل آدمی ہے،کیا میں اُس کے مال سے اُس کی اجازت کے بغیر کچھ لے سکتی ہو؟آپ نے فرمایا:اپنی ضرورت کے مطابق لے سکتی ہو"[3]

پیدائش کے بعدبچپن کی زندگی میں چندمراحل ایسےآتے ہیں جن کا بچے کے مستقبل پر دور رس اثرات ہوتے ہیں۔

پہلا مرحلہ: پہلا مرحلہ بچپن کا ہوتا ہے جو کہ تقریباََ سات سال تک کا ہوتا ہے۔یہ کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے بچہ بہت زیادہ پیار چاہتا ہے اسی مرحلے میں بچہ اپنے ارد گرد کے ماحول کے تمام امورسے غیر محسوس طریقے سے اثر لیتا ہے لہذا اس دور میں بچے کے ساتھ انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہئیے۔نماز کے بارے میں عملاََ کچھ نہ کچھ سکھانا چاہئیے اور جب اس مرحلے میں بچے کی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے تو یہ بچہ مستقبل میں ایک کار آمد انسان کی صورت میں معاشرے کا ایک مفید شہری سامنے آجاتا ہے۔نرمی،شفقت،اور حکمت سے اُس کے اندر ایک باشعور انسان کی تشکیل کرنا والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔نبی علیہ السلام اور اُن کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی انہی اصولوں کا عملی نمونہ تھی۔

---

[1]مسلم،کتاب الآداب،باب استحباب تحنیک المولود عند ولادتہ،رقم:5736

[2]مسلم،کتاب الزکوۃ،باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک ،رقم:2358

[3]بخاری،کتاب البیوع،باب من اجری امر الامصار علی مایتعارفون بینہم ،رقم:2211،مسلم،کتاب الاقضیۃ،باب قضیۃ ہند،رقم:4574

شفقت ،نرمی اور محبت کی چند مثالیں(1)سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا۔ نبی علیہ السلامکے پاس اقرعبنحابس[1] رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اقرع رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا کہ میرے دس لڑکے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ نبی علیہ السلامنے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ جو اللہ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا"[2]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے بچوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ روا نہیں رکھا جاتا تھا چنانچہ جاہلیت کے غیر فطری قوانین میں سے یہ بھی تھا کہ باپ کا بچے کوگود میں لینا اور نرمی اختیا ر کرنا باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس وجہ سے بچوں پر شفقت کرنا باعث اجر وثواب ہے۔ اسلام نے غیر مہذب معاشرے کایہ غلط رسم جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔اور فرمایا کہ "رحم "کیا کرو کیونکہ رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ بھی رحم فرماتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں رحم نہ کیا جاتا ہو وہ کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

سیرت طیبہ میں تو اس بارے میں بے شمار واقعات موجود ہیں جو بچوں پر شفقت اور رحم کی عملی تصویر ہیں۔ مثلاًََ

(2)"اسامہ[3]بن زید رضی اللہ عنہما کے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامانہیں اور حسن رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر یہ دعا کرتے تھے۔اے اللہ! مجھے ان سے محبت ہے تو بھی ان سے محبت رکھ[4]"

(3)دوسری روایت سنن نسائی[5] کی ہے جس میں ہے کہ:

"نبی علیہ السلاممغرب اور عشاء کی نمازوں میں سے کسی ایک نماز کے لیے اس حال میں نکلے، اور حسن[6] یا حسین[7] کو اٹھائے ہوئے تھے، جب آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے تو انہیں()زمین پر)بٹھا دیا، پھر آپ نے نماز کے لیے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دی، اور نماز کے دوران آپ علیہ السلام نے ایک سجدہ(بہت) لمبا کر دیا، تو میں نے اپنا سر اٹھایا

---

[1]اقرع بن حابس بن عقال،تمیمی۔جاہلیت میں سردار تھے۔وفد بنو دارم میں تشریف لاکر مسلمان ہوئے۔حنین،فتح مکہ اور طائف میں شریک رہے۔مدینے منورے میں اقامت پذیر تھے۔جوزجان میں شہید ہوئے۔(الاعلام،ج2،ص5،4)

[2]بخاری،کتاب الادب،باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ ،رقم:5997

[3]اُسامہ بن زیدبن حارثہ بن شراحیل ہے۔رسول اللہ نے آپ کو ایک لشکر کا آمیر بنایا ۔پھر ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ نے آپ کو اسی منصب پر برقرار رکھا۔ابوبکرؓ نے آپ کو شام کی طرف بھیجا،آپ اپنے باپ کےساتھ غزوہ تبوک میں شریک ہوئے،پھر آپ دمشق پہنچ گئے اور ایک مدت تک المزہ میں رہنے لگے۔پھر مدینہ واپس ہوئے اور وہاں پر وفات پاگئے اور بعض کہتے ہیں کہ وادی القریٰ میں وفات پاگئے۔(موطأمالك،ج6،ص 34۔معجم الصحابة للبغوي،ج1 ،ص 222)۔

[4]بخاری،کتاب فضائل اصحاب النبی ،باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما،رقم:3747

[5]المجتبى من السنن ،سنن النسائي ،،أحمد بن شعيب، أبو عبد الرحمن، النسائي،مكتب المطبوعات الإسلامية – حلب،الطبعة الثانية ، 1406 - 1986

[6]حسن بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب،قرشی،ہاشمی،ابو محمدرضی اللہ عنہ۔نواسۂ رسول تھے۔چہرے میں نبی علیہ السلام سے مشابہت رکھتے تھے۔آپ اُن سے بے پناہ محبت فرماتے تھے۔احتیاط سے کام لیتے ہوئے بہت کم احادیث اُن سے مروی ہیں۔سیدنا معاویہ رضی اللہ کے لیے۔خلافت سے دستبردار ہوئے۔سیر اعلام النبلاء483/4-486

[7]حسین بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب،قرشی ،ہاشمی،ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ۔نواسۂ رسول تھے۔آپ کے دل کے دھڑکن تھے۔سینے سے پاؤں تک آپ سے مشابہت رکھتے تھے۔کربلا میں شہید کیے گئے۔سیر اعلام النبلاء280/3-299

تو کیا دیکھتا ہوں کہ بچہ نبی علیہ السلامکی پیٹھ پر ہے، اور آپ سجدے میں ہیں، پھر میں اپنے سجدے کی طرف دوبارہ پلٹ گیا، جب نبی علیہ السلامنے نماز پوری کر لی تو لوگوں نے عرض کیا :اللہ کے رسول! آپ نے نماز کے درمیان ایک سجدہ اتنا لمبا کر دیا کہ ہم نے سمجھا کوئی معاملہ پیش آ گیا ہے، یا آپ پر وحی نازل ہونے لگی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :ان میں سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی، البتہ میرے بیٹے نے مجھے سواری بنا لیا تھا تو مجھے ناگوار لگا کہ میں جلدی کروں یہاں تک کہ وہ اپنی خواہش پوری کر لے"[1]"[2]

(4)اور امام ابو داؤد رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ:

"عبداللہ بن بریدہ [3]رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی علیہ السلامہمیں خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں لال قمیص پہنے ہوئے گرتے پڑتے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر پڑے، انہیں اٹھا لیا اور لے کر منبر پر چڑھ گئے پھر فرمایا” :اللہ نے سچ فرمایا ہے:"تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں[4]"میں نے ان دونوں کو دیکھا تو میناپنے آپ کو قابو نہ کر سکا‘‘، پھر آپ نے دوبارہ خطبہ دینا شروع کر دیا۔"[5]،[6]

(5)احادیث میں اسی قسم کاواقعہ سیدۃ امامہ [7]رضی اللہ عنہا کا باربار آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اُن کو گود میں لیے ہوئے نماز پڑھی تھی۔ جیا کہ روایت میں ہے:

"ابوقتادہ انصاری [8]رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامامامہ بنت زینب بنت نبی علیہ السلامکو(بعض اوقات)نماز پڑھتے وقت اٹھائے ہوتے تھے۔ ابوالعاص [9]بن ربیعہ بن عبدشمس کی حدیث میں ہے کہ سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے"[10]

(6)اور پہلے بھی یہ حدیث ذکر ہو اہے کہ:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں)یعنی عرب

---

[1] احمد بن شعیب،النسائی،المجتبیٰ من السنن(سنن نسائی)،کتاب التطبیق،باب ھل یجوز ان تکون سجدۃ اطول من سجدۃ،رقم:1141، مکتب المطبوعات الاسلامیہ،حلب،1406

[2]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے ،صحیح وضعیف سنن النسائی،ج3ص285،

[3]عبد الله بن بريدة بن الحصيب الاسلمي، أبو سهل: قاضی رہے، رجال الحدیث میں سے تھے۔ أصلاً کوفہ کے تھےبصرہ میں سکونت پذیر رہےوفات 115ھ تک مرو کے قاضی رہے۔الاعلام،ج4،ص74

[4]التغابن 15:64

[5]ابو داؤد،کتاب الصلوۃ،باب الامام یقطع الخطبۃ للامر یحدث،رقم:1111

[6]قال الالبانی"صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج3،ص109

[7]سیدہ امامہ بنت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہما۔زینب بنت نبی علیہ السلام کی بیٹی تھی۔آپ اُن کو گود میں اٹھائے ہوئے نماز پڑھتے تھے۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعدسیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوئی۔اُن کے بعدمغیرہ بن نوفل کی نکاح میں آئیں۔سیر اعلام النبلاء ج2،ص122

[8]أبو قتادة الانصاري السلمي ،صحيح قول كي بناء پر آپ کا نام حارث بن ربعي ہے، فارسُ رسول اللہ کے نام سے مشہور ہے۔أحد اورحديبية میں شریک رہے۔اُن سے کافی احادیث مروی ہیں۔اُن سے أنس بن مالك، وسعيد بن المسيب، وعطاء بن يسار، وعلي بن رباح، و عبد الله بن رباح الانصاري نے روایات لی ہیں۔سیراعلام النبلاء،ج2،ص449

[9]ابوالعاص بن ربیع بن عبد شمس،قرشی،ہاشمی تھے۔ان کے اصل نام لقیط تھے۔سیدہ زینب بنت نبی علیہ السلام کے شوہر اور آپ کےداماد اور سیدہ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کے والد تھے۔ حدیبیہ سے 5ماہ قبل اسلام لائے۔مسلمانوں کےقیدی بنے لیکن چھوڑ دئے گئے۔معرفۃ الصحابہ2356/4،سیر اعلام النبلاء1/330-334

[10]بخاری،کتاب الصلاۃ،باب اذاحمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ،رقم:516۔مسلم،کتاب المساجد،باب جواز حمل الصبیان فی الصلوۃ،رقم:1240

کی عورتوں میں قریش کی صالح، نیک عورتیں ہیں جو بچے
پر بچپن میں سب سے زیادہ مہربان اور اپنے شوہر کے مال کی
سب سے زیادہ حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں[1]

واضح رہے کہ یہ شفقت اور نرمی صرف اپنی اولادتک محدور نہیں رکھنی چاہئیے بلکہ تمام بچوں تک یہ حلقہ وسیع کرنا اسلامی تعلیمات ہیں خود نبی علیہ السلام کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ روایت میں آتا ہے:

(7)سیدنا انس بن مالک[2] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

""نبی علیہ السلامہم بچوں سے بھی دل لگی کیاکرتے، یہاں تک کہ میرے چھوٹے بھائی ابوعمیر سےمزاحاًفرماتے۔اے ابو عمیر! تیری نغیر نامی چڑیا تو بخیر ہے؟[3]

ان چند احادیث سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہرحال میں چھوٹوں کاکتنا خیال رکھنے والے تھے۔

دور جدید کے علم نفسیات کے ماہرین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ بچپن میں بچوں کے ساتھ نرمی اور احتیاط کا سلوک اُن کے مستقبل پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں اس کے برخلاف جن بچوں سے سختی اور بے احتیاطی کا سلوک کیا جائے تو عام طور پر وہ بچے اطمینان کی زندگی نہیں گزارتےاور اکثر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔

اس مرحلے میں بچے کی تعلیم وتربیت کی طرف کافی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ مرحلہ زندگی کے بنیادی مراحل میں سے ہوتا ہے۔جسمانی اور عقلی مہارت کا حصول بھی اسی مرحلے میں ہو تا ہے۔نماز وغیرہ کا باقاعد ہ حکم بھی اسی مرحلے میں دیا جاتا ہے ۔اسی مرحلے کے متعلق فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دے دیا کرو، اور جب دس سال کے ہو جائیں تو اس(کے ترک)پر انہیں مارو"[4]،[5]

اس حکم کا تعلق بچے اور بچی دونوں سے ہے اور مقصد یہ ہے کہ شعور کی عمر کو پہنچتے ہی شریعت کے اوامر ونواہی اور دیگر آداب کی تلقین و مشق کا عمل شروع ہو جانا چاہیے تاکہ بلوغت کو پہنچتے پہنچتے اس کے خوب عادی ہو جائیں۔ اسلام میں جسمانی سزا کا تصور موجود ہے مگر بے تکا نہیں ہے۔ پہلے تین سال تک تو ایک طرح سے والدین کا امتحان ہے کہ زبانی تلقین سے کام لیں اور خود عملی نمونہ پیش کریں۔ اس کے بعد سزا بھی دیں مگر ایسی نہ ہو جس سے بچے کو زخم آئے اور چہرے پر بھی نہ مارا جائے۔ کیونکہ چہرے پر مارنے سے نبی علیہ السلام نے منع فرمایا ہے۔

اس حدیث میں دو بنیادی باتیں ذکر کی گئی ہیں۔

(الف):کسی بچے کی تعلیم وتربیت کا مرحلہ سات سال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس عمر میں اگر چہ بچہ مکلف تو نہیں ہوتا لیکن نبی علیہ السلام نےاس اہمیت کے پیش نظر،یہ ارشاد فرمایا

---

[1]صحیح بخاری،کتاب النفقات،بابحفظ المرأة زوجها في ذات يده والنفقة،رقم:5365

[2]ابو حمزہ انس بن مالک بن نضر بن ضمضم نجاری ہیں۔خزرجی ،انصاری اور بلند مرتبہ صحابی اور خادم رسولؐ تھے۔مرویات کی تعداد 2286 ہے۔ ہجرت مدینہ سے دس سال پہلے 612ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں اسلام قبول کیا اور نبی علیہ السلام کی وفات تک ان کی خدمت کرتے رہے۔بصرہ میں 93ھ/712ء میں وفات پائی۔(ابن الاثیر، اسد الغابہ، ج1،ص250۔ابن عبدالبر، الاستیعاب،ج1،ص235۔ ابن حجر ، الاصابہ،ج1،ص126)۔

[3]بخاری،کتاب الادب،باب الانبساط الی الناس،رقم:6129،مسلم،کتاب الآداب،باب استحباب تحنیک المولود عند ولادتہ،رقم:5747

[4]سنن ابو داؤد،کتاب الصلوة،باب متی یومر الغلام بالصلوة،رقم:494

[5]قال الالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج1،ص494

کہ بچہ کسی حد تک ذہنی پختگی کی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اچھے برے کی کسی حد تک تمیز کر سکتا ہے۔

(ب): بچے کو سب سے پہلے دین کے بارے میں تعلیم دینی چاہئیے خصوصاً دین کے اہم اور کثیر الاستعمال احکام کے بارے میں تدریجی طور پر دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس مرحلے میں اگر چہ بچہ مکلف تو نہیں ہوتا لیکن پھر بھی سیرت طیبہ میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے خاطر اُن پر کڑی نظر رکھنی کی تلقین کی گئی ہے جائز وناجائز کے تصور سے اُنہیں آشنا کرنا ضروری ہوتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ ایک دفعہ جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے بچپن میں صدقہ یعنی زکوٰۃ کے مال سے صرف ایک کھجور کا دانہ منہ میں رکھا تو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے منہ سے نکال کر باہر پھینکا کیونکہ صدقہ(زکوٰۃ) اُن کے لیے جائز نہیں تھا،سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہے:

"حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے زکوٰۃ کی کھجوروں کے ڈھیر سے ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی تو نبی علیہ السلامنے فرمایا۔ چھی چھی! نکالو اسے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ کا مال نہیں کھاتے"[1]

اس حدیث کی تشریح میں علامہ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:

" اس سے بچوں کو مساجد لانا اور منفعت بخش آداب کی تعلیم دینا،مضرت رساں ،ناجائز اور حرام کاموں سے منع کرنے کا جواز ملتا ہے۔اگر چہ وہ ابھی سے غیر مکلف ہو تاکہ ابھی سے نیک کاموں کی عادی بن جائے"[2]

پھر اِس کے بعد یعنی سات سال کے بعد بچوں کی تربیت کا انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ تین سال تک اسے نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے گا اور جب دس سال کا ہو جائے تو اس کی تربیت کا انداز بدل کر نماز نہ پڑھنے پر تادیباً مارنے کا حکم ہے۔

پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ تربیت کایہ مرحلہ اساسی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃوالسلام میں اس مرحلے میں زندگی کے تمام لوازمات(کھانے پینے ،صحت کا خیال رکھنے،بچاؤ کی تدابیر وغیرہ) کے بارے میں ہدایات فراہم کرتی ہے۔اور اُس کو عملی زندگی میں لاگو کرنےکے ہدایات دیتی ہے۔

کھانے پینے کے بارے میں بچوں کے لیے ہدایات: ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں بچہ تھا اور نبی علیہ السلامکی پرورش میں تھا اور)کھاتے وقت(میرا ہاتھ برتن میں چاروں طرف گھوما کرتا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹے! بسم اللہ پڑھ لیا کرو، داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور برتن میں وہاں سے کھایا کرو جو جگہ تجھ سے نزدیک ہو۔ چنانچہ اس کے بعد میں ہمیشہ اسی ہدایت کے مطابق کھاتا رہا"[3]

جسمانی تربیت وغیرہ کی تعلیم دینا:اس بارے میں چند احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔

"(الف)ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر ہے ،دونوں میں سے ہر ایک میں خیر ہے، ہر اس چیز کی حرص کرو جو تمہیں نفع دے، اور اللہ سے مدد طلب کرو، دل ہار کر نہ بیٹھ جاؤ، اگر

---

[1]بخاری،کتاب الذکر،باب مایذکر فی الصدقۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم،رقم:1491

[2]فتح الباری،ج3ص355

[3]بخاری،کتاب الاطعمہ،باب التسمیۃ علی الطعام والأکل بالیمین،رقم:5376،مسلم،کتاب الاشربۃ،باب آداب الطعام والشراب واحکامہما،رقم:5388

تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش کہ میں نے ایسا ویسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا، بلکہ یہ کہو: جو اللہ نے مقدر کیا تھا اور جو اس نے چاہا ،کیا۔ اس لیے کہ ''اگر مگر''شیطان کے عمل کے لیے راستہ کھول دیتا ہے"[1]

"(ب) " سلمہ بن اکوع[2] رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامقبیلہ اسلم کی ایک جماعت سے گزرے جو تیر اندازی میں مقابلہ کر رہی تھی۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا ''اے بنو اسماعیل! تیر اندازی کئے جاؤ کیونکہ تمہارے بزرگ دادا بھی تیرانداز تھے اور میں بنو فلاں کے ساتھ ہوں۔''راوی نے بیان کیا کہ یہ سنتے ہی دوسرے فریق نے تیر اندازی بند کر دی۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا ''کیا بات ہوئی ' تم لوگ تیر کیوں نہیں چلاتے؟''انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب آپ فریق مقابل کے ساتھ ہو گئے تو اب ہم کس طرح تیر چلا سکتے ہیں۔ اس پر نبی علیہ السلامنے فرمایا ''مقابلہ جاری رکھو ' میں تم سب کے ساتھ ہوں"[3]

یہ حدیث اگر چہ بچوں کے ساتھ خاص نہیں ہے لیکن چونکہ بچوں کے مستقبل میں کارآمد ہوتے ہیں۔کیونکہ اُن میں سیکھنے کی استعداد بھی زیادہ ہوتا ہے۔مستقبل میں جہاد کے تیاری کے لیے بچوں کی ذہن ابھی سے تیار کرنے کے لیے اس قسم کی سر گر میوں میں حصہ لینا ہوتا ہے۔

جس طرح والدین اولاد کے نان نفقے کے ذمہ دار ہوتے ہیں بالکل اسی طرح اُن کی تعلیم وتربیت کے ذمہ داری بھی اُن پر آپڑتی ہے۔جیسا کہ پہلے صفحات میں ذکر کیا گیا ہے:آدمی اپنے اہل کا نگران ہے اور اُس سے اپنے اہل کے بارے میں پوچھا جائے گا[4]"

الغرض سیرت طیبہ میں بچے کے حمل سے لے کر اُس کی بلوغت تک کے تمام مراحل کےلیے ہدایات موجود ہیں جس پر عمل کرکے والدین بچے کو معاشرے کا ایک صحت مند اور مفید شہری بنا سکتا ہے۔

طلاق،خلع وغیرہ کی صورت میں بچے کے حقوق:

میا ں بیوی کی آپس میں علحیدگی کی صورت میں بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کی حفاظت ،دودھ پلانے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے خاطر نہایت مثبت احکامات دئیے ہیں کہ بچہ کس کے پاس رہے گا اور اس کا خرچہ کون برداشت کرے گا۔

سیرت طیبہ میں اس کی تفصیل موجود ہے چنانچہ جب انتہائی چھوٹا ہو تو ماں کے ساتھ رہے گا جیسا کہ امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ:

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے نبی علیہ السلامسے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کا گھر رہا، میری چھاتی اس کے پینے کا برتن بنی، میری گود اس کا ٹھکانہ بنی، اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دی ہے، اور اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' :جب تک تو(دوسرا)نکاح نہیں کر لیتی اس کی تو ہی زیادہ حقدار ہے"[5]،[1]

---

[1]مسلم،کتاب االقدر،باب فی الامر بالقوة وتر ک العج زوالاستعانۃ باللہ،رقم:6945

[2]سلمہ بن عمرو بن سنان الاکوع رضی اللہ عنہ۔بیعت رضوان میں شریک تھے۔آپ کے ساتھ 7غزوات میں شریک رہے۔بلا کے تیر انداز تھے۔آپ رضی اللہ عنہ کے 77مرویات ہیں۔مدینے میں وفات پائے۔الاعلام113/3

[3]بخاری کتاب الجہادوالسیر،باب التحریض علی الرمی۔وقول اللہ تعالی :واعدوا لھم مااستطعتم من قوة ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم،رقم:2899

[4]صحیح بخاری،کتاب فی الاستقراض،باب العبد راع فی مال سیده ولایعل الا باذنہ،رقم2409،صحٰح مسلم،کتاب الامارة،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علیہ،رقم4828

[5]سنن ابو داؤد،کتاب الطلاق،باب من احق بالولد،رقم:2278

اور جب بچہ بڑا ہوجائے اوراپنے پرائے میں تمیز کرنے والا بن جائے تو پھر اس کو اختیا ر دیا جائے گا کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے جیسا کہ نسائی کی روایت ہے""ایک عورت نبی علیہ السلامکے پاس آئی اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! میرا شوہر میرا بیٹا مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے جب کہ مجھے اس سے فائدہ)و آرام(ہے، وہ مجھے عنبہ کے کنویں کا پانی)لا کر(پلاتا ہے،)اتنے میں(اس کا شوہر بھی آ گیا اور اس نے کہا: کون میرے بیٹے کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا)اور اختلاف(کرتا ہے؟ نبی علیہ السلامنے)اس کے بیٹے سے کہا(:اے لڑکے! یہ تمہارا باپ ہے اور یہ تمہاری ماں ہے، تو تم جس کے ساتھ رہنا چاہو اس کا ہاتھ پکڑ لو چنانچہ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔"[2]،[3]

فائدہ:میاں بیوی کی باہمی تفریق کی صورت میں بعد بچے کس کے پاس رہیں گے؟
اس بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔
احناف کےنزدیک بچہ ماں کے ساتھ اس وقت تک رہے گا جب تک کہ وہ عورتوں سے متعلق خدمات(کھلانا،پلانا،دھونا وغیرہ) سے بے نیاز نہ ہو ۔لڑکی تب تک ماں یا نانی کے ساتھ رہے گی جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے کیونکہ وہ عورتوں سے متعلق آداب کے محتاج ہوتی ہے اور یہ کام ماں ہی کر سکتی ہے۔بلوغت کے بعد باپ کے ساتھ رہے گی کیونکہ اُس وقت اسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ باپ ہی پورا کر سکتا ہے۔
مالکیہ کے نزدیک حضانت کا یہ حق لڑکے میں بلوغت تک اور لڑکی میں شادی کے زمانے تک رہتا ہے۔
شوافع کے نزدیک اگر یہ لڑکا/لڑکی سات یا آٹھ سال کا ہو اور تمییز کرنے والاہو تو بچے کو اختیا دیا جائے گا کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔کیونکہ رسول نے یہی عمل فرمایا تھا۔
حنابلہ کے نزدیک جب یہ عقل مند بچہ سات سال تک پہنچ جائے تو اُسے اختیا ر ہوگا کما قال الشوافع[4]۔

ولد الزنا کے حقوق:

والدین کی نعمت سے محروم یہ طبقہ بھی سنت نبوی کی نظروں سے اوجھل نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اُن کے ساتھ احسان کے سلو ک کا حکم دیا ہے۔رضاعت،کفالت اورگودِ میں لینے کے مستحق ان بچوں کی پرورش بھی شریعت نے باعث اجر وثواب قرار دیا ہے۔ حتّٰی کہ حالت حمل میں بھی ولدا لزنا کی زندگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ امام ابو داؤدر حمہ اللہ نے اپنی سنن میں اس قسم کی حدیث ذکر کی ہے کہ:" عبداللہ بنبریدہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ غامد کی ایک عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور عرض کیا: میں نے زنا کر لیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :واپس جاؤ“، چنانچہ وہ واپس چلی گئی، دوسرے دن وہ پھر آئی، اور کہنے لگی: شاید جیسے آپ نے ماعز بن مالک[5]کو لوٹایا تھا، اسی طرح مجھے بھی لوٹا رہے ہیں، قسم اللہ کی میں تو حاملہ ہوں، آپ صلی اللہ

---

[1]قال الالبانی:حسن،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج5،ص276
[2]سنن نسائی،کتاب الطلاق،باب اسلام احد الزوجین وتخییر ولدہ،رقم:3496
[3]قال الشيخ الألباني : صحيح "،صحیح وضعیف سنن النسائی،ج8ص68
[4]وھبۃ الزحیلی،الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج7ص744،743،742،دارالفکر دمشق،بدون تاریخ
[5]ماعز بن مالک،اسلمی رضی اللہ عنہ۔اسلام لانے کے بعد آپ نے اس کے لیے اُس کے قوم کے نام خط تحریر فرمایاتھایہ وہی صحابی ہے جس سے گناہ(زنا)سرزد ہوئی تھی،خود آکر رسول اللہ کے سامنے اقرار کیا۔چونکہ آپ رضی اللہ عنہ محصن تھے اس وجہ سے آپ پر رجم کی حد جاری کردی گئی تھی۔آپ کے بقول آپ رضی اللہ عنہ کا توبہ قبول ہوئی تھی۔الاستیعاب1345/3

علیہ وسلم نے فرمایا" :جاؤ واپس جاؤ" چنانچہ وہ پھر واپس چلی گئی، پھر تیسرے دن آئی تو آپ نے اس سے فرمایا" :جاؤ واپس جاؤ بچہ پیدا ہو جائے پھر آنا "چنانچہ وہ چلی گئی، جب اس نے بچہ جن دیا تو بچہ کو لے کر پھر آئی، اور کہا: اسے میں جن چکی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :جاؤ واپس جاؤ اور اسے دودھ پلاؤ یہاں تک کہ اس کا دودھ چھڑا دو "دودھ چھڑا کر پھر وہ لڑکے کو لے کر آئی، اور بچہ کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ کھا رہا تھا، تو بچہ کے متعلق آپ نے حکم دیا کہ اسے مسلمانوں میں سے کسی شخص کو دے دیا جائے، اور اس کے متعلق حکم دیا کہ اس کے لیے گڈھا کھودا جائے، اور حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے، تو وہ رجم کر دی گئی۔ خالد رضی اللہ عنہ اسے رجم کرنے والوں میں سے تھے انہوں نے اسے ایک پتھر مارا تو اس کے خون کا ایک قطرہ ان کے رخسار پر آ کر گرا تو اسے برا بھلا کہنے لگے، ان سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :خالد! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ٹیکس اور چنگی وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اس کی بھی بخشش ہو جاتی"، پھر آپ نے حکم دیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور اسے دفن کیا گیا۔[1،2]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولدالزنا کو حالت جنین میں بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

فائدہ:اس سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ حالت حمل میں عورت پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔چاہے یہ حمل حلال طریقے سے ہو یا زنا سے۔کیونکہ اس میں جنین کوناجائز طریقے سے قتل کرنا لازم آتا ہے۔پھر جب عورت کا وضع حمل ہو جائے تو اُس کے بعد عورت پر حد جاری کی جائی گی۔ اور اسی پر اجماع ہے کہ اسی طرح جس عورت کو قصاصاََ قتل کرنے کا حکم ہو اُسے بھی وضع حمل تک قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔"وَفِيهِ : أَنَّ مَنْ وَجَبَ عَلَيْهَا قِصَاص وَهِيَ حَامِل لَا يُقْتَصّ مِنْهَا حَتَّى تَضَع ، وَهَذَا مُجْمَع عَلَيْهِ ، ثُمَّ لَا تُرْجَم الْحَامِل الزَّانِيَة وَلَا يُقْتَصّ مِنْهَا "[3]۔ اس باب میں اتفاقی اور اجماعی مسئلہ یہ ہے کہ حاملہ عورت پر جب قصاص واجب ہوجائے تو جب تک وضع حمل نہ ہو تب تک اُسے قصاص نہیں کیا جائے گا۔نہ تو اُسے رجم کیا جائے گا اور نہ ہی کوڑے لگائے جائیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سنت نبوی ﷺ نے انسان سے ایک کامل اور سلیم الفطرت انسان بنانے کے لیے جتنی کوشش کی ہے دنیا کا کوئی بھی مذہب اور قانون اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔اسلام اسے معاشرے کا ایک پُر امن،نیک اور باشعور فرد بناتا ہے اور اُسے اپنے حقوق اور فرائض سے خبردار کرتا ہے۔

کسی بھی انسان کی زندگی بننے اور بگڑنے کا سب سے پہلا مرحلہ بچپن کا ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام نے اس دور کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی ہے،جس کا کچھ تذکرہ کیا گیا۔آج بھی اگر اُنہی اصولوں پر عمل کیا گیا تو کچھ بعید نہیں کہ خیرالقرون کے معاشرے کی جھلک ہمیں عملی طور پر نظر آئے ۔

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب الحدود،باب المراۃ اللتی امر النبی برجمھا ،رقم:4444

[2]البانی کے نزیک یہ حدیث صحیح ہے،صحیح و ضعیف سنن ابی داود،ج9،ص442

[3]یحی بن شرف،النووی،المنہاج شرح صحیح مسلم،باب من اعترف علی نفسہ بالزنی،ج6ص117،دارالحیاء التراث العربی،بیروت،1392ھ

فصل دوم

خواتین،میاں بیوی، والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق

عورتوں کے سلسلے میں سیرتِ طیبہ کی روشنی میں مسلمانوں پر جتنے حقوق عائد کئے گئے ہیں وہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت ہے اسلام سے پہلے کسی بھی مذہب نے عائد نہیں کئے ۔اسلام کی نظر میں مرد اور عورت بحیثیت انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں۔

دنیا میں یونانیوں کے فلسفے کا بڑا چرچا رہا ہے۔ان کے نزدیک عورت ذات:"رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ

"ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں"

تھی۔اہل روم اسے شیطان کے آلہ کار کہتے تھے کہ اسی ہی کی وجہ سے شیطان لوگوں کے دلوں میں فساد ڈالتا ہے۔بلکہ عورت ذات کے متعلق اُن کا یہ قول بھی ہے ۔کہ کیا عورت روح ہے؟ اور اگر روح ہے تویہ روحِ انسانی ہے یا روحِ حیوانی؟

ایک وقت تھا جب عورت کے بارے میں بڑے بڑےعلمی مذاکرے ہوا کرتے تھے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ :1۔عورت ایک ایسی موجود چیز ہے جس کا کوئی نفس نہیں ہے،اسی وجہ سے وہ اخروی زندگی نہیں پا سکتی۔2۔ اور یہ کہ عورت"گندگی"کا دوسرا نام ہے۔

ماضی قریب ہی میں ہندی تہذیب میں عورت لکڑی کی مانند سمجھی جاتی تھی جو صرف شوہر کی قبر پرجلنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔اُن میں دوامراء ایسے بھی گزرے ہیں جن کے بیک وقت تیرہ اور سترہ تک بیویاں تھیں اور پھر اُن امراء کی موت پر ایک ہی وقت میں وہ تیرہ کی تیرہ اور سترہ کی سترہ بیویاں آگ میں جلا دئی گئیں[1]۔

زمانہ جاہلیت میں عور ت کے ساتھ جانور سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا اُنہیں حقوق دینا تو درکنار،انسان ہی نہیں سمجھتے تھیں۔وہ عورت کو باعثِ عار سمجھتے تھے۔بعض قبائل نے

[1] اضواء علی الرعایۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام،ص267

تو یہ حدود بھی پار کئے تھے کہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفناتے ۔ وہ عورت کو صرف
اپنی ضروریات کو پوری کرنے کا سامان سمجھتے تھے۔

یہ توپُرانے زمانے کی باتیں ہیں اگر ہم آج کی ترقی کے دعوے دار تہذیبوں کو دیکھے تو صاف نظر آتا ہے کہ آزادی کے نام پر اُنہوں نے عورت کے حقوق چھین لئے ہیں۔آزادی کے نام پر عورت سے حقِ نفقہ چھین کر کسب کے سلسلے میں مردوں کے مقابل لاکھڑاکیا۔
عورت کو باپردہ رہنے کے حکم کودقیانوسی کا نام دیا گیا۔صاحب ثروت لوگوں کے لیے ایک کھلونا بنادیا گیا جو اس کی عزت سے کھیلنا آزادی سمجھتے ہیں۔

اسلام نے عورت کوظلم کے اندھیروں ، انسانیت سے گرے ہوئے ماحول اور پستی کی زندگی سے نکال کر آرام سے رہنے کا قابل بنایا۔ اسے مرد جیسے حقوق ملے الغرض تاریخ میں کہیں بھی عورت کو ایسے حقوق نہیں ملے ہیں جو اُنہیں اسلام نے دئے۔ذیل میں چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(1)حق میراث: میت کے ورثاء میں اگر کوئی عورت ہو تو اسلام میں اس کا باقاعدہ حصہ مقرر کیا گیا ہے۔چاہے یہ عورت ماں کی صورت میں ہو،بیٹی یا بیوی کی صورت میں ہو بلکہ بعض دفعہ توبہن اور پھوپھی بھی وارث بن سکتی ہے۔جبکہ کبھی کبھی مر داور عورت میراث کے حصوں میں برابر ہوتے ہیں۔"کما فی حالۃ الاخوۃ والاخوات لام،فللذکر والانثی السدس،وکذلک الاب والام اذاورثا من ابنائهما،فلکل منهماالسدس" ۔جب ورثاء بھائی اور اخیافی بہنیں ہو تو اس صورت میں مرد وعورت دونوں کے لیے سدس(چھٹا حصہ) ہوگا ۔اسی طرح جب والد اور والدہ اپنے بیٹوں کے وارث بن جائے تو ہر ایک کے لیے سدس ہوگا۔
ا ور ایک صورت ایسی بھی ہے جس میں عورت ،مردسے زیاد ہ حصہ لیتی ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ عورت تو حصہ لے اڑے اور مرد محروم رہے۔مثلا میت کے ورثاء میں اگر حقیقی بہن اورماں شریک بھائی یا باپ شریک بھائی جمع ہو جائے تو حقیقی بہن کی وجہ سے ماں شریک یا باپ شریک بھائی میراث سے محروم ہو جاتے ہیں[2]۔

عورتوں کی میراث کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشادہے:

"اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا ۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے ، اگر اس (میت) کی اولاد ہو ، اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے ، ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے ۔ یہ حصے اس وصیت (کی تکمیل) کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد ، تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہچانے میں زیادہ قریب ہے ، یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والاہے"[3]

---

[1]الشیخ عطیۃ۔صقر،موسوعۃ الاسرۃ تحت رعایۃ الاسلام،ج2ص343تا349
[2]الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج8ص290تا294
[3]النساء 11:4

(2)حدود اور سزاؤں میں مساوات: عورتوں کے حقوق کے بارے میں انسانیت کا اعلی نمونہ صرف اسلام ہی نے پیش کیا ہے کہ مرد کو بھی کسی غیر اسلامی فعل کے ارتکاب کے نتیجے میں وہی سزا ملے گی جو کسی عورت کو ملتی ہے۔چاہے یہ سزا کسی بھی قسم کی ہو۔قُرآن کریم کا ارشاد ہے:

" چوری کرنے والے مرد یا عورت کے ہاتھ کاٹ لو یہ بدلہ ہے ان کے فعلوں کی، اوراللہ کی طرف سے عبرت ہے اوراللہ زبردست (اور) حکمت والا ہے"[1]

دوسری جگہ ارشاد ہے"

> "زنا کرنے والی عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور آخرت کے روزپر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم پورا کرنے میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور ان کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئیے"[2]

دیکھئے ، اسلام نے سزاؤں کے سلسلے میں مساوات کا جو درس دیا ہے دنیا کاکوئی مذہب اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔

(3)خلقت میں مساوات: اللہ جل شانہ نے مرد عورت کی بحیثیت انسان تخلیق ایک ہی قسم کی فرمائی ہے۔ایک ہی نفس سے اِن کی تخلیق فرمائی ہے۔کسی بھی قسم کا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا ۔اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

> "اےلوگو! اپنےرب سے ڈرو جس رب نے تم(سب) کو ایک(ہی) شخص(آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا،اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیئے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت بر آری کا ذریعہ بناتے ہو اورارحام(کے قطع) سے (بچو) بےشک اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[3]

اور ارشاد ہے:

> "اےلوگو ! ہم نے تم کو ایک (ہی)مرد(آدم علیہ السلام) اور ایک عورت (حوا علیہا السلام)سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور ا للہ کے نزدیک زیادہ پرہیزگار ہی تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے۔ بےشک اللہ سب کچھ جاننے والا،سب سے خبردار ہے"[4]

(4)زندگی کے تمام مراحل میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے لیے قانون سازی کرنا: اللہ جل شانہ نے عورت سے متعلقہ تمام حقوق سے متعلق قرآن کریم میں اپنے ارشادات کے ذریعے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔حالتِ حمل سے لے کروفات اور کفن دفن تک زندگی کے ہر شعبے میں اسلام ہدایات فراہم کرتا ہے۔حق نکاح میں اُ س کی مرضی

---

[1] النساء38:5
[2] النور2:24
[3] النساء1:5
[4] الحجرات13:49

کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔اور والدہ کو یہاں تک پابند کیا گیا ہے کہ اگر جنت چاہیے ہو تو یہ
تمہیں ماں کے قدموں یعنی اُن کی خدمت میں ملے گی۔

سیرت طیبہ میں بھی اِن کے حقوق واضح طور پر بیان کئے گئیں ہیں چھوٹی لڑکی سے لے کر بڑی عمر کے حد تک تمام عورتوں کے خیال رکھنے کا احکامات بیان کئے گئیں ہیں۔

دنیائے اسلام میں سب سے پہلی عورت جسے ایمان کی دولت نصیب ہوئی وہ سیدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہے جسے نبی علیہ السلام کی زوجیت بھی نصیب ہوئی تھی۔اسلام نے اُنہیں بہت زیادہ درجہ دیا تھا۔

مسلمان عورتیں اللہ کے راستے میں مرد کے شانہ بشانہ رہ کر خدمات سرانجام دیتی آ رہی ہیں،علم کا میدان ہو یا جہاد کا،تیمارداری ہویامجاہدین کے علاج معالجہ کاانتظام ،ہر مرحلے میں اُنہوں نے قربانی دی ہے۔ام المئومنین سیدہ عایشہ رضی اللہ عنہا علم کے باب میں یکتائے روزگار تھیں۔بہت ساری روایات اُ ن سے منقول ہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن سے مسائل پوچھتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کتنا اہم مقام دیا ہے۔اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کی دلجوئی کے خاطر بعض امورمیں اُ ن سے مشور ہ طلب کرنابھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں۔

<u>(5)شرعی احکام پر مساوی اجر وثواب ملنا:</u>بلوغت کے بعد جب انسان احکام کا مکلف بن جاتا ہے۔تو جب وہ کوئی حکم بجا لاتا ہے چاہے مرد ہو یا عورت،اُسے ایک جیسا اجر وثواب ملے گا۔نماز ،روزہ،اور زکوٰۃ وغیرہ کی بجا آوری پر دونوں کے ثواب میں کمی بیشی نہیں ہوگی۔ہاں کچھ استثنائی صورتیں ایسی ہیں جن میں قدرت اور طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے کچھ احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔جیسے جہاد وغیرہ۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> "جوکوئی نیک اعمال کرے گا مرد ہو یا عورت وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) نہایت اچھا بدلہ دیں گےاُن کے اعمال کا "[1]

اسی طرح ارشا دہے:

> "اور جو ایمان والا نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت تو ایسے لوگ بہشت میں جائیں گے اور ان کی تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی"[2]

مرد عورت کے اعمال ثواب کے اعتبار سے یکساں ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

> "مسلمان مرد اور عورتیں، مومن مرد اور عورتیں ،اطاعت گزار مرد اور عورتیں،سچ بولنے والے مرد اور عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور عورتیں، فروتنی کرنے والے مرد اور عورتیں،خیرات کرنے والے مرد اور عورتیں ، روزے دار مرد اور عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور اللہ کوبہت یاد کرنے والے مرد اور

---

[1] النحل97:16
[2] النساء 124:5

عورتیں۔ بے شک ان کے لئے اللہ نے مغفرت اوربہت بڑا اجر
تیار کر رکھا ہے"[1]

اور ارشاد ہے:

"اے نبی! جب (ایمان لانے کے خاطر)مومن عورتیں بیعت کرنے کو آئیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی، چوری اور بدکاری بھی نہیں کریں گی۔ اپنی اولاد کو قتل کریں گی نہ ہی اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی اور نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے اللہ سے بخشش مانگو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے"[2]

اب ہم مرحلہ وار عورت کی پیدائش سے لے کر آخر تک کےحقوق وتکریمات سیرتِ نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

پہلامرحلہ :اسلام کے پہلے مخاطبین وہ لوگ تھے جو "لڑکیوں کو زندہ درگور" کرتےتھے۔یعنی اُن کا پیدا ہونا ہی اُن کا جرم تھا ۔اسلام نے آکر ان بے ضرر اور معصوم انسانیت کے قتل کو نہ صرف روکا بلکہ اُن کے اس عمل کو گناہ کبیرہ قرار دیا۔صحیحین میں روایت ہے کہ:

" مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں(اور باپ)کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،(واجب حقوق کی)ادائیگی نہ کرنا اور(دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر)دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے"[3]

اس کی شرح میں امام نووی[4]رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں

"ماں کی نافرمانی حرام اورباتفاق علماء کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔بہت سارے احادیث سے اس کا کبیرہ ہونا ثابت ہے۔اسی طرح والد کی نافرمانی بھی کبیرہ گناہ ہے۔یہاں صرف ماں کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ والدہ کی نافرمانی والد کے نافرمانی سےزیادہ گناہ ہے۔اسی وجہ سے نبی علیہ السلام نے جب ایک سائل نے سوال کیا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کو ن ہے؟ فرمایا،ماں۔تین دفعہ ماں فرمایا اور چوتھے دفعہ فرمایا:باپ۔اور اسی وجہ سے بھی یہاں صرف ماں کاتذکرہ ہے کہ والد کے مقابلہ میں والدہ کی نافرمانی زیادہ ہوتی ہے""جہاں تک" وَأْد الْبَنَات "کا تعلق ہے تو اس سے مطلب ہے:اُن کو زندہ درگور کرنا،تاکہ وہ مٹی تلے مر جائیں۔یہ ہلاک کرنے ولاے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔کیونکہ یہ بے گناہ قتل کے

---

[1]الاحزاب35:33

[2]الممتحنہ12:60

[3]بخاری،کتاب فی الاستقراض، باب ما ینھی عن اضاعۃ المال، رقم:2408،مسلم،کتاب الاقضیۃ،باب النھی عن کثرۃ المسائل من غیر حاجۃ۔رقم:4580

[4]یحی بن شرف بن مری،نووی،شافعی،ابوزکریا،سوریا کے علاقے حوران میں 631ھ کو پیدا ہوئے۔حصول علم کے لیے دمشق گئے اور طویل مدت تک وہاں اقامت پذیر رہے۔اپنے ہی گاؤں میں 676ھ کو وفات پائے۔تذکرۃ الحفاظ470/41،الاعلام149/8

ساتھ ساتھ رشتہ داری قطع کرتا ہے۔صرف بیٹیوں کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔[1]

جب کہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا قول ہے:لڑکیوں کو زند ہ درگو ر کرنے کے دو طریقے تھے۔پہلا یہ کہ جب عورت وضع حمل کے قریب ہوجاتی تو اُسے کہا جاتا کہ ایک گڑھے کے قریب جاؤ۔اگر لڑکا پید اہوجاتا تو اُسے واپس اور اگر لڑکی پیدو ہوجاتی تو اسے اُس گڑھے میں ڈال دیتی تھی۔پہلے فریق کے ہاں یہ قول زیادہ راجح ہے ۔دوسرا یہ کہ لڑکی جب کچھ بڑی ہوجاتی تو اُس کے ماں کو کہا جاتا کہ اسے تیار کرلو تا کہ میں اسے رشتہ داروں کے ہاں لے چلو۔اسی بہانے اُسے صحراء میں لے جاکر کسی کنویں کے قریب لے جاتا اور اسے کہاجاتا کہ کنویں میں دیکھو اسی وقت اسے کنویں دھکیل دیا جاتا اور پتھر وغیرہ سے ڈھانپ دیاجاتا۔[2]

لڑکی جب پیدا ہوجائے تو اُس کے لیے اچھا نام رکھنااور اُس کی پیدائش کی خوشی میں بکری وغیرذ بح کرکے رشتہ داروں کی دعوت کرنی چاہئیے اسلام ہی نے عورت کو یہ مقام دیا ہے کہ پیدا ہوتے ہی عقیقہ کرکے خوشی منانےکا حکم ارشاد فرمایا ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ [3]کی روایت ہے کہ:"ام کرز رضی اللہ عنہا[4] کہتی ہیں کہ انہوں نے نبی علیہ السلامسے عقیقہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا" :لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے گی، وہ جانور نر یا ہو مادہ اس میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں"[5][6]

نہیں"[5][6]

اسلام نے تو عورت کے لیے نام بھی بامعنی رکھنے کا حکم دیا ہے اور اگر کہیں کسی کانام معنی کے لحاظ سے درست نہ ہوتا تو خود نبی علیہ السلام اُسے تبدیل فرماتے جیسا کہ روایت میں آتا ہے:"سیدنا عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے"عاصیہ(گناہگا عورت)"نام تبدیل کرکے "جمیلہ(خوبصورت عورت)"رکھ دیا تھا"[7]،[8]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

---

[1]شرح النووی علی صحیح مسلم،باب النھی عن کثرۃ السؤال،ج6ص145

[2]فتح الباری،ج10،ص407

[3]ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ ترمذی رحمہ اللہ تعالٰی۔دریائے جیجون کے کنارے پر واقع ترمذ میں پیداہوئے۔علماء حفاظ حدیث میں سے ہیں۔ آپ کے شیوخ میں سے امام بخاریؒ، امام ابو داودؒ اور امام مسلمؒ جبکہ تلامذہ میں ابو بکر احمد بن اسماعیلؒ، احمد بن علی المقریؒ اور احمد بن یوسف نسفیؒ شامل ہیں۔ آپؒ کی تصانیف میں کتاب الشمائل،جامع ترمذی،کتاب التاریخ،کتاب المفرد اور کتاب العلل وغیرہ شامل ہیں۔ ترمذ میں 279ھ/892ء کو 70 سال کی عمر میں وفات پائے۔(الذہبی،سیر اعلام النبلاء،ج25،ص271،رقم132۔ الزرکلی، الاعلام، ج2،ص84)۔

[4]ام کرز صحابیہ جلیلہ ہے۔خزاعی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔حدیبیہ کے دن اسلام لائیں جب رسول اللہ □اونٹ کا گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔عقیقہ کی حدیث اُن سے مروی ہے۔احمد بن علی،ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ج8،ص286رقم:12219، دار جیل،بیروت،طبع اولیٰ ، 1412 ،

[5]سنن ترمذی،کتاب الاضاحی،باب الاذان فی اذن المولود،رقم:1516

[6]یہ حدیث صحیح ہے ،صحیح وضعیفسنن ترمذی،ج4،ص16

[7]کتاب الآداب،باب استحباب تغییر الاسم القبیح،رقم5727

[8]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج6،ص338

سیدہ زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ میرا نام "برہ" تھا تو نبی علیہ السلام نے میرا نام زینب رکھ دیا۔ اور فرماتی ہے کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا[2] کا نام(بھی)"برہ" تھا اُن کا نام بھی زینب رکھ دیا"[3]

دیکھئے سیرت طیبہ کیسے بیٹیوں کی اچھی تربیت اور اُن کے ساتھ حسن سلوک کی حوصلہ افزائی کرتی ہے،کہ بیٹیوں کی اچھی تربیت قیامت کے دن آگ سے نجات کا ذریعہ ہوگی۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنی دو بچیوں کو لیے مانگتی ہوئی آئی۔ میرے پاس ایک کھجور کے سوا اس وقت اور کچھ نہ تھا میں نے وہی دے دی۔ وہ ایک کھجور اس نے اپنی دونوں بچیوں میں تقسیم کر دی اور خود نہیں کھائی۔ پھر وہ اٹھی اور چلی گئی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلامتشریف لائے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حال بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ان بچیوں کی وجہ سے خود کو معمولی سی بھی تکلیف میں ڈالا تو بچیاں اس کے لیے دوزخ سے بچاؤ کے لیے آڑ بن جائیں گی"[4]

اسلام لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اونچ نیچ کا فرق کرنے کو روانہیں رکھتا بلکہ دونوں کے ساتھ ایک جیسا پیار،محبت اور نرمی کا سلوک کرنے کا درس دیتا ہے ۔خود نبی علیہ السلام کا عمل مبارک اس بات کی عملی تصویر ہے۔آپ جس طرح پیار حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے کرتے بالکل اُسی طرح پیار اپنی پوتی سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے تھے،صحیحین کی روایت میں ہے کہ:

"نبی علیہ السلام امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہماکو (بعض دفعہ)نماز پڑھتے وقت اٹھائے ہوتے تھے۔ ابوعاص بن ربیعہ کی حدیث میں ہے کہ سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے"[5]

عورت کا اس سے زیادہ حق کون ادا کر سکتا ہے جس طرح اسلام نے احکام دئیے ہیں ۔عورت اگر باندی بھی ہو تو بھی اسلام اُس کے ساتھ احسان (اُس کی اچھی تعلیم وتربیت)کرنے پر بندہ کو اجر وثواب کا مستحق گردانتا ہے۔بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

---

[1] زینب بنت ابو سلمہؓ المخزومیہ صحابیہ ہیں۔صحاح ستہ کی راویہ ہیں۔شیوخ میں نبی علیہ السلام کے علاوہ ام سلمہؓ،ام حبیبہؓ اور حضرت عائشہؓ جبکہ تلامذہ میں عامر شعبیؒ،عروہ بن زبیرؒاور عمرو بن شعیبؒ مشہور ہیں۔73ھ کو مدینہ میں وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج7،ص145۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج2،ص99۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج7،ص675)۔

[2] زینب بنت جحش بن رئاب،اسدیہ،قرشیہ،ہاشمیہ،ام المؤمنین رضی اللہ عنہا،33 قبل ہجرت پیدا ہوئیں،پہلے سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں ۔آپ نے طلاق دی تو رسول اللہ کے نکاح میں آئیں ۔یہ نکاح خود باری تعالیٰ نے فرمائی۔اُن کانام "برہ"تھا آپ نے زینب رکھا۔اُنہیں کے سبب آیۃ الحجاب نازل ہوئی تھی۔22ھ کو وفات پائیں۔(الاعلام،ج3،ص66)

[3] مسلم،کتاب الآداب،باب استحباب تغییر الاسم القبیح،رقم5732

[4] بخاری،کتاب الزکاۃ،باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ والقلیل من الصدقۃ،رقم:1418،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب فضل الاحسان الی البنات،رقم:6862

[5] بخاری،کتاب الصلاۃ،باب اذاحمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ،رقم:516،مسلم،کتاب الساجد،باب جوازحمل الصبیان فی الصلوٰۃ،رقم:1240

نبی علیہ السلام نے فرمایا" جس کسی کے پاس بھی کوئی
باندی ہو اور وہ اسےاچھے طریقے سےادب سکھا کر آزاد
کرائےاور اس سے نکاح کر لے تو اسے دوہرااجر ملتا ہے اور
جو غلام اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے
بھی تو اسے بھی دوگنا ثواب ملتا ہے"[1]

دوسرامرحلہ :لڑکی(عورت) جب بالغ ہو جاتی ہے اور نکاح کے قابل بن جاتی ہے تو یہ اُس کی زندگی کا ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔اسلام نے اگرچہ مرد کو گھرانے کا سربراہ بنایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر کام کو اپنی مرضی سے گھر کے افراد پر مسلط کر ے گا۔ کہ چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا ،وہ مختار کل بن کر اپنی من مانی شر وع کرے۔اس مرحلے پر کسی بھی مرد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کی شادی کرائے۔ نکاح میں لڑکی کی مرضی کومدنظر رکھنے کی شریعت نے بہت تاکید کی ہے ۔ ولی ہونے کی حیثیت سے اس کا ایک گونہ ولایت کا حق اگر چہ ضرور بنتا ہے(جیسا کہ ارشاد ہے:":ولی کے اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا"[2]،[3])لیکن اس کایہ مطلب نہیں ہے کہ صرف اُسی کی مرضی چلے گی اور عورت کو اپنے نکاح میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔بلکہ باقاعدہ لڑکی کی مرضی معلوم کی جائی گی اور اُسی ہی کے مشورے پر عمل کیا جائے گا۔شریعت میں تو باکر ہ (غیر شادی شدہ)اور ثیبہ (شادی شدہ)کے مستقل احکام موجود ہیں۔
سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ بیوہ عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے اوربن نکاح عورت کا نکاح بھی اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہ کرام نےپوچھا کہ اے اللہ کے رسول اللہ!بن نکاح عورت اجازت کیونکر دے گی۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اس کی صورت یہ ہے کہ اُس کی خاموشی اس کیاجازت سمجھا جائے گا"[4]

لڑکی کے نکاح سے متعلق اس حدیث میں چند مسائل ذکر کئے گئے ہیں۔
نمبر1:۔ لڑکی کے ولی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔(اس مسئلہ میں احناف کا اختلاف ہے ۔احناف کے نزدیک جب لڑکی بالغ ہو تو وہ اپنا نکاح خود کر سکتی ہے)[5]۔
نمبر2:۔غیر شادی شدہ عورت سے اجازت لینا ضروری ہو تا ہے۔ پھر اس میں ختلاف ہے کہ آیا اُس پر زبردستی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟توجمہور کے نزدیک ولی باپ یا دادا ہو تو وہ زبردستی کر سکتے ہیں۔ لیکن باپ داداکے علاوہ کسی اور کو زبردستی کی اجازت نہیں ۔
نمبر3:۔ غیر شادی شدہ عورت میں چونکہ نسبتاََ حیا زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے نکاح کی اجازت دیتے وقت وہ کچھ کہنے سے جھجھکتی ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر معتبر قرار دی ہے کیونکہ اگر وہ راضی نہ ہوتی تو لازماََ کسی نہ کسی شکل میں احتجاج ریکارڈ کراتی۔
نمبر4:۔شادی شدہ عورت(ثیبہ)پر نکاح کے لیے زبردستی نہیں کی جا سکتی[1]۔

---

[1]بخاری،کتاب العتق،باب العبد اذااحسن عبادة ربہ ونصح سیدہ، رقم2547
[2]سنن ابوداؤد،کتاب النکاح،باب لانکاح الا بولی،رقم:2087
[3]قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج5،ص85
[4]بخاری،کتاب النکاح،باب لا ینکح الاب و غیرہ البکر والثیب الا برضاھا،رقم:5136،مسلم،کتاب النکاح،باب استئذان الثیب فی فی النکاح بالنطق والبکر بالسکوت،رقم:3538
[5]امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک باکرے اور ثیبے دونوں کو اپنی نکاح خود کرنے کا اختیار ہےاس میں ولی کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ وقال ابو حنیفة رحمہ اللہ لا یشترط فی الثیب ولا فی البکر البالغة بل لھا ان تزوج نفسھا بغیر اذن ولیھا۔النووی،ج5،ص123

بہرحال عورت کی زندگی کے اس مرحلے میں شریعت ہر ایسے کام کا انتخاب کرتی ہے جو اُس کے کامیاب اور خوشحال مستقبل کا ضامن ہو۔

تیسرامرحلہ: شادی کے بعد عورت کے شوہر پر کیا حقوق عائدہوتے ہیں اور وہ کس طرح اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے؟۔شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئےجب بیوی کے ساتھ زندگی گزار ی جائے توگھر کا ماحول جنت نظیر بن جاتا ہے۔کیونکہ بیوی شوہر کی زندگی کا ایک اہم جزو بن جا تی ہے تو جب شوہر بیوی کے حقوق ادا کرنے والا ہو تو بیوی اس کی موجودگی اورعدم موجودگی دونوں صورتوں میں شوہر کی وفادار رہتی ہے۔احادیث مبارکہ میں اس حوالے سے بہت ہی خوشنما تعلیمات موجود ہیں چنانچہ عورت سے انتہائی نرم سلوک سے پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے مثلاً

1۔حدیث میں ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا:عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں بھی سب سے زیادہ ٹیڑھا اس کے اوپر کا حصہ ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ ڈالو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی باقی رہ جائے گی اس لیے میں تمہیں عورتوں کے بارے میں اچھے سلوک کی وصیت کرتا ہوں"[2]

عورت کی ترکیب خلقی مرد سے مختلف ہو تی ہے۔ حدیث میں اس طرف اشارہ کرکے اُن کے ساتھ نرمی اور احسان کے سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔عورت کو اللہ تعالی نے ایسی ہیئت میں پیدا کیا ہے جس میں تربیت اولاد، مرد کے مقابلے میں اُن پر نرمی،اور شوہر کی خدمت وغیرہ جیسے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔اُس کی جسمانی اورذہنی ترکیب مرد سے کافی مختلف ہو تی ہے لہٰذا اُن کے ساتھ اُن کی اس حیثیت کے مطابق رواج رکھنا چاہئیے۔

" فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ "کی تفصیل میں علماء فرماتے ہیں۔

"یہاں" بالنساء خیرا "میں اس بات کی طرف اشارہ ہےکہ عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں اعتدال سے کام لینا چاہئیے۔نہ تو اُن کے ساتھ اتنی سختی کی جائے کہ ٹوٹ(بگڑ)جائے اور نہ ہی کھلا چھوٹ دیا جائے کہ مزید بگڑ جائے۔اسی طرف مصنف نے اپنے مابعد کے عبارت" باب قوا أنفسکم وأھلیکم نارا "میں اشارہ کیا ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ نہ تو اُن کو مکمل چوٹ دینی چاہئیے کہ (مزید) گناہوں کاارتکاب کرنے لگیناور فرائض وواجبات چوڑبیٹھیں ۔بلکہ مباحات کے سلسلے میں چشم پوشی اختیار کرنا ہے۔[3]

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں ۔حدیث میں استحباب کے درجے میں یہ بات ہے کہ اس سے تالیف قلب حاصل ہوتا ہے۔اور اس میں عورتوں کے تربیت کاذکر ہے کہ اُن میں موجود خامیوں کے باوجود اُن کو معاف کیا جائیں۔کیونکہ جو شخص اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے گا (یہ تب ممکن ہے جب) اُن کی بشری کمزوریوں سے چشم پوشی اختیار کی جائے۔ انسان(مرد) اُن کے تعاون سے مستغنی نہیں ہو سکتا کیونکہ مرد اپنے معاش میں اُن سے مدد

---

[1] حدیث میں ہے "الایم احق بنفسہا(صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب استئذان الثیب فی النکاح بالنطق،رقم:3541)شوہر دیدہ(عورت اپنے آپ پر اپنے ولی سے زیادہ استحقاق رکھتی ہے)" اس سے واضح ہو تا ہے کہ ثیبہ پر اِکراہ نہیں ہے

[2] بخاری،کتاب أحادیث الأنبیاء.با ب خلق آدم صلوات اللہ علیہ وذریتہ، رقم:3331،مسلم،کتاب الرضاع،باب وصیۃ النساء۔رقم:3719

[3] ابن حجر،فتح الباری،ج9،ص254

گیا ہے۔اور ان سے مدد لینا تب ممکن ہے جب ان کی فطری کمزوریوں سے چشم پوشی اختیارکی جائے"[1][2]

اسی وجہ سے سنت نبوی ﷺ نے شوہر کو بیوی کے ساتھ نیک سلوک کے برتاؤ کا حکم دیا ہے کہ:"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں اور جب تم میں سے کوئی مر جائے تو اسے خیر باد کہہ دو، یعنی اس کی برائیوں کو یاد نہ کرو[3،4]

اسی طرح ایک سفر کا واقعہ ہے کہ :

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامایک سفر میں تھے اور آپ کے ساتھ آپ کا ایک حبشی غلام تھا۔ ان کا نام انجشہ[5]تھا وہ حدی پڑھ رہا تھا (جس کی وجہ سے سواری تیز چلنے لگی)۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا "افسوس »ويحك«اے انجشہ! شیشوں (عورتوں)کے ساتھ آہستہ آہستہ چل"[6]

عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "الْقَوَارِيرِ"کا لفظ استعمال کیا گیاہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنس نازک جسم وطبعیت کی مالک ہوتی ہے لہذا ان کے ساتھ احتیاط سے گزران کرنا چاہئیے۔"الْقَوَارِيرِ"جمع ہے قارورۃ کی ۔شیشے کے معنی میں آتا ہے۔جو کہ انتہائی نازک ہوا کرتاہے۔

اسلام میں عورت کی حیثیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہرحال میں اس کے نفقے،حفاظت اور ضروریات زندگی کی تکمیل مرد ہی کے ذمے لازم ہوتی ہے۔چاہے یہ مرد باپ ہو،بھائی ہو۔بیٹا ہو یا شوہر۔اِن پر عورتوں کے یہ حقوق بطور احسان نہیں بلکہ بطور لزوم عائدہوتے ہیں۔ کیونکہ مرد ہی کو عورت کے لیے "قَوَّام" قرار دیا ہے جیسا کہ پہلے سورۃ النساء کے حوالے سےذکر کیا گیا ہے:

"الرجال قوامون الآیۃ[7]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :

"اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد " الرِّجالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّساءِ " مبتدا خبر ہے۔یعنی مرد عورتوں ہتاکے نان نفقے اور اُن سے تکالیف دور کرنے کا ذمہ دار/قوام ہوتا ہے۔علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد" وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ " سے یہ معنی اخذ کیا ہے کہ جب شوہر بیوی کے نان نفقے سے عاجز ہو جائے تو پھر وہ قوام کے صفت پر باقی نہیں ر ہتا اور جب وہ اس صفت پر باقی نہیں رہا تو بیوی کو فسخ نکاح /عقد کااختیار ہوگا کیونکہ جس مقصد کے لیے نکاح ہواتھا وہ فوت ہوچکا۔اسی طرح اس میں یہ بھی واضح دلیل ہے کہ نان نفقے فراہم نہ کرسکنے کی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیارحاصل ہوتا ہے۔یہی مذہب امام شافعی اور امام مالک رحمہما

---

[1]نفس مصدر

[2]یہ حدیث صحیح ہے ۔الالبانی،صحیح و ضعیف سنن ترمذی،ج8،ص395

[3]سنن تر مذی،کتاب المناقب،باب فضل ازواج النبی ﷺ،رقم:3895

[4]قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج8،ص395

[5]سیدنا انجشہ آپ ﷺ کے کالے غلام صحابی تھے۔کے عورتوں کے ساربان تھے۔بہترین حدی خواں تھے۔الاستیعاب140/1

[6]بخاری،کتاب الادب،با ب ما جآء فی قول الرجل ویلک، رقم:6161،مسلم،کتاب الفضائل،باب فی رحمۃ النبی للنساء وامر السواق مطایاھن بالرفق بھن، رقم:6180

[7]النساء34:4

اللہ کا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اور اگر قرض دار کے پاس قرض ادا کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو (اسے) مال (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)"[1]

نفقہ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلام سے پوچھا:

" میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول! ہمارے اوپر ہماری بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب پہنو یا کماؤ تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو، برا بھلا نہ کہو، اور گھر کے علاوہ اس سے جدائی اختیار نہ کرو"[2]،[3]

عورت کے ساتھ مدارات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک مستقل باب باندھا ہے "باب الْمُدَارَاةِ مَعَ النِّسَاءِ"اور اس میں احادیث بھی لائے ہیں جیسا کہ:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے اور اگر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہو گے تو اس کی ٹیڑھ کے ساتھ ہی فائدہ حاصل کرو گے"[4]

عورت کے احترام اور عزت کی خاطر مرد پربہت ساری پابندیاں لگائی گئی۔جس میں اس کے مارنے سے منع فرمایا گیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح نہ مارے کہ پھر دوسرے دن اس سے ہمبستر ہو گا"[5]

عورت سے متعلق انسانی ضروریات کی رعایت رکھنا بھی اسلام کاخاصہ ہے۔ارشاد نبوی □ ہے:

"عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بیان کیا، انہوں نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عبداللہ! کیا میری یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم)روزانہ(دن میں روزے رکھتے ہو اور رات بھر عبادت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزے بھی رکھو اور بغیر روزے بھی رہو۔ رات میں عبادت بھی کرو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے"[6]

اس بارے میں بعض علماء کے قول کے مطابق "عبادت میں اتنی مشقت نہ اُٹھائی جائے کہ بیوی سے ہمبستری وغیرہ سے عاجز آجائے"[7]۔

سنت نبوی □ نےعورت کی راحت اور تنشیط کے مواقع فراہم کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

---

[1]محمد بن احمد،القرطبی،الجامٔ لاحکام القرآن،ج5،ص169،168،دار الکتب المصیہ،القاہرہ،1384ھ

[2]سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی حق المراۃ علی زوجھا،رقم:2144

[3]قال الاالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داود،ج5،ص142

[4]بخاری،کتاب النکاح،باب المداراۃ مع النساء،رقم"5184

[5]بخاری،کتاب النکاح،باب ما یکرہ من ضرب النساء، رقم:5204

[6]بخاری،کتاب النکاح،باب لزوجک علیک حق، رقم:5199،مسلم،کتاب الصیام،باب النھی عن صوم الدھررقم:2795

[7]یہ ابن بطال رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ مجھے اپنی چادر سے آڑ کئے ہوئے تھے، اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی کہ وہ مسجد میں کھیل رہے تھے، یہاں تک کہ میں خود ہی اکتا گئی، تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ ایک کم سن لڑکی کھیل کود (دیکھنے)کی کتنی حریص ہوتی ہے"[1]

عورت اگر چہ گھر کے کام کاج کرنے والی تو ہوتی ہے لیکن بعض حالات میں شوہر ،اُس کے بچے اور گھر کے دیگر افراد اس کو خدمت پر مجبور نہیں کرسکتے۔بلکہ اگر ہو سکے تو خدمت گا ر عورت رکھ دیا جائے۔تاکہ وہ گھر کے کام کاج میں گھر کی عورت کا سہارابن جائے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی سیدہ اسماء کی روایت سے معلوم ہوتا ہے:

"اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ زبیر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے شادی کی تو ان کے پاس ایک اونٹ اور ان کے گھوڑے کے سوا روئے زمین پر کوئی مال، کوئی غلام، کوئی چیز نہیں تھی۔ میں ہی ان کا گھوڑا چراتی، پانی پلاتی، ان کا ڈول سیتی اور آٹا گوندھتی۔ میں اچھی طرح روٹی نہیں پکا سکتی تھی۔ انصار کی کچھ لڑکیاں میری روٹی پکا جاتی تھیں۔ یہ بڑی سچی اور باوفا عورتیں تھیں۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی وہ زمین جو نبی علیہ السلام نے انہیں دی تھی، اس سے میں اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں گھر لایا کرتی تھی۔ یہ زمین میرے گھر سے دو میل دور تھی۔ ایک روز میں آ رہی تھی اور گٹھلیاں میرے سر پر تھیں کہ راستے میں نبی علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ نبی علیہ السلام کے ساتھ قبیلہ انصار کے کئی آدمی تھے۔آپ علیہ السلام نے مجھے بلایا پھر)اپنے اونٹ کو بٹھانے کے لیے(کہا اخ اخ۔ نبی علیہ السلامچاہتے تھے کہ مجھے اپنی سواری پر اپنے پیچھے سوار کر لیں لیکن مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم آئی اور زبیر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ بڑے ہی باغیرت تھے۔ نبی علیہ السلامبھی سمجھ گئے کہ میں شرم محسوس کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ آگے بڑھ گئے۔ پھر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور ان سے واقعہ کا ذکر کیا کہ نبی علیہ السلامسے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ میرے سر پر گٹھلیاں تھیں اور نبی علیہ السلامکے ساتھ آپ کے چند صحابہ بھی تھے۔ آپ علیہ السلام نے اپنا اونٹ مجھے بٹھانے کے لیے بٹھایا لیکن مجھے اس سے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ اس پر زبیر نے کہا کہ اللہ کی قسم! مجھ کو تو اس سے بڑا رنج ہوا کہ تو گٹھلیاں لانے کے لیے نکلے اگر تو نبی علیہ السلامکے ساتھ سوار ہو جاتی تو اتنی غیرت کی بات نہ تھی)کیونکہ اسماء رضی اللہ عنہا آپ کی سالی اور بھاوج دونوں ہوتی تھیں(اس کے بعد میرے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام میرے پاس بھیج دیا وہ گھوڑے کا سب کام کرنے لگا اور میں بےفکر ہو گئی گویا والد ماجد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے)غلام بھیج کر(مجھ کو آزاد کر دیا"[2]

امام ابوثور رحمہ اللہ کے قول کے بر عکس(کہ ہر حال میں عورت گھر کے کام کاج کی پابند ہے) اس حدیث سے تو یہ بھی معلوم ہو تا ہے کہ بیوی پر شوہر کی خدمت لازمی نہیں ہے بلکہ اس کا یہ حق بنتا ہے کہ اگر ہو سکے تواُس کے لئے خادم رکھ دیا جائے۔اسلام میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ عورت شریعت کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی پابند ہے نہ کہ مرد/شوہر کی خواہش کے مطابق۔اسلام عورت کے حقوق کی بات بھی کرتا ہے اور اُس کے فرائض کی تعلیم بھی دیتا ہے کیونکہ جو اِس کے حقوق ہیں وہ مرد کے فرائض ہوا کرتے ہیں اور جو مرد کے حقوق ہیں وہ عورت کے فرائض ہوتے ہیں۔تو جہاں اسلام مرد /شوہر پر نان

---

[1]مسلم،کتاب صلوۃ العیدین،باب الرخصۃ فی اللعب الذی لامعصیۃ فیہ فی ایام العید،رقم:2101

[2]بخاری،کتاب النکاح ،باب الغیرۃ،رقم:5224

لگنے کے ذمہ داری ڈالی ہے وہی پر عورت/بیوی کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ مرد کے مال،اولاد اور عزت کی حفاظت بھی کرے۔ جیسا کہ پہلے حدیث ذکر کیا گیا یعنی:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں)یعنی عرب کی عورتوں میں(قریش کی صالح، نیک عورتیں ہیں جوبچے پر بچپن میں سب سے زیادہ مہربان اور اپنے شوہر کے مال کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں"[1] پچھلے صفحات میں اس کی تفصیل گزر چکی۔

اور اس بارے میں عورت کا شوہر کی نافرمانی بہت بڑا گناہ ہے۔"عمرو بن حارث بن مصطلق کہتے ہیں :کہا جاتا تھا کہ قیامت کے روز سب سے سخت عذاب دو طرح کے لوگوں کو ہو گا: ایک اس عورت کو جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرے، دوسرے اس امام کو جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں۔"[2]،[3]

شوہر کی اطاعت کے بارے میں تو سنت نبوی میں یہاں تک مذکور ہے کہ اگر شوہر اجازت نہ دےتو وہ نفلی عبادات بھی نہیں کر سکتی،مثلا نفلی روزہ وغیرہ۔اسی طرح اگر وہ اجازت نہ دے توکسی کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر(نفلی)روزہ رکھے اور عورت کسی کو اس کے گھر میں اس کی مرضی کے بغیر آنے کی اجازت نہ دے اور عورت جو کچھ بھی اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی صریح اجازت کے بغیر خرچ کر دے تو اسے بھی اس کا آدھا ثواب ملے گا"[4]

اسی طرح عورت اگر کسی دنیاوی کام میں مشغول بھی ہو اور شوہر اُسے بُلائے تو انکار نہ کرے بلکہ وہ کام ادھورا چھوڑ کر شوہر کے تقاضے کو پورا کر ے۔ ۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا" :جب آدمی اپنی بیوی کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بلائے تو اسے فوراً آنا چاہیئے اگرچہ وہ تنور پر ہو"[5]،[6]

جس طرح عورت/بیوی کے حقوق مرد/شوہر پر لازم ہیں ،بالکل اسی طرح مرد کے حقوق عورت پر لازم ہیں کیونکہ دونوں ایک گاڑی کے دوپہیے ہیں جب تک دونوں کو یکساں مواقع میسر نہ ہوں یہ گاڑی نہیں چل سکتی۔خوشحال اور پُر سکون زندگی تب ممکن ہے جب کسی معاشرے یا کنبے میں ایک فرد امور زندگی کا نگران اور مسؤل ہو جس کی فرمان برداری اور اطاعت اُس معاشرےیا خاندان پر ضروری ہو۔پھر یہ بھی ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہےکہ اُس نگران یا مسؤل میں اہلیت بھی ہو تاکہ کسی اختلاف کی صورت میں وہ مفیدلائحہ عمل اختیار کر سکے۔اسی وجہ سے اسلام نے بڑوں کے ادب،اطاعت اور احترام کا حکم دیا ہے۔

<u>چھوتامرحلہ:</u>اس مرحلے میں عورت ماں کی شکل اختیا ر کرتی ہے۔وقتِ حمل سے لے کر ولادت اورپھر موت تک والدین عموما اورماں خصوصا اولاد کے خاطر بے انتہاء قربانیاں دیتی

---

[1]صحیح بخاری،کتاب النفقات،بابحفظ المرأة زوجها في ذات يده والنفقة،رقم:5365

[2]سنن ترمذی،ابواب الصلوۃ،باب فیمن ام قوما وھم لہ کارھون،رقم:359

[3]قال الالبانی:صحیح الاسناد،صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج1،ص359

[4]بخاری،کتاب النکاح،باب لاتاذن المرءۃ فی بیت زوجہا لاحد الاباذنہ،رقم:5195

[5]سنن ترمذی،کتاب الرضاع،باب حق الزوج علی المرءۃ،رقم:1160

[6] قال الشیخ الالبانی :صحیح،صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج3،ص160

ہے،اس وجہ سے اسلام میں والدین اور خصوصاً ماں کے بڑے حقوق آئے ہیں۔ان کا درجہ سب سے بلند رکھا گیا ہے۔ اولاد کو اُن کے ساتھ احسان کے سلوک کا حکم دیا گیا ہے بلکہ ان کے ساتھ احسان کرنے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کئی دفعہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کرنے کا حکم فرمایا ہے وہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بھی ارشاد فرمایا ہے۔جیسا کہ سورۃ النساء اورسورۃ اسراء میں ارشاد ہے:"وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا"[1]"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی بھی چیز کواس کے ساتھ شریک نہ بناؤ اوروالدین کے ساتھ احسان کرو "

اورارشاد ہے:

> "اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے علاوہ کسی بھی کی پوجا نہ کرو اوروالدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو۔ اگر بڑھاپے تک پہنچ جائیں ان میں سے ایک یا دونوں، تمہارے سامنے تو اُن کو (کے ساتھ اچھے سلوک کے واسطے) اُف تک نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا اور ادب کے ساتھ اُن سے بات کرنا"[2]

اور جب والدین دونوں یا اُ ن میں سے ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے یا کمزور ہو جائے تواُن کی عموما اورماں کی خصوصا رعایت رکھنی چاہئیے کیونکہ باپ کے بنسبت ماں بچوں کے لیے زیادۃ تکالیف اور مشقت اُٹھاتی ہے۔حمل کے وقت کی تکلیف،زچگی،دودھ پلانا،کھلانے پلانے کی خدمت،صفائی کےخیال رکھنے کی ترتیب اورمحبت وشفقت روا رکھنے کا مرحلہ الغرض اولاد کے لیے ماں کی خدمات ناقابل فراموش ہوتی ہیں،ماں کی ان تکالیف سہنے کے خاطر اسلام نے اُن کے ساتھ احسان کا حکم باربار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

> "اور ہم نے انسان کو جسے اُس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اُٹھائے رکھتی ہے (پھر اس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے (اپنے نیز) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی (کہ تم کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے"[3]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

> "اور انسان کو ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا۔ اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں ان کا شکر گزار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے۔ اور میرے لئے میری اولاد

---

[1] النساء36:5
[2] الاسراء23:17
[3] لقمان14:31

میں صلاح (وتقوی) دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور
میں فرمانبرداروں میں سے ہوں"[1]

احادیث مبارکہ میں بھی والدین کے ساتھ عموماًاور والدہ کے ساتھ خصوصا نیک برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے ۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"ابوہریرہرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ ہے"[2]

تشریح میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ علامہ ابن بطال [3] رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ماں کے لیے باپ کے مقابلے میں تین چھوتائی حسن سلوک کرنا چاہئیے کیونکہ ماں حمل،ولادت اور رضاعت کی تکالیف برداشت کرتی ہے۔باپ تربیت میں ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔اسی طرف اللہ جل شانہ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے:

"اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ
کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے
اورآخرکار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے "

یہاں وصیت میں دونوں(ماں باپ)کو ایک درجے میں ذکر فرمایا اور ماں کو اِن تین کاموں(حمل،وضع حمل اور رضاعت) میں خاص طور پر (الگ)ذکر فرمایا"[4]

"امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ۔اس سے مرادیہ ہے کہ ماں بچے کے حسن سلوک کی زیادہ حق دار ہے اور (ماں باپ کے درمیان حقوق کی)مزاحمت کی وقت باپ کے مقابلے میں ماں حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے"[5]

اور امام عیاض [6]رحمہ اللہ کے قول کے مطابق: "جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حسن سلوک میں ماں کامقام باپ سے زیادہ ہے"[7]

سنت نبوی□ والدین کی نافرمانی کو "کبیرہ" سے تعبیر کرتی ہے بلکہ اُسے "اکبر الکبائر" کا نام دیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین

---

[1]الاحقاف 15:46

[2]بخاری،کتاب الادب،باب من احق الناس بحسن الصحبۃ،رقم:5971،مسلم،کتاب البروالصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانهما احق بہ،رقم:6664

[3]علی بن خلف بن بطال،قرطبی،ابن بطال،صحیح بخاری کی شارح ہے۔ابن لجام کے نام سے بھی مشہور ہے۔اہل علم والمعرفۃ میں سے تھے۔علم کے حصول کے لیے اسفار کیے۔مالکی فقہ کے کبار علماء میں سے تھے۔صفر449ھ ک وفات پائے۔(سیر اعلام النبلاء47/18-48)

[4]فتح الباری،ج10،ص402

[5]فتح الباری،ج10،ص402

[6]ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض ہیں۔ اپنے دور میں علم حدیث،نحو،لغت اور ادب کے بڑے امام تھے۔سبتہ کے قاضی رہے ہیں۔ 544ھ/1149ء کو مراکش میں آپ کو زہر دے کر قتل کر دئےگئے۔(تذکرۃ الحفاظ،ج4،ص304۔الزرکلی،الاعلام،ج10،ص374)۔

[7]فتح الباری۔ج10،ص402

کی نافرمانی کرنا۔ نبی علیہ السلام اس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی)سب سے بڑے گناہ ہیں(آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی۔ نبی علیہ السلاماسے مسلسل دہراتے رہے اور میں نے سوچا کہ نبی علیہ السلامخاموش نہیں ہوں گے "[1]

ماں جیسی مقدس ہستی کی تو شان ہی کچھ اور ہے۔جس ذات کے پاؤں تلے جنت ہو وہ کتنی بڑی شان والی ہو گی اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے اصول کتنے پیارے اور نرالے ہوں گے،حدیث سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"مغیرہ بن شعبہرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں)اور باپ(کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،)واجب حقوق کی(ادائیگی نہ کرنا اور)دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر(دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے"[2]

دنیوی ضروریات میں اہم ضرورت نفقہ کی ہوتی ہے اس وجہ سے اسلام نے ماں کے خرچے کی ذمے داری (بالغ)بیٹوں پر رکھ دی ہے۔روایت میں آتا ہے کہ:" ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور والد بھی ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے ،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ”تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کا ہے)یعنی ان کی خبرگیری تجھ پر لازم ہے(تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"[3]،[4]

حدیث میں جس طرح والد کے نفقے کا ذکر ہے بالکل اس طرح حکم ماں کے نفقے کا بھی ہے۔ظاہر ہے جب تک والد(بیوی کا شوہر) زندہ ہو اوراُس کے پاس مال ہو تو اپنی بیوی کا نفقہ اُس پرواجب ہے اور جب وہ بوڑھا ہو جائے اور اُس کے ساتھ مال نہ ہو یافوت ہو جائے تو پھر نفقہ بے شک بیٹے کے ذمے ہے۔

ایک حدیث میں تو صراحۃً ماں کے نفقے کا حکم دیاگیا ہے۔ایک صحابی رضی اللہ عنہ[5]فرماتے ہیں کہ:" ہم مدینہ آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ نبی علیہ السلاممنبر پر کھڑے خطبہ دے رہے ہیں آپ فرما رہے ہیں: دینے والے کا ہاتھ اوپر والا ہے، اور پہلے انہیں دو جن کی کفالت و نگہداشت کی ذمہ داری تم پر ہو: پہلے اپنی ماں کو، پھر اپنے باپ کو، پھر اپنی بہن کو، پھر اپنے بھائی کو، پھر اپنے قریبی کو، پھر اس کے بعد کے قریبی کو۔"[6]"[7]

ماں کے نفقے کی اہمیت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو جہاد جیسے اہم فریضے سے ماں کی خدمت کے واسطے روک دیا تھا۔اور فرمایا تھا کہ جنت چاہتے ہو تو وہ تمہارے ماں کے قدموں تلے ہے۔نسائی کی روایت ہے کہ:

---

[1]بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدینمنالكبائر ،رقم:5976،مسلم،کتابالإیمان،باببیانالكبائرو أكبرها،رقم:269

[2]بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدینمنالكبائر ،رقم:5975،مسلم،کتابالإیمان،باببیانالكبائرو أكبرها، رقم:4580

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم3532

[4]قال الالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص30

[5]یہ صحابی سیدنا طارق المحاربی رضی اللہ عنہ تھے۔" سنن نسائی،کتاب الزکوۃ،باب ایتهما الید العلیا،رقم:2532"

[6]سنن نسائی،کتاب الزکوۃ،باب ایتهما الید العلیا،رقم:2532

[7]عندالالبانی یہ حدیث ہےصحیح،صحیح وضعیف سنن نسائی،ج6،ص176

جاہمہ[1] رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اور آپ کے پاس آپ سے مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے)ان سے(پوچھا: کیا تمہاری ماں موجود ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، آپ نے فرمایا" :انہیں کی خدمت میں لگے رہو، کیونکہ جنت ان کے دونوں قدموں کے نیچے ہے"[2]،[3]

ان معدودے چند احادیث سے عورت/بیوی/ماں کے حقوق اور اُن کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہےسنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے ذخیرے میں اس کے علاوہ بے شمار تعلیمات اِن کے حقوق کے بارے میں موجود ہیں۔عورت چونکہ جسمانی اور ذہنی طور پر مرد سے کمزور ہوتی ہے اس وجہ سے ہر مشکل ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے اورعورت کو گھر کی ملکے کی حیثیت دے کر آرام اور سکون کی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کئے ۔ عورت کی ضروریات زندگی کی تمام صورتیں اور اُن کی رعایت رکھنا بھی مرد کے فرائض میں داخل ہیں۔قرآن وحدیث میں ان کے بارے میں جو تعلیمات موجود ہیں اُن کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

1۔ان کے حقوق کی ادائیگی لازمی ہیں۔یہ اُن پر کوئی احسان نہیں ہے۔

2۔ان کے یہ حقوق اپنی اصل میں واقعیت رکھتے ہیں یہ کوئی خیالی تصورات نہیں ۔

3۔عورتوں کے یہ حقوق شریعت اسلامی کی خصوصیات میں سے ہیں دنیا کا کوئی مذہب یا قانون اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتا۔

4۔یہ حقوق ان کی زندگی کے تمام مراحل پر حاوی ہیں۔ یعنی ان کی ہر حیثیت کے متعلق ہیں ،ان کی جسمانی حیثیت ہویا نفسانی۔زندگی کے ہر لمحے کے لیے ہیں،

5۔اپنے ان حقوق کا وہ خود مطالبہ کر سکتی ہیں اور اگر کوئی رکاوٹ آجائے تو عدالت سے رجوع کرکے بزور قانون یہ حقوق حاصل کر سکتی ہیں۔

6۔اِنہیں حقوق کی ادائیگی ہی سے معاشرہ کی بقا ممکن ہے کیونکہ یہ حقوق صرف اُن کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ پورے معاشرے کے لیے مفید ہیں۔

جب تک انہی اصولوں پر معاشرہ کاربند رہا،زندگی پُرامن، خوشحال اور پُرسکون رہی جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور صالحین اُمّت کے مختلف زمانوں میں دنیا نے دیکھا۔اپنے حقوق وفرائض کا اہتمام کرکے انہوں نے زندگی کا لطف اٹھایا تھا۔

اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں مسلمان عورت عالمہ اورمعلمہ بھی نظر آتی ہے جس کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے مرد وعورت سب آتے تھے۔بلکہ اللہ تعالی نے اُن میں ایسی عورتیں بھی پیدا فرمائی جن کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے امّت کے کبار علماء بھی تشریف لاتے تھے جیسا کہ سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہمارسامنے ہے۔اس بات پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عالمہ پیدا نہیں ہوئی ۔صحابہ اور تابعین جیسے جلیل القدر حضرات اُن سے دینی مسائل پوچھنے آتے تھے[4]۔

---

[1]جاھمہ بن عباس بن مرداس السلمی، جلیل القدر صحابی ہے۔ غزوہ خندق میں شریک ہوئے ہے،اسی حدیث کے وجہ سے مشہور ہوئے۔الاصابہ،ج1ص 446

[2]سنن نسائی،کتاب الجھاد،باب الرخصۃ فی التخلف لمن لہ والدۃ،رقم:3104

[3]البانی کے نزدیک یہحدیث صحیح ہے۔"صحیح وضعیف سنن نسائی،ج7،ص176

[4]الاصابہ،ج8،ص17،18

اسی طرح میدان جہاد میں بھی اپنی ہی مرضی سے مسلمان عورت کسی سے پیچھے نہیں رہی ۔زخمیوں کی مرہم پٹی،اُن کی تیمارداری حتٰی کہ تلوار اٹھانے اور چلانے کے واقعات بھی تاریخ کا حصہ بن کر ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئے ہیں۔اس موقع پر انہوں نے ہر قسم کے حالات سے بے نیاز ہوکر اپنی خدمات پیش کی ہیں۔سیدہ ام عمارہ[1] رضی اللہ عنہا وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں۔جو غزوہ احد ،حدیبیہ،خیبر اور جنگ یمامہ میں شریک ہوئیں حتّٰی کہ جنگ یمامہ میں اُن کے ہاتھ مبارک بھی شہید ہوئے[2]۔

صحابیات کے بعد کے ادوار میں بھی دنیائے اسلام میں ایسی عورتیں آئیں جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دئیے۔دعوت،تعلیم وتعلم اورجہاد جیسے شعبے میں اُن کی شرکت آج بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

ایک نیک اور صالح عورت معاشرے کے لیے وہ کچھ کر سکتی ہے جو کہ بعض مرد بھی نہیں کر سکتا۔دنیائے اسلام میں صالح ماں کی تربیت کی بدولت ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جن سے دنیا کی ایک کثیر تعداد نے فیض حاصل کیا،ہزاروں لوگوں نے اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔لاکھوں کی تعداد میں اُن کے شاگرد پیدا ہوئے۔ذیل میں ہم چند اہم شخصیات کا تذکرہ کرتے ہیں مثلاً:

1۔**امام شافعی رحمہ اللہ:** ان کا اصل نام محمدبنادریس بن العباس بن عثمان بن شافع بن السائب ،الہاشمی،الشافعي رحمہ اللہ ہے۔فقہ اور حدیث کے امام گزرے ہیں۔اِن کے والد اس وقت وفات پاگئے تھے جب یہ چھوٹے تھے ان کی والدہ ماجدہ نے ان کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا کہ وقت کے امام بن گئے[3]۔

2۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ: ان کا نام ابو عبداللہ احمد بن محمدبن حنبل،الذھلی،الشیبانی،المروزی،البغدادی رحمہ اللہ ہے۔فقہ کے امام تھے لاکھوں کی تعداد میں آج بھی اُن کے متبعین دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔یہ بھی یتیم تھے والدہ ہی کی اچھی تر بیت نے اُن سے اپنے وقت کا امام بنا دیا[4]۔

ان کے علاوہ بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جس میں کسی عورت کی صحیح اور شرعی تربیت کی وجہ سے اُن کی اولاد میں ایسی شخصیات پیدا ہوئیں، جن سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔آج بھی اگر نبی علیہ السلام کی تعلیمات کے مطابق معاشرے کو چلانے کی کوشش کی جائے تو اُنہیں خطوط پر معاشرہ بہتری کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔

جب معاشرہ اسلامی تعلیمات اور اسوہ نبوی سے دور ہو رہ کر رہ گیا تو اُس میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں آگئیں۔اِن اعلیٰ اسلامی حقوق کے مقابلے میں جب عورت کو آزادی کے پُرفریب نعرے میں پھنسا دیا گیا تو وہ اسلام کے مقابل کھڑی ہوگئی۔اگر غور کیا جائے تو یہ اُن کے حقوق کا نہیں بلکہ اُن کے خرید وفروخت

---

[1]نسیبہ بنت کعب،انصاریہ،بنو نجا ر سے تعلق رکھنی والی صحابیہ ہے۔بیعت عقبہ ثانیہ میں اسلام لائیں۔الاصابہ،ج8،ص180

[2]نفس مصدر

[3]محمد بن احمد،الذھبی،سیراعلام النبلاء،ج10،ص6

[4]سیراعلام النبلاء ،ج11،ص179

کا ایک غیر محسوس کاروبار شروع کیا گیا ہے۔مغربی دنیا کے اس پر فریب نعرے میں آکر عورت نے اپنا مقام بھلا دیا ہے جو اُسے اسلام اور سنت نبوی نے دیا تھا۔جاہلیت کے زمانے کے ظلم اور زیادتی کو نئی شکل دے کر عورت کو ایک بار پھر ظلم وبربریت کے اندھیروں میں دھکیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

فصل سوم

[1]عام طور پر اس سے مراد برطانیہ،فرانس،نیدر لینڈ،بلجیم،لکسمبرگ،جرمنی،اطالیہ،آئرلینڈ،ڈنمارک،ناروے،سویڈن،فن لینڈ،آسٹریا،پرتگال،یونان،ویٹی کن سٹی۔موناکو،انڈورا،مالٹا وغیرہ کے ممالک ہوتے ہیں۔https://ur.wikipedia.org/wiki/

جوانوں، عمررسیدہ(بوڑھ وں) اور بزرگوں کے سماجی حقوق

جوانی زندگی کا اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے۔عربی میں جوان کو "شاب"اور جوانی کو "شباب"کہا جاتاہے۔اس کے مقابل"شیب"ہے جو بڑھاپے کے ناموں میں سے ایک ہے۔جوانی بلوغت سے شروع ہوتی ہے اوربڑھاپے کی شروع ہونے تک رہتی ہے۔ایک قول کے مطابق جوانی سترہ سال سے اکیاون سال تک کے زمانے کو کہا جاتا ہے۔اُس کے بعد موت تک کے زمانے کو بُڑھاپا کہا جاتا ہے[1]۔

کسی نے بلوغت سے تیس سال تک کا زمانہ اور کسی نےسولہ سال کے بعد سے بتیس سال تک کا زمانہ جوانی کا بتایا ہے۔[2]"

جوانی کی عمرابتداءً ناتجربہ کاری کی ہوتی ہے۔احساس ذمہ داری زیادہ نہیں ہوتی اور طاقت کا بے جا استعمال ہوتا ہے۔اس وجہ سے سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نے اسی مرحلے کے لیے خصوصی ہدایات عطاء فرمائیں۔تاکہ درجہ ذیل مراحل میں کسی کو کوئی دنیوی واخروی نقصان نہ پہنچے۔

*:انسانی زندگی کا یہ مرحلہ قوت اور طاقت کا ہوتاہے۔بچپن اور بڑھاپے کے نسبت جوانی میں اپنی قوت وطاقت کے بل بوتے پرشجاعت زیادہ ہوتی ہے۔

---

[1] یہ ابو جعفر محمد بن حبیب البغدادی،نحوی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ [محمد بن محمد،الزبیدی،تاج العروس من جواھر القاموس،ج3،ص92،دارالھدایہ]

[2] نفس مصدر

*:جوانی کے جوش میں انسانی خواہشات بہت زیادہ انگڑالیاں لیتی ہیں ۔یہ اُس کی زندگی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ مخالف جنس کوایک مختلف انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتاہے ۔

*:سمجھ،تجربے اور احتیاط کی کمی ہوتی ہے جس کے وجہ سے بعض اوقات مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

*:اپنی طاقت اور قوت کے ذریعے وہ ہر جائزناجائز طریقے سے اپنے لیےسہولت اورآسودگی کا ماحول پیداکرنے کی کوشش کرتا ہے۔
اس وجہ سے اِ س مرحلے میں جوانوں کو انتہائی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔تاکہ اُن کی استعداد وصلاحیت کو مفید طریقے سے استعمال کیا جا سکے۔
ان بنیادی اصول کی روشنی میں اُن کی تربیت کیسے کی جائے؟اُن کو پنپنےاور آگے بڑھنے کی طرف کیسے لے جایا جائے اس سلسلے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں ۔

مرحلہ 1:-انسان کے پاس ابتداءً (جوانی کے ابتدائی ایام میں)معلومات انتہائی کم ہوتی ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے اُ ن کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دینی چاہئیے۔جس کے لیے ایک نیک اور صالح شخصیت اور اعلٰی نتائج کے حامل تجرباتی مثالوں سے استفادے کی ضرورت ہوتی ہے۔جس کے نتیجے میں اُس کی صحیح تعلیم و تربیت ہو جاتی ہے۔

مرحلہ2:-نو جوانی میں چونکہ عام طور پر احتیاط کی کمی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسرے مرحلے پر اُن سے اُن کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا جائے ۔اس سے ایک تو ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہوجائے گی اور دوسرے اُن میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہوجائے گی کہ آئندہ کے لیے وہ اپنے چھوٹوں سے اُن کی کارکردگی کےبارے میں پوچھ گچھ کرسکے۔

مرحلہ3:-بزرگوں کے ذمے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جوانوں کی شہوات نفسانیہ کا خیال بھی رکھے اور اس بارے میں اُن پر پابندیاں عائد کرکے باقاعدہ ان کی نگرانی کرے تاکہ وہ کسی ایسے کام کا ارتکاب نہ کر بیٹھے جو اُن کے لیے نقصان دہ ہو ۔

اسلام نے جوانی کی زندگی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس کے بارے میں اصول بیان کئے ہیں۔جن پر عمل کرکے وہ زندگی میں درپیش مشکلات کے اُٹھانے اوراُس کے مضرات سے بچنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرے۔سورۃ کھف میں اسی طرف اشارہ موجود ہے۔جوانوں کی اُس جماعت نے اپنی بہادری کے بل بوتے اپنی کافر قوم اور زیب وزینت کی زندگی سے بغاوت کرکے اپنے عقیدے کی حفاظت کے خاطرپہاڑوں میں جاکر پناہ لی جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

> " کیا خیال کرتے ہو تم کہ لوح اور غار والے ہمارے نشانیوں میں سے عجیب تھے۔ جب وہ جوان غار میں جا رہے تو کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما۔ اور ہمارے کام درستی (کے سامان) مہیا کر ۔ تو ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ پھر ان کو جگا اُٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدّت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے کس (بندے) کواچھی طرح اس کی مقدار یاد ہے۔تم سے ہم ٹھیک

کہف ان کے حالات بیان کرتے ہیں۔ وہ کئی جوان تھے جو
اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت
دی تھی"[1]

قُرآن کریم کا "جوانوں کی اہمیت " کی خاطرخصوصی خطاب اور جوانوں میں اُن صفات کے پیدا کرنے کی بھی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔جیسا کہ سیدنالقمان [2]کے اپنے بیٹے کونصیحت سے معلوم ہوتا ہے :

"اور یاد کرو وہ وقت جب سیدنا لقمان علیہ السلام نے نصیحت کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو کہا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا۔ شرک تو بڑا ظلم ہے"[3]

اور اللہ تعالٰی نے سیدنا لقمان کی زبان سے فرمایا:

" بیٹا اگر کوئی عملرائی کے دانے کے برابر بھی ہو اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں میں یا زمین میں۔ اللہ اُس کو قیامت کے دن لاموجود کرے گا۔ بےشک اللہباریک بین (اور) خبردار ہے۔بیٹا نماز کی پابندی رکھنا اور اچھے کاموں کے کرنے کا حکم اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔اور لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین پر تکبر سے نہ چلنا۔ کہ اللہ کسی تکبر کرنے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور آواز نیچی رکھنا کیونکہگدھوں کی آواز سب آوازوں سے بُری ہے"[4]

اس میں سب سے پہلے جس بات کا حکم دیا گیا ہے۔وہ اللہ کی وحدانیت ہے۔کہ جب عقیدہ توحید دل میں راسخ ہو جائے تو پھر بندہ ہر وہ کام کرتا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق ہو اور ہر وہ بات چھوڑ دیتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہو۔عقیدہ توحید انسان کو ہر قسم کے فکری اور عقلی خرافات سے بچاتا ہے۔

دوسری بات جو اِن آیات سے معلوم ہوتی ہےوہ ہر قسم کی عبادات کے بارے میں ہے۔

تیسری یہ بات ہوئی کہ عقیدہ توحید کے ماننے کا سبب اوامر کاارتکاب اور نواہی سے اجتناب کاذکر ہے ۔جس میں صبر اور حسن اخلاق سے کام لینا ضروری ہو گا۔جیسا کہ قرآن مجید میں نوجوان کے لیے ایک بہترین اور بے مثل مثال بیان کیا گیا ہے۔جس میں اس جوان کے صبر ،عفت،اپنے مقصد حیات کا پاس رکھنا اورباوجود قدرت کے عورتِ مائلہ سے اجتناب وغیر ہ بیان کئے گئیں ہیں ۔جیسا کہ قُرآن کریم میں سورۃ یوسف میں ہے:

"تو جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کرکے کہنے لگی (یوسف) جلدی آؤ۔ انہوں نے کہا کہ اللہ پناہ میں رکھےتو میرے آقا ہیں انہوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے۔ بےشک ظالم

---

[1] الکھف18: 9،10،11،12،13

[2] لقمان ایک بڑی ہونٹوں والابڑی نتھنوں والا حبشی غلام تھے۔سیدناداؤد علیہ السلام کے دور میں پیدا ہوئے۔انتہائی نیک انسان تھے۔اللہ تعالیٰ نے حکمت ودانش کے بے پناہ خوبیوں سے نوازا تھا۔اس لیے حکیم کے نام سے مشہور ہوئے۔لمبی عمر پائی۔سیدنا یونس علیہ السلام کے دور میں وفات پاگئے تھے۔البدایہ والنہایہ174/2،جامع البیان135/20

[3] لقمان13:31

[4] لقمان 19/16:31

انہوں نے اس کا قصد کیا۔ اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے یوں اس لیے کہ ہم ان سے برائی اور بےحیائی کو روک دیں۔ بےشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے"[1]

احادیث مبارکہ میں بھی زندگی کے اس مرحلے کے لیے واضح اورکامیاب اصول اوراحکامات موجود ہیں جس سے اپنی طاقت وبساط کے مطابق استفادہ کرکے کامیاب زندگی کی ضمانت ملتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے میں جوان اُس معاشرے میں اسلحہ کا کردار ادا کرتے ہیں، اگر یہ اسلحہ اپنی دفاع،حفاظت،ترقی اورہدف حاصل کرنے کے لیے استعمال ہو اتو فائدہ ہی فائدہ ہے اور اگر اس کے برعکس استعمال ہو ا تو اپنے لیے بھی تباہی اورمعاشرے کے لیے بھی بربادی کا سبب ہے۔اگرقوم کا نوجوان طبقہ بامقصد زندگی گزارے تو دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی کے بھی مستحق بن جاتے ہیں۔آج پوری دنیا کی مثال ہمارے سامنے ہے جس ملک کا نوجوان مثبت سرگرمیوں میں مصروف رہتےہیں وہ دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں یا طاقت کے بل بوتے اور یااپنے پیداوار کے ذریعے۔اور جو نوجوان اپنے اوقات بھول کرفضول،عبث،لہو ولعب اور اس جیسے دیگر منفی سرگرمیوں میں ملوث نظر آتے ہیں جہالت،غربت،بدامنی اور بے حیائی اس معاشرے کامقدر بن جاتا ہے۔

اسلام اِس حساس اور اہم طبقے کی راہ نمائی کے لیےبہت سارےہدایات دیتا ہےجس میں چند یہ ہیں۔

<u>نوجوانوں کی تربیت اوراصلاح کا انتظام:</u>کسی بھی انسان کی صحیح اور بروقت تربیت اُس کے مستقبل کی زندگی پر انتہائی اثر انداز ہوتی ہے۔اسلام دور شباب میں نوجوان کے ہر لحاظ سے اصلاح چاہتا ہے۔تا کہ مستقبل میں وہ عقیدے،اخلاق اوررہن سہن کے لحاظ سے وہ ایک کامل شخصیت بن کر معاشرے کا ایک مفید فرد بن جائے۔

اسلام سب سے پہلے عقیدے کی اصلاح چاہتا ہے ۔اس وجہ اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ پہلے نوجوان میں صحیح عقیدے کی بنیاد رکھی جائے جس پر وہ اللہ تعالی سے دنیا وآخرت میں اجر کا یقین رکھتا ہو پھر اگر کسی دینی معاملے میں کوئی تکلیف اور مشقت پیش آجائے تو اُسے برداشت کر سکے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے:

" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا ”سات آدمی ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عرش کے نیچے سایہ دے گا جبکہ اس کے عرش کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ عادل حاکم، نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں جوانی پائی، ایسا شخص جس نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے، وہ آدمی جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں، وہ شخص جسے کسی بلند مرتبہ اور خوبصورت عورت نے اپنی طرف بلایا اور اس نے جواب دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ شخص جس نے اتنا پوشیدہ صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ دائیں نے کتنا اور کیا صدقہ کیا ہے؟"[2]

" وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ "سے مذکورہ قول کی تائید ہوتی ہے۔یعنی عقیدے کی اصلاح سب سے اہم ترین عمل ہے۔اسی طرح کسی اونچے مرتبے رکھنے والی عورت کی طرف سے دعوت گناہ قبول نہ کرنا بھی "جوانوں"کے بارے آیا ہے یہ حکم عام ہے چاہے جوان

---

[1]یوسف 12: 24/23

[2]بخاری،کتاب الزکوۃ،باب الصدقۃ بالیمین،رقم:660،صحیح مسلم،کتاب الزکوۃ،باب فضل اخفاء الصدقۃ،رقم:2427

ہو یا بوڑھا کسی بھی حالت میں بدکاری کا ارتکاب جرم ہوتا ہے لیکن جوانی میں اس فعل کے ارتکاب کا غالب گمان ہوتا ہے۔اس وجہ سے " شَابٌّ " کی خصوصیت شاید اسی وجہ سے ہو ۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک دن نبی علیہ السلامکے ساتھ سواری پر پیچھے تھا، آپ نے فرمایا" :اے لڑکے! بیشک میں تمہیں چند اہم باتیں بتلا رہا ہوں: تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تو اللہ کے حقوق کا خیال رکھو اسے تم اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم کوئی چیز مانگو تو صرف اللہ سے مانگو، جب تو مدد چاہو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو، اور یہ بات جان لو کہ اگر ساری امت بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے اور (تقدیر کے)صحیفے خشک ہو گئے ہیں"[1]"[2]

یہ حدیث تونو جوانوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ایک مکمل ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ:

(الف):حکم کے لحاظ سے توحدیث عام ہے لیکن خاص توجہ نوجوانوں کی طرف ہے کیونکہ لفظ" یا غلام "کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے۔

(ب):" احفظ اللہ یحفظك "کے مختصر الفاظ میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔کیونکہ اس میں عبادات پر محافظت،اللہ کی اطاعت پر دوام اورگناہوں سے اجتناب وغیرہ سب کچھ داخل ہیں۔

(ج):نوجوانی میں عزت ،کرامت اور قوت نفس پیدا کرنے والی ذات سے تعلق جوڑنے کے لیے" إذا سألت فاسأل اللہ "فرمایا۔کیونکہ اللہ تعالی ہی تن تنہا وہ ذات ہے جوسب کچھ دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے۔

(د):نوجوانوں سے تقدیر پر ایمان اور یقین رکھنے کی تلقین کی گئی ہےکہ ہرخیر اور شر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرف اس قول میں اشارہ ہے:جان لو کہ اگر ساری مخلوق جمع ہو کر تجھے نفع پہنچانے کی کوشش کرے تو نہیں پہنچا سکتی تمہیں صرف وہ نفع پہنچی گی جو اللہ کی طرف سے مقرر ہواسی طرح اگر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تواللہ کے مقرر کردہ نقصان کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی"

اخلاقی آداب سکھانا:اسلام انسان کی اخلاقی صفت کو انتہائی اہمیت دیتا ہے ۔نبی علیہ السلام نوجوانوں کی تعلیم ،آداب اور اچھی عادات کے بارے میں انتہائی تاکیدفرماتے تھے ۔خود بھی اس کا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ اُن آداب واخلاق میں سےایک ادب کھانے پینے کے متعلق ہے۔اجتماعی کھانے کے ادب کے بارے میں ایک صحابی [3]رسول ﷺ سے مروی ہے:

"میں بچہ تھا اور نبی علیہ السلامکی پرورش میں تھا اور)کھاتے وقت(میرا ہاتھ برتن میں چاروں طرف گھوما کرتا۔ اس

---

[1]ترمذی،کتاب،باب،رقم:2516

[2]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج6،ص16

[3]اُس صحابی کا اسم مبارک سیدناعمر بن ابی سلمۃ رضی اللہ عنہ تھے۔صحیح بخاری،کتاب الاطعمۃ،باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین،رقم:5376

لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹے! بسم اللہ پڑھ لیا کرو، داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور برتن میں وہاں سے کھایا کرو جو جگہ تجھ سے نزدیک ہو۔ چنانچہ اس کے بعد میں ہمیشہ اسی ہدایت کے مطابق کھاتا رہا"[1]

اس حدیث سے چند مسائل نکلتے ہیں۔

1۔کھانے کی شروع میں اللہ کا نام لینا چاہئیے۔

2۔شیطان سے پناہ مانگنی چاہئیے۔

3۔اللہ کے نام سے شروع کرنے اور شیطان سے پناہ مانگنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمان ہر حال میں اللہ کی عبادت سے غافل نہیں رہے گا۔بھوک کے ستائے ہوئے انسان کو بھی یہ حکم ہے کہ کہیں بھوک تجھے اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دے اور یہ کہ وہ کھانا اس طریقے سے کھائے کہ اُس کی بھوک مٹ جانے کے ساتھ ساتھ وہ عبادت بھی بن جائے گی۔اور کھانے میں برکت بھی آجائے گی۔جو اُس کے بدن کاحصہ بن کر اسے عبادات پر ابھارے۔نفس کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور شیطانی وسوسوں سے بھی حفاظت ہو جائے۔

4۔کھانا دائیں ہاتھ سے کھانا چاہئیے۔کیونکہ ہاتھ کھانے کا آلہ ہوتا ہے اور بایاں ہاتھ عموما استنجا،ناک کان کی صفائی وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس وجہ سے ایک سلیم الطبع انسان اُس ہاتھ سے کھانا کھانے کو پسند نہیں کرے گا۔

5۔اسی طرح کھانا صرف ایک ہاتھ سے کھانا چاہئیے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت کھانا اخلاقی اقدار کے منافی ہے۔

6۔کھانے کے طرح پینا،کسی کو کوئی چیز دینا،لینا اورمصافحہ کرنا وغیرہ بھی دائیں ہاتھ سے کرنے کا حکم ہے۔

7۔ مشترکہ طور پر کھانے کے موقع پر اپنے سامنے سے کھانا چاہئیے۔کیونکہ اس میں حرص،طمع اوردوسروں کو ایذا رسانی سے بچاؤ ہے۔

<u>بڑوں کا احترام سکھانا:</u>اسلام صرف چندگنے چنے اخلاقی اقدارکا نام نہیں ، بلکہ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ہدایات موجود ہیں ۔عقائد ہو،عبادات ہو،معاملات ہو یا اخلاقیات ،اسلام تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے احکامات دیتا ہے ۔اخلاقیات میں بڑوں کا ادب واحترام بھی شامل ہے۔ سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نوجوانوں کو اس پہلو سے روشناس کرانا بڑوں کے فرائض میں شمار کرتا ہے۔بات چیت اور گفتگو میں بھی اُن کا لحاظ رکھنا چاہئیے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے:

" عبداللہ بن سہل [2]اور محیصہ بن مسعود [3] رضی اللہ عنہما خیبر گئے۔ ان دنونصلح تھی۔ پھر دونوں حضراتجدا ہو گئے۔ اس کے بعد محیصہ رضی اللہ عنہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ خون میں لوٹ رہے ہیں۔ کسی نے ان کو قتل کر ڈالا، خیر محیصہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دفن کر دیا۔ پھر مدینہ آئے، اس کے بعد

---

[1]نفس مصدر

[2]عبداللہ بن سہل،الانصاری،الحارثی رضی اللہ عنہ۔غزوہ خیبر کے موقع پر کسی نے انہیں شہید کیا۔جس کے لیےآپ ﷺ نے قسامت فرمائی۔سیدنا عبدالرحمن بن سہل رضی اللہ عنہ کے بھائی اور سیدناحویصہ ومحیصہ کے بھتیجے تھے۔الاستیعاب924/3

[3]محيصة بن مسعود بن كعب بن عامر بن عدي بن مجدعة، أبو سعد ،خزرجي ،مزني، سیدنا حویصة رضی اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔انہی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔محیصہ رضی اللہ عنیہ نجیب الطرفین تھے۔ان کی ماں إدام بنت الجموح بن زيد بن حرام، بني سلمة سے تعلق رکھتی تھی۔یہ خیبر میں سفیر کے حیثیت سے گئے تھے۔نبی علیہ السلام نے اُنہیں خیبر کے مال سے تیس وسق دئے تھے۔اِن کے اولاد کا سلسلہ کافی چلا تھا۔(اکمال تهذيب الكمال،ج11،ص104)

عبدالرحمن بن سہل اور مسعود کے دونوں صاحبزادے محیصہ اور حویصہ نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے، گفتگو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے شروع کی، تو آپعلیہ السلام نے فرمایا، کہ جو تم لوگوں میں عمر میں بڑے ہوں وہ بات کریں۔ عبدالرحمٰن سب سے کم عمر تھے، وہ چپ ہو گئے۔ اور محیصہ اور حویصہ نے بات شروع کی۔ آپ نے دریافت کیا، کیا تم لوگ اس پر قسم کھا سکتے ہو، کہ جس شخص کو تم قاتل کہہ رہے ہو اس پر تمہارا حق ثابت ہو سکے۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم ایک ایسے معاملے میں کس طرح قسم کھا سکتے ہیں جس کو ہم نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ آپ علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر کیا یہود تمہارے دعوے سے اپنی برات اپنی طرف سے پچاس قسمیں کھا کر کے کر دیں؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ کفار کی قسموں کا ہم کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپعلیہ السلام نے خود اپنے پاس سے ان کو دیت ادا کر دی"[1]

اس حدیث میں" كَبِّرْ كَبِّرْ "(جو عمر میں بڑے ہوں وہ بات کریں) سے مراد یہ ہے کہ جو عمر میں بڑا ہو اُس کی موجودگی میں اُس کے احترام کی خاطر چھوٹے کو بات کرنے میں پہل نہیں کرنی چاہئیے۔اگرچہ وہ بات کتنی ہی اہم کیو ں نہ ہو۔کیونکہ یہاں سیدنا عبدالرحمان رضی اللہ عنہ اپنے مقتول بھائی کے قتل کے باب میں پوچھ رہے تھےپھر بھی نبی علیہ السلام نے اُنہیں بڑوں کے احترام سکھانے کے خاطر چپ رہنے کا ارشاد فرمارہے ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ:

"ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ (خواب میں)مسواک کر رہا ہوں تو میرے پاس دو آدمی آئے۔ ایک ان میں سے دوسرے سے بڑا تھا، تو میں نے چھوٹے کو مسواک دے دی پھر مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو دو۔ تب میں نے ان میں سے بڑے کو دی"[2]

اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:"نبی علیہ السلاممسواک کر رہے تھے، آپ علیہ السلامکے پاس دو آدمی تھے، ان میں ایک دوسرے سے عمر میں بڑا تھا، اسی وقت اللہ نے مسواک کی فضیلت میں آپ علیہ السلامپر وحی نازل فرمائی اور حکم ہوا کہ آپ اپنی مسواک ان دونوں میں سے بڑے کو دے دیجئیے۔[3]،[4]

" كَبِّرْ " کامعنی یہ ہے بڑے کو پہلےکرو اور اُس کی عزت کرو۔اس حدیث سے یہ فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں کہ مجلس میں بڑوں کی موجودگی میں چھوٹوں سے اُن کاحق پہلے ہے ۔اور پہل بھی اُن سے کرنی چاہئیے۔اور سنت طریقہ بھی یہی ہے کہ سلام،دعا،پینے کی چیزوں اور خوشبو وغیرہ میں پہل بڑوں سے کرنی چاہئیے[5]۔

جسمانی(بدنی) تربیت کرنا:اسلام نوجوانوں کے لئے صحت مند ماحول کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ہروہ تربیت جس میں بدن کو قوت ملے،بدن میں چستی پیدا کرے اور بدن میں مضبوطی لائے ایک نوجوان کو وہ سب اسباب اختیار کرنے چاہئیے جو مذکورہ صفات پیدا

---

[1]صحیح بخاری،کتاب الجزیۃ والموادعۃ،باب الموادعۃ والمصالحۃ مع المشرکین بالمال وغیرہ،واثم من لم یف بالعھد،رقم:3173،

[2]صحیح بخاری،کتاب الوضوء،باب دفع السواک الی الاکبر،رقم:246،صحیح مسلم،کتاب الرؤیا،باب رؤیا النبی ،رقم:6071

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الطھارۃ،باب فی الرجل یستاک بسواک غیرہ،رقم:50

[4]حسن الاسناد عند الالبانی،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج1،ص128

[5]بدرالدین،العینی،شرح سنن ابو داؤد،کتاب الطھارۃ،باب الرجل یستاک بسواک غیرہ،ج1،ص156،مکتبۃ الرشد،الریاض،1420ھ

کرنے میں معاون ہو۔ اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جسمانی طور پر صحت مند انسان بہت سارے امراض اور دیگر بہت سارے بدنی آفات سے محفوظ رہتا ہے۔قوی اور جسمانی طور پر مضبوط مؤمن کی فضیلت تو حدیث میں بھی آئی ہے۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا” :طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور پیارا ہے، دونوں میں سے ہر ایک میں خیر ہے، ہر اس چیز کی حرص کرو جو تمہیں نفع دے، اور اللہ سے مدد طلب کرو، دل ہار کر نہ بیٹھ جاؤ، اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش کہ میں نے ایسا ویسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا، بلکہ یہ کہو: جو اللہ نے مقدر کیا تھا اور جو اس نے چاہا کیا، اس لیے کہ ”اگر مگر“شیطان کے عمل کے لیے راستہ کھول دیتا ہے"[1]

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ:" والمراد بالقوة هنا عزيمة النفس والقريحة في أمور الآخرة[2]"یہاں قوت سے مرادامور آخرت میں "دل کا پکا ارادہ اور طبیعتِ قلبی" ہے۔

لیکن حدیث میں لفظِ "قوۃ" عام ہے۔ہر اُس معنی کو شامل ہے جس میں یہ مفہوم آتا ہو۔ کیونکہ طاقتور مسلمان جہاد میں اچھی کارکردگی دکھا سکتا ہے،کافر کے مقابلے میں ڈٹ سکتا ہے،نیک کاموں کے کرنے اور گناہ کے کاموں سے بچنےکی استعداد رکھتا ہے۔تکالیف پر صبر،اللہ تعالی کی رضا کے لیے مشقتیں برداشت کرنے،نماز روزے اور حج جیسے احکامات کی بجا آوری میں ثا بت قدم رہ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ سب کام بدنی طاقت ہی کے ذریعے ممکن ہوتے ہیں۔

خود نبی علیہ السلام جسمانی صحت کے مقابلوں کی حوصلہ افزائی فرماتے بلکہ کبھی تو خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔سیدنا سلمۃ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نبی علیہ السلامکا چند لوگوں پر گزر ہوا جو بنو اسلم سے تعلق رکھتے تھے اور جو تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اسماعیل علیہ السلام کے بیٹو !تیر اندازی کرو کہ تمہارے بزرگ دادا اسماعیل علیہ السلام بھی تیرانداز تھے۔ ہاں !تیر اندازی کرو، میں بنی فلاں(ابن الاکورع رضی اللہ عنہ)کی طرف ہوں۔ بیان کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فریق کے ساتھ ہو گئے تو (مقابلے میں حصہ لینے والے)دوسرے فریق نے ہاتھ روک لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات پیش آئی، تم لوگوں نے تیر اندازی بند کیوں کر دی؟ دوسرے فریق نے عرض کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فریق کے ساتھ ہو گئے تو بھلا ہم کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس پر نبی علیہ السلامنے فرمایا اچھا تیر اندازی جاری رکھو میں تم سب کے ساتھ ہوں"[3]

<u>بلوغت کے بعدخواہشات کے پوری کرنے کا نبوی طریقہ:</u>پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ جوانی میں بلوغت اور اس کے بعد کا زمانہ انتہائی حساس ہوتا ہے۔کیونکہ اس زمانے میں انسان میں جنسی خواہشات پیدا ہو جاتی ہیں۔جس کی وہ تکمیل چاہتا ہے ۔اسلام اِس انسانی ضرورت کو پوراکرنے کا مناسب طریقہ بتلاتا ہے۔اور اُس کے ساتھ ساتھ مسلمان کواپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیتا ہے۔تاکہ ایک طرف اُس کی یہ ضرورت پوری ہو اور دوسری طرف نوع انسانی کی حفاظت ہو۔اسلام محدود دائرے کے اندرجنسی خواہش کی تکمیل

---

[1]صحیح مسلم،کتاب القدر،باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز،رقم:6945

[2]شرح النووی علی المسلم،ج16،ص215

[3]صحیح بخاری،کتاب الجهاد السیر،باب التحریض علی الرمی،رقم:2899

کی اجازت دیتا ہے تاکہ بے حیائی نہ پھیلے اس وجہ سے اسلام نے صرف اپنی منکوحہ بیوی اور مملوکہ سے اس ضرورت کو پورا کرنے کی اجازت دی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشا دہے:

" اور جو اپنی فروج کی حفاظت کرتے ہیں۔ہاں مگر اپنی ملکیت کی بیویوں اور کنیزوں سے مباشرت کرنے میں اُن پر کوئی ملامت نہیں۔ جواپنی ملکیت کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی لوگ حدودِ (شرع)پاکرنے والے ہیں۔ اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہنکل جانے والے ہیں"[1]

ان دو جگہوں کے علاوہ اسلام کسی بھی حالت میں کسی بھی طریقے سے جنسی خواہش کی تکمیل کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ کبیرہ گناہ ہے۔اور اگر کسی نے یہ جرات کی تو اس کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

اور زنا کے بھی پاس نہ جانا کہ وہ بےحیائی اور بری راہ ہے۔[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

" مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے۔ مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں ، سوائے اس کے جو ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں ، اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں ، سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا غلاموں کے یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع نہیں ۔ اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہوجائے ، اے مسلمانو ! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ"[3]

احادیثمبارکہ میں تو اس موضوع پر بے شمار احکامات موجود ہیں جو مسلمان نوجوان کو خصوصاََ اور عام مسلمان کو عموماََ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے نکاح اور شادی پر اُبھارتا ہے ۔اور اگر کسی کے نکاح کی طاقت نہ ہو تو اُ س کا بھی علاج تجویز فرماتا ہے جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم نبی علیہ السلامکے زمانہ میں نوجوان تھے اور ہمیں کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ نبی علیہ السلامنے ہم سے فرمایا کہ نوجوانوں کی جماعت! تم میں جسے بھی نکاح کرنے کے لیے مالی طاقت ہو اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ نظر کو نیچی رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا عمل ہے اور جو کوئی نکاح کی بوجہ غربت طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کی خواہشات نفسانی کو توڑ دے گا"[4]

---

[1] المؤمنو ن23 : 7/5

[2] الاسراء32:17

[3] النور 24 :31/30

[44] بخاری،کتاب النکاح،باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم:رقم5066،صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب استحباب النکاح لمن ثاقت نفسہ ووجد مؤنۃ،رقم3464

اس حدیث میں اسلام نے انسان(مرد ہو یا عورت) کی جنسی شہوت کی تسکین کا حل ارشاد فرمایا ہے۔کہ یا تو شادی کی جائے اور یا روزہ رکھ لیا جائے کیونکہ روزہ جنسی قوت کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔

شادی کے لوازمات چونکہ بالعموم زیادہ ہوتے ہیں اس لیے بسا اوقات کچھ لوگوں کو ان لوازمات کے پورا کرنے کی قدرت نہیں ہوتی اس وجہ سے اسلام نے اُس کا متبادل کا حل پیش کیا ہے۔جو کہ روزہ ہے کیونکہ روزہ رکھنے سے بدن میں کمزوری آتی ہے جس کی وجہ سے شہوت میں کمی آجاتی ہے۔

شادی کی طاقت نہ رکھنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہو جائے۔ بلکہ نوجوانوں کو خصوصا ایسے حالات میں اپنی پاک دامنی کو ہرحال میں برقرار رکھنا چاہئیے۔اس کے لیے اُسے تقوی کا اہتمام اور انسانی جان کی عزت و توقیر کو مدنظر رکھنا چاہئیے۔ کہ جس عورت سے بدکاری کی جاتی ہے وہ بھی تو کسی کی بیٹی، بہن یابیوی ہوگی۔تو جس طرح کوئی بھی اپنی بیٹی، بہن اور بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کا ایسا فعل برداشت نہیں کر سکتا تو اُسی طرح دوسروں کی بھی توقیر کرکے اُن کی عزت سے نہیں کھیلنا چاہئیے۔ اس حوالے سے ایک نوجوان صحابی رضی اللہ کا واقعہ حدیث میں آتا ہے جسے مسند احمد[1] میں ذکر کیاگیا ہے:

" ایک دفعہ ایک نوجوان نبی علیہ السلام کے پاس آیا۔اور کہنے لگا کہ اےاللہ کو رسول:مجھے زنا کی اجازت دیجئیے۔پاس بیٹھے لوگ اُسے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے۔"چُپ رہ، چُپ"آپ نے فرمایا اسے مجھے قریب آنے دو۔وہ آپ کے قریب آکر بیٹھ گیا۔آپ نے(اُسے سمجھانے کی غرض سے)فرمایا:کیا تو یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسا فعل تمہاری والدہ کے ساتھ کرے۔اُس نے کہا میں آپ پر قربان ہوجاؤ اللہ کی قسم کبھی بھی نہیں۔کوئی بھی اپنی ماں کے ساتھ غیر مرد کا یہ فعل نہیں چاہتا۔پھر آپ نے اُس سے اُس کی بیٹی،بہن،پھوپھی اور خالہ کے بارے میں اس قسم کے سوالات کیے اُس نے بھی پہلے جیسے جوابات دئیے۔راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس پر اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر دعا فرمائی:اے اللہ اِس کے گناہ معاف فرمائے،دل صاف کردے اوراس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما۔پھر اِس کے بعد اُس نوجوان نے کبھی بھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا"[2]،[3]

اس حدیث میں معلم انسانیت نے اُس نو جوان کی تربیت ایک انتہائی نفیس طریقے سے فرمائی جس کو سمجھ کر وہ آئندہ کے لیے ایسی سوچ سے بھی کنارہ کش ہو گئے کیونکہ نبی علیہ السلام نے غیر کی عورت کی تشبیہ جب اُ س کے اپنی قریبی عورت سے دی ،تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی انسان ایسی صورت حال برداشت نہیں کر سکتا ۔ اس وجہ سے وہ بھی توبہ تائب ہو ا۔

نوجوانوں میں خود اعتماد پیدا کرنے کی خاطر اُنہیں مختلف ذمہ داریاں

سونپنا:نوجوانی میں چونکہ انسانی طاقت بھر پور ہوا کرتی ہے اور نوجوان ہر کام کے لیے مطلوبہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔قوم کے مفاد کے خاطر قربانیاں بھی دے سکتے ہیں۔جہاد جیسے پُر مشقت حکم کی بجا آوری کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔اسی وجہ سے سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نے اُن کی اس صلاحیت کو برروئے کار لانے کے لیے وقتا فوقتاً احکامات جاری کئے ہیں۔دعوت وارشاد کے سلسلے میں اُ ن کی خدمات حاصل کی گئیں

---

[1]أحمد بن حنبل ،ابو عبداللہ،الشیبانی،مسندالامام احمد بن حنبل مئوسسۃ قرطبہ،قاہرہ ،بدون تاریخ

[2]مسند احمد،باقی مسند االانصار،حدیث ابو امامہ الاباہلی،صدی بن عجلان،رقم:22265

[3]اسناد ھذالحدیث صحیح،الالبانی،سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ،ج1،ص369

ہیں۔کیونکہ اگرچہ وہ عمر میں چھوٹے ہوتے لیکن ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو بڑے بڑے اور اہم امور حوالے کئے گئے۔سیرت طیبہ میں اس کے مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔مثلاً

جنگ خیبر کے موقع پر نبی علیہ السلام نےجنگ کا جھنڈا تیس سال کے ایک نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور اللہ تعالی نے اُن کے ہاتھ پر فتح عطاء فرمائی۔صحیحین کی روایت ہے کہ:

" غزوہ خیبر میں نبی علیہ السلامنے فرمایا تھا کہ کل کے دن میں(جنگی) جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول بھی اسے عزیز رکھتے ہیں۔ راوی نے بیان کیا کہ وہ رات سب کی اس فکر میں گزر گئی کہ دیکھیں ' نبی علیہ السلامجھنڈا کسے عطا فرماتے ہیں۔ صبح ہوئی تو سب خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور اس امید کے ساتھ کہ عَلم انہیں کو ملے لیکن نبی علیہ السلامنے دریافت فرمایا کہ علی بن ابی طالب[1]کہاں ہیں؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! وہ تو آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ انہیں بلا لاؤ۔ جب وہ لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تھوک ان کی آنکھوں میں لگایا اور ان کے لیے دعا کی۔ اس دعا کی برکت سے ان کی آنکھیں اتنی اچھی ہو گئیں جیسے پہلے ان میں کوئی بیماری ہی نہیں تھی۔ علی رضی اللہ عنہ نے عَلم سنبھال کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ان سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک وہ ہمارے ہی جیسے نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں ہی چلتے رہو ' ان کے میدان میں اتر کر پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو اور بتاؤ کہ اللہ کا ان پر کیا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص کو بھی ہدایت مل جائے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"[2]

اسی طرح دوسرے موقع پر آپ نےکبارصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قیادت ایک بیس سالہ نوجوان کو مرحمت فرمائی تھی۔بلکہ ایک قول کے مطابق اُس کی عمر اٹھارہ سال تھی[3]۔جیسا کہ اس روایت میں ہے:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بنایا لیکن ان کی سرداری پر لوگوں نے اعتراض کیا ۔ نبی علیہ السلامنے اس پر فرمایا کہ اگر آج تم ان کی امارت کو مطعون قرار دیتے ہو تو تم نے اس سے پہلے اس کے والد (زید رضی اللہ عنہ)کی امارت کو بھی مطعون قرار دیا تھا اور اللہ کی قسم! وہ امارت کے لیے سزاوار تھے اور وہ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے اور یہ(اسامہ رضی اللہ عنہ)ان کے بعد سب سے زیادہ مجھے عزیز ہے"[4]

بلکہ اس سے دو، تین سال پہلے بھی نبی علیہ السلام نے آپ رضی اللہ عنہ کو ایک سریّے میں ایک قبیلے کےپاس بھیجا تھا۔خود اسامۃ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "اسامہ بن زید

---

[1]علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب(شیبہ) بن ہاشم بن عبدمناف رضی اللہ عنہ ۔رسول اللہ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔چھوٹوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔اسلام قبول کرنے کے بعد تیرہ سال مکہ میں بسر ہوئے،پھر رسول اللہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کیا۔آپ چوتھے خلیفہ ہے آپ نے 4سال 9 ماہ خلافت کیا ،وفات کے آپ کی عمر 63 سال تھی۔(ابن سعد، الطبقاتالکبری،ج3 ،ص 38۔الاستیعابفیمعرفۃالأصحاب،ج،1 ص 383)

[2]بخاری، کتاب الجہاد والسیر،باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الناس الی الاسلام والنبوۃ۔۔۔،رقم:2942،مسلم،کتاب فضائل الصحابہ،باب من فضائل علی بن ابی طالب،رقم:6376

[3]الاصابہ،ج1ص49

[4]بخاری،کتاب الاحکام،باب من لم یکترث بطعن من لایعلم فی الامراء حدیثا،رقم:3730،مسلم،کتاب الفضائل،بابفضائل زید بن حارثۃ واسامۃ بن زید،رقم:6417

رضی اللہ عنہما سے سنا انہوں نے بیان کیا کہ ہمیں نبی علیہ السلامنے قبیلہ حرقہ کی طرف بھیجا۔ ہم نے صبح کے وقت ان پر حملہ کیا اور انہیں شکست دی ' پھر میں اور ایک اور انصاری صحابی اس قبیلہ کے ایک شخص)مرداس بن عمر نامی(سے بھڑ گئے۔ جب ہم نے اس پر غلبہ پا لیا تو وہ لا الہٰ الا اللہ کہنے لگا۔ انصاری تو فوراً ہی رک گیا لیکن میں نے اسے اپنے برچھے سے قتل کر دیا۔ جب ہم لوٹے تو نبی علیہ السلامکو بھی اس کی خبر ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اسامہ کیا اس کے لا الہٰ الا اللہ کہنے کے باوجود تم نے اسے قتل کر دیا؟ میں نے عرض کیا کہ وہ قتل سے بچنا چاہتا تھا (اس نے یہ کلمہ دل سے نہیں پڑھا تھا)۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باربار یہی فرماتے رہے(کیا تم نے اس کے لا الہ الا اللہ کہنے پر بھی اسے قتل کر دیا)کہ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں آج سے پہلے اسلام نہ لاتا"[1]

جھینہ کے اس سریے کے بارے میں اختلاف ہے کہ اسامہ رضی اللہ اس میں امیر تھے یا نہیں؟ امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمۃ الباب باندھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قائد لشکر آپ ہی تھے یعنی:

باب :نبی علیہ السلام کا قبیلہ جہینہ کی طرف سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا بھیجنا"

نوجوانوں کو ذمہ داری تفویض کرنے کی ایک مثال اس حدیث میں بھی ہے:

"سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے سنا ' وہ بیان کرتے تھے کہ میں نبی علیہ السلامکے ہمراہ سات غزووں میں شریک رہا ہوں اور نو ایسے لشکروں میں شریک ہوا ہوں جو آپ نے روانہ کئے تھے۔(مگر آپ خود ان میں نہیں گئے)کبھی ہم پر ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر ہوئے اور کسی فوج کے امیر اسامہ رضی اللہ عنہ ہوئے"[2]

الغرض سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں جوانوں کی تربیت وغیرہ کے بارے میں بہت سارے احکامات موجود ہیں۔کیونکہ آج کا نوجوان کل کا باپ ہوتا ہے۔وہ حال اور مستقبل کے امین ہواکرتے ہیں۔انقلاباتِ دنیا میں اُن کا ایک خاص کردار ہوتا ہے،دینی ودنیوی ضروریات زندگی کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات اور مشقتوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔قوموں کے عروج وزوال میں اُن کی کاکردگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔اس وجہ سے اسلام کبھی بھی اس بات کا روادار نہیں کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اُنہیں فراموش کیا جائے۔بلکہ ہر وقت اُن کی صلاحیتوں کو نیکی کی طرف موڑ کر اچھے کاموں میں لگایا جائے۔

اسلام کسی سے اُس کی طاقت سلب نہیں کرتا بلکہ اس کے زاویہ نگاہ کو موڑ دیتا ہے یعنی بدی کے کاموں سے نیکی کے کاموں کی طرف کردیتا ہے۔اسی طرح اسلام کسی سے اُس کی خواہشات بالکلیہ سلب نہیں کرتا بلکہ اُسے حلال اور جائز جگہوں میں استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے انہی زریں اصولوں کی بنیاد پر نبی علیہ السلام نے نو جوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔کیونکہ نبی علیہ السلام کے تیار کردہ جماعت نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئیے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں

[1] بخاری،کتاب المغازی،باب بعث النبی اسامۃ،رقم:4269

[2] بخاری، کتاب المغازی،باب بعث النبی اسامۃ بن زید الی الحرقات من جھینۃ،رقم:4271،4270

ملتی۔عملی کارکردگی کے ساتھ ساتھ ان کی آپس کی محبت،خلوص،دکھ درد کا احساس اورخیرخواہی آج بھی دنیا کے لیے نمونہ ہے۔اللہ تعالی کی ذات پر کامل یقین رکھنے والے،صاف دل اورصاف گو انسانوں کی وہ جماعت اپنی مثال آپ تھی۔

بوڑھوں (عمر رسیدہ انسانوں)کے سماجی حقوق

عمر رسیدہ انسان کے لیے عربی میں "کبیر،مسنّ" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں[1]۔
کبیر تو اپنے معنی میں ظاہر ہے۔"بڑا" چاہے یہ بڑائی جسمانی ہو یا عمر کے لحاظ سے۔
اور"مُسنّ"تو لفظِ:سِنّ: سے ہے جو "اسنان" کا واحد ہے[2]۔ابن سیدۃ کے بقول"السنّ" داڑھ کے معنی میں آتا ہے [3]۔

اصطلاحی طورپر بڑا کس کو کہتے ہے اس میں مختلف اقوال ہیں۔

(الف):قانونی طور پر بوڑھا اُ س شخص کو کہا جاتا ہے جو ساٹھ یا پینسٹھ سال تک پہنچ گیا ہو۔
(ب):معاشرے میں اُ س شخص کوبوڑھا کہا جاتا ہے جوعمر کی اُ س حد تک پہنچ گیا ہو جس میں وہ معاشرے میں کوئی مثبت سرگرمی نہیں دکھا سکتا۔اس کےقویٰ کمزور ہو گئے ہوں۔ظاہری طور پر وہ اپنی افادیت کھو چکا ہو اور لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کا قابل نہیں رہا ہو۔
(ج):ماہرینِ نفسیات کے مطابق وہ شخص بوڑھا کہلائے گا جواپنے فائدے کے حصول اور نقصان سے بچاؤ کے قابل نہیں رہا ہو۔
(د):میڈیکل(طبی طور پر) وہ شخص بوڑھا ہے جس کے اعضاء میں عمر گزرنے کی وجہ سے ایسی کمزوری آچکی ہو جس کی تلافی نہیں ہو سکتی[4]۔

اسلام کے نقطہ نظر سےبڑائی کا دارومدارعمر پرہے۔کوئی آپ سے عمر میں ایک دن بڑا ہو تو اُس کی عزت کرنا لازمی ہوتا ہے اور جب عمر کا یہ فرق زیادہ ہو توپھر تو اور زیادہ احترام کرنا ضروری ہوتا ہے۔
اگر ان سب باتوں کا خلاصہ نکال دیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ بوڑھا وہ ہوتا ہے جو عمر کے ساٹھ،پینسٹھ بہاریں دیکھ چکا ہو جسے اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہو اور ماحول سے مطابقت رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہو۔
ذیل میں اُن کے چند اوصاف کا تذکرہ کیا جاتاہے۔

1۔وہ کافی عمر گزار چکا ہو۔عمر کے آخری حصے میں ہو۔
2۔عقلی اور جسمانی کمزوری کا شکار ہو۔
3۔ جوانی کے افعال کے بجا لانے سے قاصر ہو چکا ہو ۔
4۔دوسروں کے رحم وکرم پر ہو۔

یہ تو صرف لغوی اعتبار سے "بڑھاپے" کی تعریف کے طور پر لکھا گیا ورنہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بڑھاپا سراسر عیوب کا مجموعہ ہوتا ہے۔کیونکہ اسلام کے نقطہ نظر میں اِس وقت میں اُن میں جوخیر وبرکت رکھی گئی ہے وہ اس کی زندگی میں کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔اُن کے پاس تجربات ہوتے ہیں ۔وہ عملی زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھ چکے

---

[1] محمد بن احمد،الازہری۔تہذیب اللغۃج3ص190،داراحیات التراث العربی،بیروت،2001م
[2] لسان العرب،ج13،ص220
[3] علی بن اسماعیل،ابن سیدۃ،المحکم والمحیط الاعظم،ج8،ص415،دارالکتب العلمیۃ،2000م
[4] رعایۃ المسننین بین العلوم الوضعیۃ والتصور الاسلامی،ص25،24

ہوتے ہیں۔جوانی کے ایام میں جو شہوات اور خواہشات ہوتے ہیں ان سب سے کنارہ کش ہو کے کسی کام کے بارے میں سوچھتے ہیں۔اس وجہ سے اُن کے ساتھ اُن کے دونوں حیثیتوں (ضعف اور وسیع تجربے)کو دیکھ کر معاملہ کرنا چاہئیے۔

آج دنیا میں بوڑھوں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے اور اُن کی فلاح و بہبود کے لیے کاوشیں کی جاتی ہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنی جوانی اِسی معاشرے کی فلاح وبہبود کے لیے صرف کی ہوتی ہے۔اقوام عالم میں اُن کی باعزت زندگی گزارنے کے لیے قوانین بنائے جارہے ہیں۔اُن کے لیے روزینے مقرر کئے گئیں ہیں اُن کے لیے ایسے ماحول فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں اُن کی زندگی کے اوقات اچھے گزرے۔

لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ اُن کے حقوق کی ادائیگی کا حقیقی اوریقینی حل نہیں ہے کیونکہ:

(الف):موجودہ دنیا میں بوڑھوں کے لیے جتنی بھی کاوشیں کی جاتی ہیں وہ صرف اُن کی جسمانی اورمادی ضروریات کو پورا کرنے کے واسطے ہیں، اُن کی روحانی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی بھی قسم اقدامات نہیں کئے جاتے حالانکہ اِس عمر میں اُن کے لیے روحانیات سے تعلق استوار کرنالازمی ہوتا ہے۔

(ب):اُن کی سہولت کے نام پر اُن کو معاشرے سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔"اولڈ سنٹر" کے نام پر اُن کے لیے کئی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔تنہائی کی اس زندگی میں وہ پہلے سے زیادہ پریشان رہتے ہیں۔

(ج):اُن کو ایک جگہ اپنے ساتھ نہ رکھنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاید ہم کسی مجبوری(نوکری وغیرہ) کی وجہ سےاُن کے حقوق کما حقہ ادا نہ کر پائے لیکن یہ بات بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس سے ایک تو اُن میں احساس کمتری پیدا ہوجاتی ہے اور دوسرا یہ کہ رفتہ رفتہ اولاد کا اُ ن کے ساتھ رابطہ ختم ہوتا جاتا ہے۔

آج بھی اگردنیا اس مسئلے کا حل چاہتی ہے تو اسلام ہی اس کا واحد ، مستقل اور پائیدار حل ہے۔جو کہ افراط وتفریط سے پاک ایک متوازن نظام حیات ہو گاکیونکہ اسلام انسان کی ہر ضرورت کو دیکھتے ہوئے ایسی تعلیمات دیتا ہے جو اُس کی جسمانی،مادی اور روحانی تمام ضروریات پوری کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔

اسلام نے انسان کی زندگی کے کسی بھی لمحہ کو فضول اور عبث نہیں سمجھا بلکہ پیدائش سے لے کر موت اور مابعدالموت تک کے تمام حالات کو اہمیت کاحامل سمجھا ۔اسلام کی نظر میں بوڑھا (چاہے کسی بھی عمر کا ہو)کوئی الگ مخلوق نہیں ہوتا بلکہ اسی معاشرے کا ایک فرداور ٹھیک ٹھاک انسان ہوتا ہے اُس کے بچے ہوتے ہیں،بھائی بہن،دوست اور ہمسائے ہوتے ہیں اسلام اِن سب رشتوں پر یہ بات لازم کر تا ہے کہ بڑھاپے میں اِن لوگوں کا خیال رکھا کرے۔اور ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اِن امور کی نگرانی کرے۔لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے یہ کافی ہے کہ اِن لوگوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم اللہ رب العلمین کی طرف سے ہے جس کی بجا آوری ایمان کا ایک اہم حصہ ہوا کرتا ہے۔

قُرآن کریم میں جا بجا اس بارے میں ارشادات موجود ہیں۔انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور اُن مراحل کی خصوصیات قرآنِ کریم کچھ ایسے زبردست انداز میں بیان فرماتا ہے:

> "اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو مٹّی سے پیدافرمایا۔پھر(اُس مٹّی سے) نطفہ بنا کر پھر(رحمِ مادر میں اُس نطفے سے) لوتھڑا بنا کر پھر تم کو نکالتا ہے بچّے، پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو۔ اس کے بعدبوڑھے ہوجاتے ہو۔ اور کوئی تم میں

سے پہلے ہی مرجاتا ہے اور تم وقت مقرر تک پہنچ جاتے ہو
اور تاکہ تم سمجھو"[1]

ان مراحل میں خاص طور پرانسانی زندگی کے ضعف وقوت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالی فرماتا ہے:

"اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو (ابتدا میں) کمزور حالت میں پیدا فرمایا پھر(اُس) کمزوری کے بعد(تمہیں) طاقت عنایت کی پھر (اُس)طاقت کے بعد(تمہیں) کمزوری اور بڑھاپا دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علم والا اورطاقت والا ہے"[2]

اور پھر انسان جسمانی اور عقلی طور پر جب بالکل کمزور ہو تا ہے وہ بھی اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

"اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا۔ پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور (بہت کچھ) جاننے کے بعد ہر چیز سے بےعلم ہوجاتے ہیں۔ بےشک اللہ جاننے والا قدرت والا ہے"[3]

احادیث مبارکہ میں بزرگوں،بوڑھوں اور عمر رسیدہ لوگوں کے حقوق کے بارے میں انتہائی تاکید آئی ہے۔ اُن میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

***....عمر رسیدہ مسلمان کی فضیلت:**(1): جس شخص کی پوری زندگی اسلام کی حالت میں گزری ہو اور وہ اسلام ہی کی حالت میں بوڑھا ہو گیا ہو حدیث مبارک میں اس کو" خیر الناس "(لوگوں میں بہترین شخص) کہا گیا ہے۔ ایک دیہاتی صحابی نے نبی علیہ السلام سے سوال کیا کہ "اللہ کے رسول! لوگوں میں سب سے بہتر شخص کون ہے؟ آپ نے فرمایا" :جس کی عمر لمبی ہو اور عمل نیک ہو"[4]"[5]

(2) امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک روایت ذکر کی ہے: "نبی علیہ السلامنے فرمایا" :جو اسلام میں بوڑھا ہو جائے، تو قیامت کے دن یہ اس کے لیے نور بن کر آئے گا"[6]"[7]

یہ حدیث عمر رسیدہ لوگوں کی جسمانی حالت سے متعلق ہے یعنی جس کی عمر اسلام میں گزر کر ختم ہونے کے قریب ہو جائے۔

مسلمان اس امید پر زندگی گزاررہا ہوتا ہے کہ اگر چہ اس کو اس دنیا میں امراض،کمزوری،فتور اور تھکاوٹ وغیرہ جیسے عوارض لاحق ہیں تاہم آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے وہ ان سب حالات سے ناامید اور دل بر داشتہ نہیں ہو تا بلکہ اس کے اچھے بدلے کا یقین رکھتا ہے اس کے برعکس مغربی دنیا میں چونکہ آ خرت کا تصور نہیں ہے اس وجہ سے جب وہ لوگ اس طرح کے حالات کا سامنا کرتے ہیں تو دل برداشتہ ہو کر اپنی زندگی کا خود ہی خاتمہ کر دیتے ہیں آئے روز کی خودکشیاں اسی کی علامت ہیں۔

اسلام میں اگر بندہ بوڑھا بھی ہو جائے تب بھی وہ شرعی احکام کا مکلف رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک جوان آدمی کی حیثیت ہے بالکل اُسی طرح اسلام بوڑھے کو

---

[1] غافر67:40
[2] الروم 54:30
[3] النحل70:16
[4] سنن ترمذی،کتاب الزھد،باب ماجا ء فی طول العمرللمؤمن،رقم:2329
[5] البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج5،ص329
[6] ترمذی،کتاب الجھاد،باب من شاب شیبۃ فی سبیل اللہ،رقم:1635
[7] قال الالبانی صحیح،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج7،ص214

بھی اہمیت دیتا ہے۔نماز،روزہ،تلاوت قرآن اور اس جیسے دوسرے احکام کی بجاآوری بوڑھے کو تنہائی میں ایک مستقل دوست کی حیثیت سے ساتھ رہتے ہیں ۔ان اعمال کے ہوتے ہوئے وہ کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔

احادیث میں چھوٹوں بڑوں کے حقوق وفرائض بیان کرتے ہوئے نبی علیہ السلام نے فرمایا

(3) امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں نبی علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:" مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا »[1]،[2]"ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرنے والا بڑوں کا حق نہ پہچانے والا ہم میں سے نہیں"

*....والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت،فضیلت اور رعایت:

رعایت:اسلام کا یہی طرہ امتیاز ہے کہ اس کے احکام ابدی ہیں عقل اور تہذیب کی تائید کرنے والے ہیں۔ دنیا وآخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہیں۔اورروالدین چونکہ اولاد کے لیے اپنی جوانی،خوشی،آرام وراحت تک قربان کرتے ہیں اسی وجہ سے اسلام نے اُن کے بارے میں حسن سلوک کی ایسی ہدایات دی ۔ جس کی نظیر نہ پہلے موجود ہے اور نہ آئندہ کوئی پیش کر سکتا ۔

اولاد کو پابند بنا دیا گیا ہے کہ وہ والدین کی ہرجائز خواہش کا احترام کریں،اُن کی ہر جائزضرورت پوری کریں،ہر وقت اُن کے لیے خوشی کا سامان مہیا کریں ۔اس کے نتیجے میں اُن کے لیے ہمیشہ کی خوشی اور جنت ملے گی اور اگر ان فرائض منصبی میں دانستہ طور پر کسی نے کوئی کو تاہی برتی تو وہ سخت وعید اور عذاب کا مستحق ہو گادنیا میں بھی وہ خوشی کو ترسے گا اور آخرت میں آگ اس کا ٹھکانہ ہو گی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اوروالدین کے ساتھاچھا سلوک کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور اُن سے بات ادب کے ساتھ کرنا"[3]

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور انسان کو ہم نےتاکید کی ہے شکر کرنے کی،اُس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائی کھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اورآخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے اور یہ کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے والدین کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ۔اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہا نہ ماننا۔ہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اس کے رستے پرچلناپھر تم کو میری

---

[1]ابو داؤد،کتاب الادب،باب فی الرحمۃ،رقم:4945

[2]یہ حدیث صحیح ہے،الالبانی،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج10،ص443

[3]الاسراء23:17

طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کر تے رہے ہو سب سے تم کو آگاہ کر دوں گا"[1]

اس آیت میں سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کو خطاب ہے ۔اُ ن کے والد محترم اُن کے دین پر نہ تھے۔اپنے والد محترم کے ساتھ احسان کامعاملہ کرتے ہوئے اُن کے لیے ایمان کا انتہائی حرص رکھتے تھے۔تاکہ ایمان لاکر وہ ہمیشہ کے لیے آگ کے عذاب سے نجات پائے،کافر اور مشرک باپ کے ساتھ دنیاوی لین دین میں ادب واحترام کا معاملہ رکھنا چاہئیے اسی کی طرف اللہ تعالی کے قول میں اشارہ ہے:

" اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو۔ بےشک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سےکہا کہ اباآپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھے اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ابّا بجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرےساتھ ہو جائے میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا ابّا شیطان کی پرستش نہ کیجیئے۔ بےشک شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو اللہ کا عذاب آپکڑے تو آپ شیطان کی ساتھی ہو جائیں"[2]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد محترم نے آپ کی دعوت نہیں مانی لیکن پھر بھی آپ نے اُن کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے فرمایا:

"ابراہیم(علیہ السلام)نے سلام علیکم کہا اور کہا کہ میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش مانگوں گابے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے"[3]

اسلام میں انبیاء کو بھی والدین کے فرمان بردار رہنے کاحکم دیا گیا ہے۔سیدنا عیسٰی علیہ السلام کی صفت بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ آپ اپنی والدہ کے بہت ہی تابع فرمان تھے:"

" اور اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا اور سرکش وبدبخت نہیں بنایا"[4]

احادیث مبارکہ میں تو انتہائی وضاحت کے ساتھ اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ایک حدیث میں والدین کی خدمت اور اُن کے ساتھ نیکی بہترین اعمال میں شمار کی گئی ہے۔سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

"ایک شخص نے نبی علیہ السلامسے پوچھا: کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ علیہ السلام نےفرمایا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا اور والدین کے ساتھ نیک معاملہ کرنا، پھر اللہ کے راستے میں جہاد کرنا"[5]

یہاں ترتیب وار بہترین اعمال ذکر کئے گئے ہیں۔پہلے نمبر پر نماز جو ارکانِ اسلام میں سے ہے اور اس کے فوراََ بعد والدین کے ساتھ نیکی کرنا،اور آخر میں

---

[1] لقمان31 :14,15

[2] مریم:19 :41تا44

[3] نفس مصدر،آیت47

[4] نفس مصدر آیت32

[5] بخاری،کتاب التوحید،باب وسمی النی صلی اللہ علیہ وسل الصلاۃ عملا،رقم:7534،مسلم،کتاب الایمان،باب بیان کون الایمان باللہ تعالی افضل الاعمال،رقم:266

جہاد۔تو معلوم ہو اکہ والدین کی خدمت اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد جیسی افضل ترین عبادت سے بھی افضل ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے موقع پر تو نبی علیہ السلام نے ایک صحابی کو جہاد پر جانے سے والدین کی خدمت کی وجہ سے روک دیا تھا۔جیسا کہ روایت میں ہے :

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا ”کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟“انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”پھر انہیں میں جہاد کرو۔(یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو)"[1]

جیسا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک جنت کی سیڑھی ہے اسی طرح اُن کی نافرمانی بھی جہنم میں جانے کا سبب ہے۔والدین کی نافرمانی کو "اکبر الکبائر"کہا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ نبی علیہ السلاماس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی)سب سے بڑے گناہ ہیں(آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی۔ نبی علیہ السلاماسی بات کو مسلسل اتنادہراتے رہے کہ میں سوچنے لگا کہ نبی علیہ السلامخاموش نہیں ہوں گے "[2]

اورصحیحین کی روایت پہلی گزر چکی ہے جس میں والدین کی نافرمانی کی حرمت بیان کی گئی ہے کہ:

"مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں (اور باپ)کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،(واجب حقوق کی(ادائیگی نہ کرنا اور)دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر)دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو حرام قرار دیا ہے"[3]

والدین کے بہت سارے حقوق میں ایک اہم حق اُن کا نان نفقہ ہے جو اولاد کے ذمے واجب ہوتا ہے۔امام ابو داؤد رحمہ اللہ کی روایت میں ہے:

" عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور والد بھی ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت بھی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کا ہے (یعنی ان کی خبرگیری کرنا تجھ پر لازم ہے)تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"

---

[1] بخاری،کتاب الجهاد والسیر،باب الجهاد باذن الابوین،رقم:3004،مسلم،کتاب البر والصلة والادب،باب بر الوالدین وانهما احق بہ،رقم:6668

[2] بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدينمنالكبائر،رقم:5976،مسلم،کتابالإیمان،بابییانالکبائروأکبرھا،رقم:269

[3] بخاری،نفس مصدر،رقم:5975،مسلم نفس مصدر رقم:4580

والدین کے نفقے کے بارے میں اسلامی تعلیمات یہاں تک ہیں کہ اگر بچہ یتیم ہو تو بھی والدین کااس کے مال میں حق ہے جیسا کہ ایک صحابیہ[1] رضی اللہ عنہا نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا :

" میری گود میں ایک یتیم ہے، کیا میں اس کے مال میں سے کچھ کھا سکتی ہوں؟ تو انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا ہے" :آدمی کی پاکیزہ خوراک اس کی اپنی کمائی کی ہے، اور اس کا بیٹا بھی اس کی کمائی ہے"[2]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے معالم السنن شرح ابو داؤد میں ہے کہ:"قال الشيخ فيه من الفقه أن نفقة الوالدين واجبة على الولد إذا كان واجداً لها ، واختلفوا في صفة من تجب لهم النفقة من الآباء والأمهات ، فقال الشافعي إنما يجب ذلك للأب الفقير الزمن فإن كان له مال أو كان صحيح البدن غير زمن فلا نفقة له عليه.

وقال سائر الفقهاء نفقة الوالدين واجبة على الولد ولا أعلم أحدا منهم اشترط فيها الزمانة كما اشترطها الشافعي"[3]

"امام خطابی[4] رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ والدین کا نفقہ صاحبِ مال اولاد پر لازمی ہے۔پھر اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ والدین کی کس حالت کااعتبار کیا جائے گا(آیا اس حالت کاکہ وہ والدین ہیں یا اُن کی غربت اوربڑھاپے کا؟)امام شافعی رحمہ اللہ کا اس بارے میں یہ قول ہے کہ اگر والدین فقیر اور بوڑھے ہوں تب اولاد پر واجب ہے۔اوراگر والدین خود مال دار ہوں یا بدنی لحاظ سے اچھے اور صحت مند ہوں تو پھر اولاد پر لازمی نہیں ہے،امام شافعی رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر فقہاء کا قول یہ ہے کہ والدین بوڑھے ہو یا نہ ہو نفقہ اولاد ہی پر لازم ہے"

شریعتِ اسلامی اس بارے میں غفلت بالکل برداشت نہیں کر تی۔حدیث میں آتا ہے کہ:
"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کردے جن کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے اوپر ہو "[5]،[6]

والدین کی اتنی خدمت کرنی چاہئیے کہ اُن کی خدمت کی وجہ سے اولاد جنت کا مستحق بنے ۔بڑھاپے میں والدین کی خدمت میں کوتاہی اولاد کے لیے تباہی کا موجب ہے اور یہی اولاد نبی علیہ السلام کی بددعا کی مستحق بن جاتی ہے۔صحیح مسلم کی روایت میں آتا ہے:

"اس شخص کی ناک خاک آلود ہواس شخص کی ناک خاک آلود ہواس شخص کی ناک خاک آلود ہو۔پوچھا گیا ۔یا رسول اللہ کس کی؟ فرمایا جس شخص نے اپنےوالدین میں سے کسی ایک

---

[1]یہ صحابیہ مشہور تابعیہ عمارۃ بن عمیر رحمۃ اللہ علیہاکی پھوپھی ہے۔سننابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم:3530

[2]سننابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم:3530

[3]احمد بن محمد،الخطابی،معالم السنن،ج3،ص165،المطبعۃ العلمیۃ،حلب،1351ھ

[4]ا حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب،ابو سلیمان،خطابی،الامام،العلامہ،الحافظ،اللغوی،310ھ میں پیداہوئے۔ابوسعید بن الاعرابی،اسماعیل بن محمد الصفار،ابوبکر بن داسہ وغیر سے استفادہ کیا۔ مصنف کتب کثیرہ ہے۔بست شہر میں ربیع الثانی 388ھ میں وفات پائے۔سیراعلام النبلاء،ج17،ص27،23

[5]سنن ابو داؤد،کتاب الزکوۃ،باب فی صلۃ الرحم:رقم:1694

[6]قال الالبانی اسنادہ حسن،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج4،ص192

کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان کی اتنی خدمت نہ کی کہ جس کے بدلے میں وہ جنت میں جائے"[1]

پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ والدین کی خدمت کرناجہاد پر جانے سے مقدم ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"ایک شخص نبی علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں ھجرت اور جہاد پر اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطربیعت کرنے کے واسطے آپ کے پاس آیا ہوں۔آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ بھی ہے ۔اُس نے کہا جی دونوں زندہ ہے۔آپ نے فرمایا کیا تمہارا مطلوب اللہ کی رضا ہے؟اُس نے کہا جی ہاں۔آپ نے فرمایا واپس جاؤ اور اُن کے ساتھ نیک صحبت اختیار کرو(اُن کی اچھی طرح خدمت کرو)"[2]

مسلم کی شرح میں اس حدیث کے بارے میں ہے کہ یہ تمام احادیث والدین کے ساتھ نیک سلوک کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔اُن کی خدمت جہاد سے مقدم ہے۔اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ مسلمان والدین کی اجازت کے بغیر جہاد پر جانا جائز نہیں ہے۔اورروالدین اگر مشرک ہوں تو اس کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ان سے اجازت لیناضروری نہیں ہے۔واضح رہے کہ جہاد پر نہ جانے کا حکم تب ہے جب جہاد فرضِ عین نہ ہو۔ چنانچہ اگر فرض عین ہوجائے تو پھر والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں۔تمام علماء امت اس بات پر متفق ہیں کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے اور اُن کی نافرمانی حرام ہے۔[3]

والدین اگر تمہارے کسی ذاتی کام کے بارے ناپسندیدگی ظاہر کر دیں تو بھی اُن کی دل دل جوئی کی خاطر اُن کی بات ماننی چاہئیے۔چاہے وہ کسی کو بیوی کو طلاق دینے کا کیوں نہ کہیں ۔روایات میں آتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بیوی چھوڑنے کا کہا۔جس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی علیہ السلام سے مشورہ لیا آپ نے والد کا حکم ماننے کے لیے طلاق کا مشورہ دیا۔سنن ترمذی[4] کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی، میں اس سے محبت کرتا تھا، اور میرے والد اسے ناپسند کرتے تھے۔ میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں، لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر میں نے اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا” :عبداللہ بن عمر! تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو"[5] دو"[5]، [6]

اس حدیث میں صراحت سے یہ حکم ذکر کیا گیا ہے کہ جب ماں باپ کہے تو بیوی کو چھوڑنا چاہئیے اگر چہ وہ اسے محبوب کیوں نہ ہو۔یہاں تو صرف والد کا ذکر ہے لیکن ایک دوسرے حدیث میں والد کے مقابلے میں والدہ کا حق زیادہ بتلایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" ابوہریرہرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے

---

[1]مسلم،کتاب البر والصلۃ،باب رغم انف من ادرک ابویہ او احدھما عنداالکبر فلم یدخل الجنۃ،رقم:6674

[2]مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانھما احق بہ،رقم:6671

[3]نووی،ج16،ص104

[4]محمد بن عيسى ، أبو عيسى ،الترمذي ،الجامع الصحيح سنن الترمذي،دار إحياء التراث العربي – بيروت،بدون تاریخ

[5]ترمذی،کتاب الطلاق،باب الرجل یسئالہ ابوہ ان یطلق زوجتہ،رقم:1189

[6]قال الالبانی ھذا حدیث صحیح،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج1،ص189

پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ ہے"[1]

امام طحاوی [2]رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:جب والد کا حکم ماننے کی وجہ سے بیٹے کے لیے بیوی چھوڑنا ضروری ہوتا ہے تو والدہ کا حکم ماننا اس سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ والدہ کا حق والد کے مقابلے میں زیادہ ہے۔[3]

لیکن اس کے برعکس بعض علماء یعنی حنابلہ اس بات کے قائل ہیں کہ بیٹے پر بیوی کے طلاق کے سلسلے میں والدین کی طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے یعنی بیٹے کے لیے ضروری نہیں ہےکہ جب والدین اُسے بیوی کی طلاق کا کہے اور وہ مجبو ر ہو کر حکم مانے یا وہ اپنے بیٹے کو کسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے سے روکے،کیونکہ طلاق کے نقصانات خصوصا اولاد کے سلسلے میں کافی مشکلات پید ا کرتے ہیں بخلافِ والدین کے ، کہ اگرچہ وہ ناراض ہو جائیں گے لیکن ممکن ہے اُنہیں کسی طریقے سے راضی کیا جائے۔اور قاعدہ ہے کہ جب دو قسم کے شر کسی ایک معاملے میں جمع ہو اور دونوں سے خلاصی کی کوئی صورت نہ ہو تونسبتاََ آسان کو اختیا ر کرنا چاہئیے۔"وصرح الحنابلة : أنه لا يجب على الرجل طاعة أبويه ولو عدلين في طلاق أو منع من تزويج.وما قد يترتب على الطلاق من أضرار، وبخاصة الأولاد، يحتمل في سبيل دفع ضرر أشد وأكبر، عملاً بالقاعدة: «يختار أهون الشرين»[4]۔حنابلہ نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ مرد پر طلاق یا نکاح سے منع کرنےمیں صالح والدین کی اطاعت بھی لازم نہیں ہے۔کیونکہ طلاق میں خاص کر بچوں کے حوالے سے جو ضرر ہے اُسی ضرر کو دفع کرنے کی وجہ سے یہ (والدین کا حکم نہ ماننا) برداشت کیا جاتا ہے۔کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب دو قسم کے ضرر جمع ہو جائیں تو اس میں جو نسبتا کم نقصان والا ہو ،اُسی اختیار کرنا چاہئیے"۔

اور سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص والدین کو روتےہوئے چھوڑ کرہجرت کرنے کی غرض سے آیا لیکن آپ ﷺ نے اُسے واپس کر دیا جیسا کہ:

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ سے ہجرت پر بیعت کروں، اور میں نے اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑآیا ہوں ، آپ ﷺنے فرمایا" :تم ان کے پاس واپس جاؤ اور انہیں جس طرح تم نے رلایا ہے اسی طرح ہنساؤ"[5]

***...والدین کی خوشی کے خاطر اُن کے رشتہ دار اور دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک:**ایک خوشحال اور کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے افراد کےدرمیان باہم ربط ہو جو ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی غمی کو محسوس کر سکے۔والدین کا چونکہ معاشرے میں دیگر افراد کے ساتھ عموما اور اولاد کے ساتھ خصوصا تعلق ہوتا ہے اس وجہ سے اولاد کو اُن کی خوشحالی کے خاطر اُن کی انتہائی رعایت رکھنے کا

---

[1]بخاری،کتاب الادب،باب من احق الناس بحسن الصحبۃ،رقم:5971،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانھما احق بہ،رقم:6664

[2]احمد بن محمد بن سلامۃ،ازدی،حجری،مصری،طحاوی،حنفی،مصر کے علاقہ طحا میں 239ھ کو پیدا ہوئے۔فقہ اور حدیث میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ابتدائی عمر میں شافعی المسلک تھے،پھر حنفی ہوگئے۔قاہرہ میں 321ھ کو وفات پائے۔سیر اعلام النبلاء15/27-32،الاعلام1/206

[3]احمد بن محمد،ابن سلامۃ،شرح مشکل الآثار،ج3،ص418،مؤسسۃ الرسالۃ،1415ھ

[4]الفقہ الاسلامی وادلتہ،ج9،ص336

[5]سنن ابو داؤد،کتاب الجہاد،باب فی الرجل یغزو وابواہ کارھان:رقم:2530

حکم دیا گیا ہے۔اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ اُن کو خوشی کے مواقع فراہم کئے جائیں۔اُن کے اصلی حقوق کے بارے میں تو پہلے عرض کیا گیا ہے۔مزید اُن کی رعایت کے خاطر اُن کے دوست احباب کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔تاکہ والدین کو خوشی حاصل ہو۔اسلام نے والدین کو خوش کرنے کے لیے ہر ممکن طریقے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ظاہر ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو ں تو اُن کے دوست احباب بھی اُسی عمر کے ہوں گے۔اس وجہ سے اُن کے بڑھاپے کو دیکھ کر بھی اُن کے ساتھ والدین جیسے سلوک کرنا چاہئیے۔خاص کر اُن کے ساتھ مل بیھٹنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اُن کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔

والدین کے احباب ، عزیز واقارب کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں احادیث میں بہت سار ے واقعات اور احکامات موجود ہیں ۔جیسا کہ:

(الف): سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ کی روایت میں ہے:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک دیہاتی ملے۔عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اُس کو سلام کیا اور اس کو اپنی سواری پر بٹھایا،اپنے سر سے عمامہ اتار کر اُسے دیا۔اُن کے رفقاء میں سے ابن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے یہ دیہاتی لوگ تو بہت کم چیز پر بھی خوش ہوتے ہیں(آپ نے اسے اتنی اہمیت کیوں دی؟) اس پر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کے والد کے میرے والد سے تعلقات تھے اور میں نے نبی علیہ السلامکو فرماتے ہوئے سنا" :سب سے بہتر سلوک اور سب سے اچھا برتاؤ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے"[1]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں والد کے دوستوں کے ساتھ احسان اوراکرام کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔جو اصل میں والد کے ساتھ احسان اور اکرام ہے۔کیونکہ اُن کے ساتھ احسان تو اپنے والد ہی کے واسطے سے ہے۔والد کاذکر تو یہاں صراحت کے ساتھ ہے لیکن اس کے ساتھ ماں،دادا،نانا،اساتذہ،شوہر اور بیوی بھی شامل ہیں(یعنی اِن مذکورہ رشتہ داروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی ایسے ہی سلوک کا حکم ہے)[2]۔

***...بوڑھوں سے متعلق فقہی احکام:**شریعتِ مطہرہ نے جتنے بھی احکام دئیے ہیں سب میں آسانی کو ملحوظ نظر رکھ کر لازم کئے ۔ایسا کبھی نہیں ہو اکہ انسان میں کسی کام کی طاقت نہ ہو اور اسلام اس سے مطالبہ کرتا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالٰی نےانسان کو اُس کی طاقت اور قدرت کے مطابق احکام دئیے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالٰی کا جا بجا ارشاد ہے:

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں کرتا۔ اچھے کام کا اچھا بدلہ اور برے کام کا برا بدلہ ملے گا "[3]

اورا رشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کے مطابق جو
اس کو دیا ہے۔ اور اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا"[4]

اسی وجہ سے بندہ جب جوان ہوتا ہے تو اسلام اُس کو عبادات وغیرہ میں کوئی رعایت نہیں رکھتا، لیکن جب وہ کمزور اور بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی کمزوری کی مناسبت سے اُسے رعایت دی جاتی ہے مثلاًجوانی میں نماز کھڑے ہو کر پڑھتا تھا اب بڑھاپے میں بیٹھ کر یا

---

[1]صحیح مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوہما،رقم:6677

[2]نووی شرح مسلم،ج16،ص110،109

[3]البقرۃ2:286

[4]الطلاق7:65

لیٹ کر پڑھنے کی اجازت ہو گی،روزے نہ رکھ سکنے کی صورت میں کفارہ کافی ہوگا اور حج پر جانے کی اگر قدرت نہیں تو فرضیت کی صورت میں اپنا کوئی قائم مقام بھیجے جانے کی اجازت ہوگی، اور جہاد کا ساقط ہونا وغیرہ ۔احادیث میں صراحتہَ یہ رعایتیں موجود ہیں۔جیسا کہ بخاری کی روایت ہے:

"عمران بن حصین [1]رضی اللہ عنہنے کہا کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ اس لیے میں نے نبی علیہ السلامسے نماز کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو"[2]

مریض کے لیے بیٹھ کر،لیٹ کر یا ٹیک لگا کرنماز پڑھنے کی اجازت اس حدیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہے ۔کیونکہ مریض کے قویٰ کمزور ہو چکے ہوتے ہیں جبکہ بڑھاپے میں تو امراض وغیرہ کی وجہ سے اکثر یہی کیفیت رہتی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:
"ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے نبی علیہ السلامکو کبھی بیٹھ کر نماز پڑھتے نہیں دیکھا البتہ جب آپ عمر رسیدہ ہو گئے تو قرآت قرآن نماز میں بیٹھ کر کرتے تھے، پھر جب رکوع کا وقت آتا تو کھڑے ہو جاتے اور پھر تقریباً تیس یا چالیس آیتیں پڑھ کر رکوع کرتے" حَتَّى أَسَنَّ " کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ "جب بوڑھے ہو گئے"[3]
اسی طرح اُ ن کے روزوں کا معاملہ ہے اگر روزے نہیں رکھ سکتے تو نہ رکھنے کی اجازت ہے اور پھر شریعت کی طرف سے مقرر کردہ کفارہ ادا کر دے۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے :

"اور روزہ نہ رکھ سکنے والے اپنے روزوں کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں"[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق" يُطِيقُونَهُ " سے مراد بڑی عمر کے لوگ ہیں[5]۔
جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے:"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یوں قرآت کر رہے تھے بابِ تفعیل سے۔ "ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ اس سے مراد بہت بوڑھا مرد یا بہت بوڑھی عورت ہے۔ جو روزے کی طاقت نہ ہو، انہیں چاہئیے کہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔[6]
حج کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ جس پر حج فرض ہوا ہو اور اس نے ادا نہیں کیا ہو تو اس کی جگہ دوسرا شخص حج بدل کر سکتا ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ:

"ایک خشعمی عورت آئی حجۃ الوداع کے موقع پر اور عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے والد پرحج

[1]عمران بن حصین بنعبید بن خلف،الخزاعی،غزوہ خیبر کے سال مسلمان ہوئے۔بہت سے غزوات میں شریک ہوئے۔فتح مکہ کے دن قبیلہ خزاعہ کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھابصرہ میں سن 52یا 53ھ کو وفات پائے۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج4،ص705
[2]بخاری،کتاب تقصیر الصلوۃ، باب اذا لم یطق قاعدا صلی علی جنب ،رقم:1117
[3]بخاری ،کتاب الجمعۃ،باب اذاصلی قاعدا ثم صح،اووجد خفۃ تمم مابقی ،رقم:1118
[4]البقرہ 184:2
[5]الجامع لاحکام القرآن،ج2،ص288
[6]بخاری،کتاب التفسیر،باب قولہ تعالی:ایامامعدودات فمن کان منکم مریضا او علی سفر الآیۃ،رقم:4505

فرض ہے لیکن وہ بہت بوڑھا ہے کیا میں ان کی طرف سے
حج کر سکتی ہوں؟آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں"[1]

جہاں تک جہاد کا تعلق ہے اس میں دیگر عبادات کے مقابلے میں قوت وطاقت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔کمزوری فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بنتی ہے اور کمزوروں پر اللہ تعالی نے جہاد لازم نہیں فرمایا ۔قرآن کریم کے نقطہ نظر سے عمررسیدہ لوگوں جہاد کا حکم ساقط ہوجاتا ہے ارشاد ربانی ہے:

" ضعیفوں،بیماروں اور ان لوگوں پر جن کے پاس خرچ
موجود نہیں کچھ حرج نہیں جب کہ اللہ اور اس کے رسول کے
خیرخواہ ہوں۔ نیک انسانوں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔
اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"[2]

اس آیت کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن میں کچھ یوں ہے۔"اللہ کے اس فرمان" لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ "میں ارشادہے کہ کسی کام سے عاجز بندے سے "تکلیف"اُٹھا دی جاتی ہے۔پس جب بھی بندے میں یہ صفت پائی گئی وہ مکلف نہیں رہے گا لیکن اس کی صورتیں مختلف ہوں گی مثلا

1۔ یا تو وہ حکم بالکلیہ ساقط ہو جائے گا
2۔یا اس کا بدل دیا جائے گا۔

"عجز"کی یہ حالت عام ہے چاہے بدنی کمزوری ہو یا مالی کمزوری ہو[3]۔

اوراس کی نظیر اس آیت میں ہے:

"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی کام کا پابند
نہیں بناتا۔ اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا برے
کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا "[4]

جدید دنیا نے عمررسیدہ انسانوں کو جتنے حقوق دئیے ہیں وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسلام کے مقرر کردہ حقوق کے ساتھ ان کا تقابل کیا جائے۔کیونکہ اِن کے حقوق کا تعلق اُن کی مادی ضروریات سے ہوتا ہے۔جیسے علاج معالجہ،اشیائے زندگی کی قیمتوں میں کمی وغیرہ۔بلکہ بعض مغربی ممالک میں تو باقاعدہ اُن کو ایک خاص جگہ تک محدود کر کے اُن کے خرچ خوراک،خدمت اور مکان کی ذمہ داری لی جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات بالکل مختلف ہیں اسلام سب سے پہلے انسان کے تکریم وتعظیم کی قائل ہے،ارشاد ربانی ہے:

"اور انسان کو ہم نے عزت دے دی اور ان کو جنگل اور دریا
میں سواری دی اور پاکیزہ روزی دے دی اور اپنی بہت سی
مخلوقات پر فضیلت دی"[5]

اسلام نہ صرف انسان کی مادی ضروریات کی بات کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی ضروریات کو بھی مدنظر رکھتا ہے ۔جس کے ذریعے انسان کرامت اور عزت کا مستحق بن جاتا ہے۔اور موت تک تمام حقوق کا اہل قرار پاتا ہے۔اسلام معاشرے کے تمام افراد

---

[1] صحیح بخاری،کتاب الحج،باب الحج عمن لایستطیع الثبوت علی الراحلۃ ،رقم:1854
[2] التوبۃ91:9
[3] القرطبی،ج8،ص226
[4] البقرۃ286:2
[5] الاسراء70:17

کے حقوق تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرے عام لوگوں کے بنسبت عمررسیدہ انسانوں کے حقوق کو پہلے ذکر کرتا ہے اور اس میں غفلت بالکل برداشت نہیں کرتا۔

پھر یہ بات بھی اہمیت کی قابل ہے کہ اسلام نہ صرف مسلمان بوڑھوں کی بات کرتا ہے بلکہ غیر مسلم عمررسیدہ افراد بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں۔کیونکہ انسان اسلام انسان کی کرامت کا سب سے بڑا داعی ہے پس اس لحاظ سے غیر مسلم بزرگ(بوڑھے) بھی حسن سلوک کے مستحق ہوتے ہیں اور اُن کے ساتھ احسان کرنا نیکی ہے جس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا۔سیدہ اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی والدہ اسلام لانے سے پہلے ایک دفعہ وہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں۔آپ رضی اللہ عنہا نے نبی علیہ السلام سے اُن کے ساتھ صلہ رحمی کے بارے میں پوچھا (کہ کیا میں اُن کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہو؟) نبی علیہ السلام نے باقاعدہ اس کی اجازت دی جیسا کہ صحیحین کی روایت ہے:

> "اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامکے زمانے میں میری والدہ)قتیلہ بنت عبدالعزیٰ(جو مشرکہ تھیں، میرے یہاں آئیں۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، میں نے یہ بھی کہا کہ وہ)مجھ سے ملاقات کی(بہت خواہشمند ہیں، تو کیا میں اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کر"[1]

" صِلِي أُمَّكِ"میں ہرقسم کے صلہ رحمی کا حکم اور اجازت موجود ہے جس کی تائید اللہ تعالی کے اس قول سے بھی ہوتا ہے:

> " جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر مانباپ کا نفقہ مسلمان بیٹے پر لازم ہے[3]۔

شریعت مطہرہ کے احکامات کی تابع داری میں صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اور اُمّت کے سلف صالحین کا ہمیشہ یہ عمل رہاہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسے عمل کے روادار تھے جس طرح اپنے مسلمانوں سے برتاو رکھتے تھے۔اور اس کے مثالیں بے شمار ہیں جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی سے اس وجہ سے جزیہ ساقط کیا تھا کہ وہ بوڑھا تھا کمائی کے قابل نہیں رہا تھا بلکہ حسن سلوک کا اعلٰی ترین مثال قائم کرکے بیت المال سے اُسے مال دیا تھا۔اُن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ [4]نے بھی اس پر عمل کیا تھا وہ خود اہلِ ذمہ میں سے ایسے بوڑھے تلاش کرتے اور اُن کے جزیے کو معاف فرما دیتے۔

---

[1]صحیح بخاری،کتاب الھبہ،باب الھدیۃ للمشرکین، رقم:2620،صحیح مسلم،کتاب الزکوۃ،باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین والزوج والاولا والوالدین،رقم:2372

[2]الممتحنہ8:60

[3]یہ امام ابن حجر رحمہ اللہ کا قول ہے۔فتح الباری،ج5،ص234

[4]ابو حفص عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکمؒ القرشی ہیں۔ تبع تابعی ہیں۔متقی ،فقیہ ،محدث اور امیر المومنین تھے۔مثالی عدل و انصاف قائم کرکے عمر ثانی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ 101ھ/720ء کو میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔(الذہبی ،سیر اعلام النبلاء،ج5،ص114۔الزرکلی،الاعلام ، ج5،ص50)۔

ابو عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر اہل ذمہ میں سے کوئی ایک دینار کی ادائیگی سے بھی عاجز ہوجاتا تو اسے جزیہ معاف فرماتا یہاں تک کہ انہوں نے ایک بوڑھے ذمی کے لیے بیت المال سے روزینہ بھی مقرر فرمایا کیو نکہ انہوں نے ایک بوڑھے ذمی کو لوگوں سے مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔[1]

آگے مزید فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے ایک عامل سے اہل ذمہ سے جزیے لینے کے متعلق ارشاد فرمایا: ذمیوں میں جو لوگ بوڑھے ہو چکے ہو،اُن کی قوت کمزور ہوچکی ہواورمعاش سے عاجز آگئے ہو تو اُن کے لیے اُن کی ضروریات کے مطابق مسلمانوں کے بیت المال سے کچھ مقرر کرو اور اگر کسی مسلمان کا کوئی غیر مسلم غلام ہو اوروہ بھی بوڑھا،کمزوراور کسب سےعاجز ہو تو اُس مسلمان آقا پر لازم ہے کہ وہ اُس کا خرچہ اُس وقت تک برداشت کرے جب تک وہ زندہ ہے یا آزاد ہو جائے۔ اور یہ حکم میں اس لیے دے رہا ہو کہ مجھے امیر المؤمین عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات پہنچی ہے کہ ایک آپ رضی اللہ عنہ ایک بوڑھے ذمی کے پاس سے گزرے جو لوگوں سے مانگ رہا تھا۔آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایاتھا کہ ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ تیرے جوانی کے ایام میں تم سے جزیہ لیتے تھے اورآج تمہیں نہیں پوچھ رہے(یعنی تمہارے ضروریات پورے نہیں کر رہے)پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اُس کےلیےاُس کے ضرورت کے مطابق بیت المال سے روزینہ جاری فرمایا:

اُن ذمیوں کو دیکھو جو بوڑھے ،کمزور اور کام کاج سے عاجزہوچکے ہو،پس اُن کے لیے مسلمانوں کے بیت المال سے اُن کے اخراجات کے مطابق وظیفہ جاری کرو۔اگرکسی مسلمان کا کوئی مملوک بوڑھا ،کمزور اور کام کاج سے عاجزہوچکا ہوتو اُس کو چاہئیے کہ اُس کے موت یا آزادی تک اُس کی خرچ خوراک کا انتظام کریں۔اور یہ (میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ)خبر امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہنچا ہے کہ ایک دفعہ جب آپ رضی اللہ عنہ ایک بوڑھے ذمی کے پاس سے گزرے جو لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مانگ رہے تھے۔(یہ دیکھ کر) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے فرمایا:ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ تیری جوانی کے ایام میں تجھ سے جزیہ لیتے رہے اور اب تیرے بڑھاپے میں تجھے بھلا دیا۔اُس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ اُس کے اخراجات کے مطابق اُسے بیت المال سے وظیفہ جاری فرمایا"۔ [2]

[1]قاسم بن سلام،ابو عبید،کتاب الاموال،ج1،ص51،دار الفکر،بیروت،بدون تاریخ

[2]کتاب الاموال،ج1،ص51

فصل چہارم
یتیموں، فقراء ومساکین، مریضوں کے سماجی حقوق

یتیم اُس نابالغ بچے کو کہا جاتا ہے جس کا والد وفات پا چکاہو۔اور دیگر حیوانات میں اُس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو[1](یعنی وفات پا چکی ہو)۔اصل میں " یتم" کے مادے کے معانی میں تنہائی،غفلت اور سستی کے آتے ہیں[2]۔ کیونکہ یتیم کی زندگی میں باپ کے مرنے کے بعد تنہائی ہی آتی ہے۔اور اسی طرح باپ کے سایہ سے محروم ہونے کے سبب اکثر اُ س

[1]تہذیب اللغۃج14،ص241
[2]النہایہ،ج5،ص292

کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتی جاتی ہے۔اور باقاعدہ نگران نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں غفلت اور لاپرواہی ایک عام معمول کی بات بن جاتی ہے۔ بلوغت کے بعد انسان سے " یتیم" کا نام زائل ہو جاتا ہے۔لیکن کبھی کبھی مجازی طور پر بالغ کوبھی " یتیم" کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی علیہ السلام"کو ابوطالب کا یتیم"کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے کیونکہ انہوں نے نبی علیہ السلام کی پرورش فرمائی تھی[1]۔

یتیمی کا زمانہ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔جس کاسامنا بچپن میں کیا جاتا ہے۔جس کااس کے مستقبل پر گہرااثر پڑتا ہے۔بچپن میں والدین کی تربیت اور شفقت سے بچے محروم ہوتے ہیں۔کمانے والا باپ نہ ہونے کی وجہ سے اِن میں اپنے غیر محفوظ ہونے اور کمزور ی کا احساس ہمیشہ پایا جاتا ہے۔اس وجہ سے اسلام نے اِن یتیموں کا خاص خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔اور گھر کے دیگر افراد،رشتہ داروں،ہمسائیوں اور پورے معاشرے کی یہ ذمہ داری مقرر کی ہے کہ یتیموں کی کفالت،پرورش،نان نفقے اور دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرنا تمہارے فرائض میں داخل ہیں۔قرآن کریم اورسنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں یتیموں کی رعایت رکھنے کے بارے میں ایسی جامع ہدایات موجود ہیں جن پر عمل کرکے کوئی بھی معاشرہ صحیح معنوں میں انسانی فلاحی معاشرہ بن سکتا ہے۔یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم کسی خاص فرد کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ معاشرے کے تمام افراد کی ذمہ داری بنتی ہے۔اُن کی دنیاوی ضروریات کے پیش نظرزکوٰۃ،مالِ غنیمت،مال فئے اور میراث میں باقاعدہ اُن کے حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ اللہ جل شانہ اپنے کلامِ پاک میں باربار اُ ن کے حقوق وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔جیسا کہ:

"جو مال اللہ نے اپنے رسول کو دیہات کے لوگوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اوررسول کے اور (رسول کے) رشتے داروں کے اور یتیموں کے اور ضرورت مندوں کے اور مسافروں کے لئے ہے۔ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں ان ہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔ سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو۔ اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بےشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔ اور شیریں کلامی سے پیش آیا کرو"[3]

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ یتیموں کو کھلانے پلانے والوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اور اس کے باوجود کہ ان کو خود خوراک کی خواہش ہے غریبوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں"[4]

نیکی کی حقیقت بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

---

[1] تھذیب اللغۃ،ج14،ص242

[2] الحشر7:59

[3] النساء8:4

[4] الانسان 8:76

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلو بلکہ
نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر
اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود
عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور
مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں میں اور نماز
پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔
اور سختی اور تکلیف میں اور کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔
یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی ہیں جو ڈرنے والے ہیں"[1]

یتیموں کو کھلانا پلانا اتنا اہم ہے کہ اُسے والدین کے ساتھ ایک جگہ ہی مقام میں ملا کر تاکید فرمائی:

" لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ
دو کہ جو مال خرچ کرنا چاہو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتے
داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور
جو بھلائی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے"[2]

جہاد میں حاصل شدہ مالِ غنیمت میں بھی اُن کا حق لازمی قرار دیا گیا۔اللہ تعالی فرماتا ہے:

"اور جان لو کہ جو چیز تم لوٹ کر لاؤ اس میں سے خمساللہ
اور اس کے رسول اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور
محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس
(نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق وباطل میں) فرق کرنے
کے دن (یعنی جنگ بدر میں) جس دن دونوں فوجوں میں مڈھ
بھیڑ ہوگئی۔ اپنے بندے (محمد) پر نازل فرمائی۔ اور اللہ ہر
چیز پر قادر ہے"[3]

یتیم کے مال کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے۔گھر کے افراد ہوں،رشتہ دار ہوں یا معاشرے کے دیگر افراد ہوں سب پر یتیم کے مال کی نگران کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اُسے ناحق طریقے سے کھانے سے انتہائی سخت الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔نہ تو خود اُس میں کوئی کھاسکتا ہے اور نہ ہی اُسے کسی دوسرے کے حوالے کر سکتا ہے اور نہ ہی اُسے ضائع کرنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے:

"اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا مگر ایسے طریق
سے کہ بہت بہتر ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔ اور
عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی"[4]

جو کوئی بھی اس حوالے سے اسلام کے مقرر کردہ اصول سے انحراف کرتے ہوئے مالِ یتیم کھانے کا مرتکب ہو، اُس کے بارے میں ارشاد ہے:

---

[1] البقرۃ2:177
[2] البقرۃ2:215
[3] الانفال8:41
[4] الاسراء17:34

یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانے والے اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اور (قیامت کے دن) دوزخ میں ڈالے جائیں گے"[1]

اسلام نے یہ بھی بتایا ہے کہ یتیم کے مال کا نگران کب تک اس کے مال کی نگرانی کرتا رہے گا،نیز کن حالات میں وہ یتیم کے مال کو ذاتی استعمال میں لاسکتا ہےاور وہ یتیم کا مال اُس کو کس عمر میں واپس کرے گا؟ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

"اور بالغ ہونے تک یتیموں کوکام کاج میں مصروف رکھو پھر اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کردو اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہوجائیں گے اس کو فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔ جو شخص آسودہ حال ہو اس کو پرہیز رکھنا چاہیئے اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر کچھ لے لے اور جب ان کا مال ان کے حوالے کرنے لگو تو گواہ کرلیا کرو۔ اور حقیقت میں تو اللہ ہی حساب لینے والا کافی ہے"[2]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یتیم سے حسن سلوک صفات الٰہی میں سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نبی علیہ السلام کو احسان کے طور پر ارشاد فرماتا ہے:" أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى[3]

"کیااس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی ؟ "

اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا کہ یتیم پرکبھی بھی بلاوجہ غصہ نہ کرو:"تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا"[4]

یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اللہ تعالی نے اپنی ذات میں شرک کرنے سے منع فرمانے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے وہاں یتیم کو بھی ذکر کیا ہے۔ارشاد ہے:

" اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤاور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسائیوں اور اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا"[5]

احادیث مبارکہ میں بھی یتیم کے تربیت،اُس کے مال اور متعلقہ دیگر امور کے بارے میں ارشادات موجود ہیں۔

یتیموں کی مادی ضرورریات پوری کرنے کے بارے میں نبوی ارشادات:

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ یتیم وہ ہوتا ہے جو بلوغت سے پہلے والد کے سایہ سے محروم ہوچکا ہو ۔اُس کے کھلانے پلانے ،گھر کا سایہ فراہم کرنے والے اوردیگر حاجاتِ دنیویہ پوری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۔اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے اِس کی طرف توجہ

---

[1] النساء10:4
[2] النساء6:4
[3] الضحی 6:93
[4] الضحی9:93
[5] النساء36:4

دی ہے اور اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے معاشرے کے تمام افراد کو حکم دیا کہ وہ یتیموں کی ضروریات پوری کریں ۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ نے شہادت اور درمیانی انگلیوں کے اشارہ سے (قرب کو)بتایا"[1]

پرورش میں ہر قسم کی ضروریات زندگی آتی ہیں۔یتیم کی پرورش کرنے والے عموما ذوی الارحام میں سے ہوتے ہیں جیسے دادا،چچا،وہ متوفی عنہا زوجہا جو اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کرتی۔ اور کبھی کبھی ان کے علاوہ بھی ہوتے ہیں ۔پرورش کرنے والے چاہے اپنے ہوں یا پرائے سب کو ایک جیسا ثواب ملتا ہے۔

حدیث میں مذکورہ "کافل الیتیم "کی حیثیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اُسے جنت میں رسول اکرم کی ہمسائیگی میسر ہوگی۔علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی اور"کافل الیتیم "کے درجات کے درمیان اتنا فرق ہو گا جتناکہ شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کے درمیان ہے[2]۔

اور ابن بطال رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس کسی نے بھی یہ حدیث سنی اُس پر لازم ہے کہ وہ نبی کی رفاقت کے حصول کے خاطر اس پر عمل کرے۔ کیونکہ آخرت میں اس سے زیادہ بہتر کوئی درجہ نہیں ہے[3]۔

"کفالت الیتیم" کی ذمے داری کسی ایک فر د میں محصور نہیں بلکہ پورے معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داری ہے ۔اس وجہ سے نبی علیہ السلام نے صدقے میں یتیم کا کچھ نہ کچھ حصہ مقرر کر دینے کا حکم فرمایا ہے ایک حدیث میں ہے کہ:

> "نبی علیہ السلامایک دن منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمہارے متعلق اس بات کا خوف ہے کہ تم پر دنیا کی خوشحالی اور اس کی زیبائش و آرائش کے دروازے کھول دئیے جائیں گے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کیا اچھائی برائی پیدا کرے گی؟ اس پر نبی علیہ السلامخاموش ہو گئے۔ اس لیے اس شخص سے کہا جانے لگا کہ کیا بات تھی۔ تم نے نبی علیہ السلامسے ایک بات پوچھی لیکن نبی علیہ السلامتم سے بات نہیں کرتے۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ بیان کیا کہ پھر نبی علیہ السلامنے پسینہ صاف کیا (جو وحی نازل ہوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے لگتا تھا)پھر پوچھا کہ سوال کرنے والے صاحب کہاں ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے (سوال کی)تعریف کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھائی برائی نہیں پیدا کرتی(مگر بے موقع استعمال سے برائی پیدا ہوتی ہے)کیونکہ موسم بہار میں بعض ایسی گھاس بھی اگتی ہیں جو جان لیوا یا تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ ہریالی چرنے والا وہ جانور بچ جاتا ہے کہ

---

[1]صحیح بخاری،کتاب الادب،باب فضل من یعول یتیما،رقم:6005

[2]فتح الباری،ج10،ص436

[3]شرح صحیح بخاری لابن بطال،ج9،ص217

خوب چرتا ہے اور جب اس کی دونوں کوکھیں بھر جاتی ہیں تو سورج کی طرف رخ کر کے پاخانہ پیشاب کر دیتا ہے اور پھر چرتا ہے۔ اسی طرح یہ مال و دولت بھی ایک خوشگوار سبزہ زار ہے۔ اور مسلمان کا وہ مال کتنا عمدہ ہے جو مسکین ' یتیم اور مسافر کو دیا جائے۔ یا جس طرح نبی علیہ السلامنے ارشاد فرمایا۔ ہاں اگر کوئی شخص زکوٰۃ حقدار ہونے کے بغیر لیتا ہے تو اس کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اور قیامت کے دن یہ مال اس کے خلاف گواہ ہو گا"[1]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یتیم کے پاس بھی مال ہوتا ہے اور اسلام ہر کسی کو میراث میں اُس کاحق دیتا ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا،مرد ہو یا عورت۔لیکن طبعی طور پر وہ چونکہ چھوٹا ہوتا ہے اور اپنے مال کی حفاظت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اُس میں کوئی فائدہ مند تصرف کر سکتا ہے اس وجہ سے اسلام نے اُس کے ولی کے ذمےیہ امورمقرر کئے ہیں کہ اُ س کی بلوغت تک وہ اُس کے مال کا انتظام وانصرام کرے اور بھول کر بھی یتیم کے مال سے کچھ کھانے یا لینے سے انتہائی سخت الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔کیونکہ یہ گناہ کبیرہ میں سے ہے۔حدیث کے الفاظ ہے کہ:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا ’’سات مہلک گناہوں سے بچو۔ صحابہ نے پوچھا: اےاللہ کے رسول! وہ کیا کیا ہیں؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی کی جان لینا جو اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیرنا اور پاک دامن غافل مومن عورتوں کو تہمت لگانا"[2]

" الْمُوبِقَات "سے مراد وہ گناہ ہیں جو انسان کو(آخرت میں) ہلاک کر دیتا ہے۔

ہاں یہ بات ہے کہ اگر ولی خود فقیر ہو تو وہ یتیم کے مال سے مناسب اندازے کے مطابق کچھ نہ کچھ لے سکتا ہے جیسا کہ ابو داؤد کی روایت ہے:

" ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں محتاج ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے، البتہ ایک یتیم میرے پاس ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :اپنے یتیم کے مال سے کھاؤ، لیکن فضول خرچی نہ کرنا، نہ جلد بازی دکھانا(اس کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے)نہ اس کے مال سے کما کر اپنا مال بڑھانا"[3]

اسی طرح کی دوسری روایت جو صحیحین میں ہے ،یہ ہے کہ:

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے(قرآن مجید کی اس آیت" وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ، وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ "اور جو شخص مالدار ہو وہ اپنے کو یتیم کے مال سے بالکل روکے رکھے ' البتہ جو شخص نادار ہو تو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے‘‘کے بارے میں فرمایا کہ یتیموں

[1] بخاری،کتاب الزکٰوۃ،باب الصدقۃ علی الیتامٰی،رقم:1466،مسلم،کتاب الزکوٰۃ،باب تخوف مایخرج من زھرۃ الدنیا،رقم:2470

[2] بخاری،کتاب المحاربین،باب رمی المحصنات،رقم:2766،مسلم،کتاب الایمان،باب بیان الکبائر واکبرھا،رقم:272

[3] سنن ابو داؤد،کتاب الوصایا،باب ماجاء فی مالولی الیتیم ان ینال من مال الیتیم،رقم:2874

کے ولیوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ یتیم کے مال میں سے اگر ولی نادار ہو تو دستور کے مطابق اس کے مال میں سے لے سکتا ہے"[1]

یتیم کی معصومانہ خواہشات کی تکمیل کرنا: بچپن میں بچے کو نہ صرف کھانے پینے اور کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے علاوہ دیگر بھی امور کی بھی ضرورت ہوتی ہیں۔کامل محبت،نرمی اورشفقت کے برتاؤ کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ایک بہترین استاد،مربّی،محافظ اوراُس سے مضرّات دفع کرنے والا بھی ہونا ضروری ہو تا ہے۔کیونکہ یہ ایسے لازمی امور ہیں جن سے کوئی بھی انسان عموما اور یتیم خصوصا مستثنی نہیں ہو سکتا۔کیونکہ یہ امور ایسے ہیں جن میں باپ کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے۔اور باپ کی غیر موجودگی میں بچہ اِن سہولیات سے محروم رہتا ہے۔اس وجہ سے غیر محسوس طریقے سے وہ اپنے آپ کواِن تمام سہولیات سے محروم سمجھتا ہے۔جن سے دوسرے بچے مستفید ہوتے ہیں۔ سنت نبویہ نے اِن تمام امور کو مد نظر رکھ کرمعاشرے کے افراد کو اس طرف متوجہ کیا ہے۔تاکہ یتیم کی صحیح تربیت کئے جانے سے وہ معاشرے کا ایک مفید شہری بن کر ابھرے۔اور تخریبی ذہنیت سے محفوظ رہے۔اور یہ کہ یتیم اُس احساس سے نکل جائے جس کے نتیجے میں ُاسے معاشرے میں صحیح تربیت نہ ہونے کے وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس وجہ نبی علیہ السلام نے فرمایا جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا:"میں اور یتیم کا کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح(اکٹھے)ہوں گے۔اور اپنےشہادت اور درمیان والی انگلی سے اشارہ فرمایا[2]

الغرض ایک اسلامی معاشرے میں ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں اللہ کے دین کی خاطر مسلمانوں سے قُربانی مطلوب ہوتی ہے جس میں جہاد بھی آتا ہے۔جس کے نتیجے میں بہت سارےبچے یتیم ہو جاتے ہیں۔اور یہ کہ عورت کےمقابلے میں مرد کو خطرات کا سامنا زیادہ رہتا ہے اس وجہ سے واقعات کے نتیجے میں اُن کی شرح فوتگی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔

اسلامی معاشرہ چونکہ ایک کامل اور مکمل معاشرہ ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام نے زندگی میں معاشرے کے تمام افرادکی رعایت رکھتے ہوئے احکامات دئیے ہیں۔جس میں ایک فرد "یتیم" بھی ہے۔قرآن کریم اور سنت نبویہ میں اسی وجہ سے یتیم سے متعلق تمام امور کے بارے میں کسی بھی شکل میں کوتاہی سے انتہائی سخت الفاظ میں منع کیا گیا ہے۔

---

[1] بخاری،کتاب الوصایا،باب ومالِلوصی ان یعمل فی مال الیتیم ومایاکل منہ بقدر عمالتہ،رقم:2765،مسلم،کتاب التفسیر،باب حدثنا محمد بن رافع،رقم:7719

[2] صحیح بخاری،کتاب الادب،باب فضل من یعول یتیما،رقم:6005

فقراء ومساکین کے سماجی حقوق

فقیر اور مسکین دونوں الفاظ قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔دونوں کے درمیان معمولی فرق ہے۔
ابن فارس کے بقول:یہ لفظ فا،قاف اور راء کے مادے سے بنا ہے۔کسی چیز کے ٹوٹنے پر دلالت کرنے کے لیے آتا ہے چاہے کسی عضو کےمتعلق ہو یا دوسری چیز کے متعلق۔اہل لغت کے نزدیک ذلت اور غربت کی وجہ سے چونکہ فقیر کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے اس وجہ سے اُس کو فقیر کہا جاتا ہے[1]۔
"الفَقِيرُ"غنی کا ضد ہے جس کے بارے میں اہل لغت کہتے ہیں:" الفَقِيرُ : الَّذِي له ما يَأْكُلُ، هو المحْتَاجُ ، عند العَرَبِ، مَنْ له بُلْغَةٌ من العَيْشِ"وہ انسان جس کے پاس قوت لایموت موجود ہو فقیر کہلاتا ہے۔
اور "مِسْكِين"کے بارے میں اہل اللغۃ کا قول ہے۔" والمِسْكِينُ : من أَذَلَّه الفَقْرُ أَو غَيْرُه من الأَحْوَالِ[2]"وہ شخص جس کو فقر وغیرہ نے بد حال کیا ہو۔یعنی وہ شخص جس کے پاس اہل وعیال کی ضرورت اور کفالت کا سامان بھی نہ ہو۔اور یہ بھی ایک قول ہے کہ مسکین اُ س کو کہا جاتا ہے کہ اُسے فقر نے حرکت کرنے سے لاچار ہو[3]۔
پھر فقیر اور مسکین کے درمیان یہ فرق ہے کہ"فقیر"وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ہو لیکن اتنا کچھ نہ ہو کہ جس سے اُس کی ضروریات پوری ہوں ۔ اور "مسکین" وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو لہذا "مسکین" کی حالت فقیر سے بدتر ہوئی۔
امام شافعی رحمہ اللہ سے منسوب ایک قول ہے کہ :"فقیر" وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور"مسکین"وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے[4]۔یعنی اُن کے نزدیک فقیر"مسکین"سے بدحال ہوتا ہے۔
اور بعض علماء کے نزدیک فقیر اور مسکین ایک ہی قسم کے لوگوں کو کہا جاتا ہے اگر چہ الفاظ مختلف ہیں۔امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے[5]۔

---

[1]احمد بن فارس،معجم مقاییس اللغۃ،،ج4،ص443،دار الفکر،1399ھ
[2]تاج العروس،ج13،ص335
[3]تاج العروس،ج13،ص335
[4]تاج العروس،ج13،ص335
[5]تفسیر قرطبی،ج8،ص 170،169

فقیروں اور مسکینوں کے بارے میں آج دنیا کی اقوام مختلف انداز میں کوششیں کر رہی ہیں۔اور دیگر قوموں کو بھی اس بارے میں حتی المقدور سعی کرنے کی استدعا کرتی ہیں۔

بعض ملکوں میں اس قسم کے لوگوں کے لیے مشاہرہ مقرر کیا گیا ہے۔جن میں بوڑھے،مریض اور کام کاج نہ کر سکنے والے سب لوگ شامل ہیں۔

اور بعض ممالک میں اُن کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کی ذمہ داری حکومت نے اپنے ذمے لی ہے۔اسی طرح دوسرے ملکوں کے پناہ گزینوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی دنیا ایک حد تک کوشش کر رہی ہے۔

لیکن اس سے ہٹ کر اسلام نے آج سے پندرہ صدی پہلے اس اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اس حوالے سے دنیا کو ایک مکمل نظام حیات دیا ہے۔جو دنیاوی نظاموں میں موجود خامیوں سے بالکل پاک اور انسانیت کی بقاء کی ضامن ہے۔کیونکہ اسلام صرف اُن کی مادی ضروریات کی بات نہیں کرتا بلکہ اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔اور یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی بھی قانون پیش نہیں کر سکتا۔کیونکہ موجودہ اقتصادی نظام اس بنیاد پر قائم ہے کہ مالدار مالدارتر اور غریب غریب تر ہوتا جائے۔مالدار لوگوں کو غریب لوگ اُس وقت یاد آتے ہیں جب اُن کی اپنی کوئی ضرورت پیش آجائے ورنہ فقیروں اور مسکینوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔عالمی معاشی نظام میں اِس قسم کے لوگوں کے لیے باقاعدہ کوئی اصول مقرر نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی دولت چند مخصوص لوگ سمیٹ رہے ہیں۔

اسلامی نظام معیشت /اقتصادیات اوردنیاوی نظامونمیں بہت زیادہ فرق ہے اسلامی اقتصادیات کی چند خصوصیات درجہ ذیل ہیں۔

(الف):سب سے اہم بات جو دنیا کے کسی بھی قانون میں نہیں ہے صرف اسلام میں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام فقیر اور مسکین کے ساتھ ہر قسم کےتعاون کو عبادت شمار کرتاہے اوریہی وجہ ہے کہ ارکانِ اسلام میں"زکوٰۃ" جیسے اہم رکن کے پورے کرنے کی غرض سے وہ مال اِنہی لوگوں کو دینے کا حکم دیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ صدقۃ الفطر،نذراورکفّارہ کے اموال کو بھی فقیر وں اور مسکینوں کو دینے کا حکم ہے۔یہ سب چونکہ عبادات سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے اِن لوگوں کے ساتھ تعاون بھی عبادت ہے۔اللہ تعالٰی کے ارشادات ہیں:

1-" خیرات کو تم اگرعلانیہ دو تو بھی اچھا ہے اور اگرچپکے سے حاجت مندوں کودو تو وہ خوب تر ہے اور تمہارے گناہوں کو بھی دور کردے گا۔ اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے"[1]

" اسی طرح ارشاد ہے:

2-"اور اللہوہیذات ہے جس نے باغات پیدافرمائے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی۔ اور(اسی طرح) کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے ہیں جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن کاٹو

---

[1] البقرۃ2:271

تو اس کا حق بھی اس میں سے ادا کرو اور بےجا نہ اڑاؤ کہ اللہ بیجا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا"[1]

اس کی اہمیت کے خاطر نماز جیسے اہم فریضے کے ساتھ باربار ذکر کیا گیاہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے:

3۔"اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر اللہ کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے"[2]

اور سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہے:

4۔"مومنو ! (اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) راہ اللہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن عذاب الیم کی خبر سنادو۔جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھ داغی جائیں گی کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو"[3]

(ب):فقراء ومساکین کے ساتھ کیا جانے والا تعاون اُن پر کوئی احسان نہیں بلکہ اس کو اُن کا حق اورایک اسلامی فریضہ قرار دیا گیا۔

اس بارے میں اللہ تعالی کے ارشادات ہیں جیسا کہ:

5۔"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا تھا"[4]

اور ارشاد ہے:

6۔" وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ[5]" اور وہ لوگ جن کے مال میں مانگنے اور نہ مانگنے والے(دونوں کا) ایک مقرر حصہ ہے۔

(ج):فقراء کی ضروریات زندگی پوری کرنا ریاست اور معاشرے کےافراد ،دونوں کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق مسؤل ہےکوئی رشتہ داری کی وجہ سے،کوئی ہمسائیگی کی وجہ سے اور کوئی کسی دوسری وجہ سے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

7۔"نیکی صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنے کو نہیں کہاجاتااصل نیکی تو یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔ اور مال باوجود عزیز رکھنے کے قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں میں، اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جب عہد کرلیں تو اس

---

[1] الانعام141:6
[2] النور56:24
[3] التوبۃ 9: 35/34
[4] الذاریات19:51
[5] المعارج70 :25،24

کو پورا کریں۔ اور سختی اور تکلیف میں اور کارزار کے وقت
ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی ہیں جو
ڈرنے والے ہیں"[1]

ایک جگہ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

8۔"اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق
ادا کرو۔ اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ"[2]

مال داروں پر فقیروں کی مدد کرنا لازمی ہوتا ہے۔اگر چہ مال دار غریبوں سے کسی معقول وجہ سے ناراض کیوں نہ ہوں۔جیسا کہ ارشاد ہے:

8۔"اور جو لوگ تم میں مالداراار وسعت والے ہیں ، وہ قسم نہ
کھائیں ،اس بات کی کہ رشتہ داروں اور محتاجوں اور مہاجرین
کو کچھ خرچ خوراک نہیں دیں گے۔ ان کو چاہیئے کہ معاف
کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم کو
بخش دے ؟ اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے"[3]

(د):فقراء سے تعاون ایسے طریقے سے کیا جانا چاہئیے کہ جس سے اُن کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور آخرت کے اچھے بدلے کا یقین بھی ہو۔دنیاوی قوانین میں فقراء اور مساکین کے ساتھ تعاون تو کیا جاتا ہے لیکن اس کا طریقِ کار کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں اِن لوگوں کی عزت نفس انتہائی مجروح ہوتی ہے ، کیونکہ اُن کی غرض اس سے مادی فوائد حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام اِن کے ساتھ تعاون کرنے کے سلسلے میں فرماتا ہے کہ یہ صرف اُن کی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے ثواب کی نیت سے دینا ہے لہذا مال وغیرہ دینے کے وقت بھی اور بعد میں بھی اُن پر احسان نہیں جتلانا چاہئیے۔جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

9۔"جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں خرچ کرتے ہیں پھر
اس کے بعد نہ اس خرچ کااحسان رکھتے ہیں اور نہ تکلیف
دیتے ہیں۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے۔ اور نہ ان کو
کچھ ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"[4]

اور اگر کسی نے اُن پر احسان جتلایا تو اسلام کی رو سے بہتر یہ تھا کہ کچھ بھی نہ دیاجاتا کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

10۔"جس صدقہ دینے کے بعدتکلیف دی جائے اس سے تو
بہتر یہ ہے کہ نرم بات کہہ لی جائے،درگزر کرنا بہتر ہے اور
اللہ بےپروا اور بردبار ہے"[5]

اس وجہ سنت نبویہ نے صدقات اور خیرات کے بارے میں فرمایا کہ جہاں تک ہو سکے خفیہ طور پر دے تاکہ کسی اورکو پتہ بھی نہ چلے بلکہ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ خود اُس فقیر کو بھی پتہ نہ چلے کہ میرے ساتھ تعاون کرنے والا کون ہے۔صحیحن کی ایک روایت ہے:

---

[1] البقرۃ177:2
[2] الاسراء26:17
[3] النور22:24
[4] البقرۃ262:2
[5] البقرۃ263:2

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا "سات آدمی ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عرش کے نیچے سایہ دے گا جبکہ اس کے عرش کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ عادل حاکم، نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں جوانی پائی، ایسا شخص جس نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے، وہ آدمی جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں، وہ شخص جسے کسی بلند مرتبہ اور خوبصورت عورت نے اپنی طرف بلایا اور اس نے جواب دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ شخص جس نے اتنا پوشیدہ صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ دائیں نے کتنا اور کیا صدقہ کیا ہے؟"[1]

(۵):فقراء ومساکین اورمعاشرے کے دوسرے افرادمیں فرق روا نہ رکھنا۔

اسلام کی نظر میں مال دار اور غریب سب برابر ہیں ۔ کیونکہ برتری اور فضیلت کا معیار مال نہیں ہے بلکہ تقوٰی ہے۔قُرآن کریم میں ارشاد ہے:

" صبح و شام اپنے رب کو پکارنےوالے اور اس کی خوشنودی کے طلبگار جو لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ صبر کرتے رہو۔ اور تمہاری نگاہیں ان میننہ دوڑیں کہ تم دنیویزندگی کی زیبائش کے طلبگار ہوجاؤ۔ اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہا نہ ماننا"[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اے مومنو ! قائم رہوانصاف پر اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارےماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔ اگر تم پیچیدا شہادت دو گے یا بچنا چاہو گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے"[3]

یہی اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ اسلام کی نظرمیں معاشرے کے تمام افراد حقوق،فرائض اور جزا وسزا میں برابر ہیں۔عملی طور پر نبی علیہ السلام نے یہ کرکے دکھایا ہے کہ اسلام میں مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے جیساکہ بنی مخزوم کی ایک عورت کی چوری کے موقع پر جب آپ سے سفارش کی گئی تو آپ نے منظور نہیں فرمایا بلکہ اس پر ناراضگی کااظہار فرمایا، بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مخزومی عورت کا معاملہ جس نے چوری کی تھی، قریش کے لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامسے اس معاملہ میں کون بات کر سکتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا، جو نبی علیہ السلامکو بہت پیارے ہیں اور کوئی آپ سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتا؟ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلامسے بات کی تو نبی علیہ السلامنے فرمایا ”کیا تم اللہ کی حدوں میں سفارش کرنے آئے ہو۔“پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا ”اے لوگو! تم سے پہلے

---

[1]بخاری،کتاب الزکوۃ،باب الصدقۃ بالیمین،رقم:660،صحیح مسلم،کتاب الزکوۃ،باب فضل اخفاء الصدقۃ،رقم:2427

[2]الکھف18:28

[3]النساء4:135

کے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنتمحمد[1]نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد)صلی اللہ علیہ وسلم (اس کا ہاتھ ضرور کاٹ ڈالتے"[2]

سنت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں فقراء ومساکین کی مادی ضروریات پوری کرنے کے احکامات:

ضروریات پوری کرنے کے احکامات: قُرآن مقدس اور احادیثِ مبارکہ میں اس حوالے سے انتہائی تاکید کے ساتھ احکامات آئے ہیں۔کہ فقراء ومساکین کے ساتھ تعاون کرنا لازمی اور باعث ثواب بیان کیا گیا ہے۔چاہے کوئی اپنے ذاتی مال سے کچھ دے یا سرکاری خزانے سے۔لیکن اس بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ متعلقہ شخص واقعۃً مستحق ہو۔مسلمانوں کو اپنی زکوۃ اسی وجہ سے فقراء ومساکین کو دینے کا حکم دیا گیا ہے۔اور اس میں کوتاہی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

> "ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سےاس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کا اقرار نہ کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ نبی علیہ السلام کے سچے رسول ہیں اور نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دیں، جس وقت وہ یہ کرنے لگیں گے تو مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیں گے، سوائے اسلام کے حق کے۔(رہا ان کے دل کا حال تو)ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے"[3]

اس حدیث سے زکوۃ کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ارکان اسلام میں سے ایک رکن "زکوۃ" بھی ہے۔ایک مسلمان معاشرے کو مضبوط بنیادوں پرقائم کرنے میں زکوۃ کا بڑااہم کردار ہے۔اس وجہ سے جو کوئی زکوۃ نہیں دیتا وہ اسلامی معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کررہا ہوتا ہے۔تب ہی تو نبی علیہ السلام کواس کےادا نہ کرنے والوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔خلیفہ اول سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن لوگوں سے جہاد فرمایا تھا جنہوں نے زکوۃ دینے سے انکار کیا تھا۔اور اسلام کی تاریخ میں زکوٰۃ پہلا رکن ہے جس سے نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے ادا کرنے سے انکار کیا تھا۔جیسا کہ صحیحین کی روایت ہے:

> "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب نبی علیہ السلامکی وفات ہوئی اور آپ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا اور عرب کے کئی قبائل پھر گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے لڑنا چاہا تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ لوگوں سے کس بنیاد پر جنگ کریں گے جب کہ نبی علیہ السلامنے یہ فرمایا تھا کہ مجھے

---

[1] فاطمہ بنت محمد ﷺ ہیں۔نبی ﷺکے چھوٹی صاحبزادی سیدہ خدیجہ بنت خویلدؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔سیدنا علیؓ کی بیوی اورسیدنا حسن و سیدناحسینؓ کی ماں ہے۔ اسلام میں سیدۃ النساء العالمین کے نام سے مشہور ہیں۔لقب زہراء ہے۔نہایت قابل، لائق اور فصیح و بلیغ تھی۔ نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد 6 ماہ تک زندہ رہیں۔ 3رمضان 11ھ/632ء کو وفات پائی۔(ابن الاثیر، اسد الغابہ، ج5،ص517۔ ابن عبدالبر،الاستیعاب،ج2،ص112۔الاعلام،ج5،ص132)

[2]بخاری،کتاب الحدود،باب کراھیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان،رقم:6788،مسلم،کتاب الحدود،باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنھی عن الشفاعۃ،رقم:4506

[3]۔بخاری،کتاب الایمان، باب فان تابوا واقاموا‌الصلوۃ وآتوالزکوۃ فخلواسبیلھم ،رقم:25،مسلم،کتاب الایمان،باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لاالہ الا اللہ،رقم:138

حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ کلمہ لا الہٰ الا اللہ کا اقرار نہ کر لیں پس جو شخص اقرار کر لے کہ لا الہٰ الا اللہ تو میری طرف سے اس کا مال اور اس کی جان محفوظ ہے۔ البتہ کسی حق کے بدل ہو تو وہ اور بات ہے)مثلاً کسی کا مال مار لے یا کسی کا خون کرے(اب اس کے باقی اعمال کا حساب اللہ کے حوالے ہے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ واللہ !میں تو اس شخص سے جنگ کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا ہے کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، واللہ! اگر وہ مجھے ایک رسی بھی دینے سے رکیں گے جو وہ نبی علیہ السلامکو دیتے تھے تو میں ان سے ان کے انکار پر بھی جنگ کروں گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا پھر جو میں نے غور کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں لڑائی کی تجویز ڈالی ہے تو میں نے جان لیا کہ وہ حق پر ہیں"[1]

احادیث میں منکر زکوٰۃاور بخل کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کے ا حکام میں بھی فرق کیا گیاہے چنانچہ منکرین زکوٰۃ کے بارے میں تو قتال کا حکم ہے کیونکہ وہ کفر کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔اور دین سے خارج ہو کر مرتد ہو جاتا ہے۔اور دوسری قسم کے لوگوں کو مجبور کرکے بزور قوت زکوۃ لی جائے گی۔
اور ابو داؤد کی روایت ہے کہ:
"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :چرنے والے اونٹوں میں چالیس)۴۰(میں ایک)۱(بنت لبون ہے،)زکاۃ بچانے کے خیال سے(اونٹ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہ کئے جائیں، جو شخص ثواب کی نیت سے زکاۃ دے گا اسے اس کا اجر ملے گا، اور جو اسے روکے گا ہم اس سے اسے وصول کر لیں گے، اور)زکاۃ روکنے کی سزا میں(اس کا آدھا مال لے لیں گے، یہ ہمارے رب عزوجل کے تاکیدی حکموں میں سے ایک تاکیدی حکم ہے، آل محمد کا اس میں کوئی حصہ نہیں"[2]،[3]

یہ تو اُن کے ساتھ دنیا میں قتال کاحکم ہے اورآخرت کا عذاب تو اس سے الگ ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ' آپ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اونٹ اپنے مالکوں کے پاس جنہوں نے ان کا حقادا نہیں کیا کہ اس سے زیادہ موٹے تازے ہو کر آئیں گے اور انہیں اپنے کھروں سے روندیں گے۔ بکریاں بھی اپنے ان مالکوں کے پاس جنہوں نے ان کے حق نہیں دئیے تھے پہلے سے زیادہ موٹی تازی ہو کر آئیں گی اور انہیں اپنے کھروں سے روندیں گی اور اپنے سینگوں سے ماریں گی۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اس کا حق یہ بھی ہے کہ اسے پانی ہی پردوہا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ کوئی شخص

---

[1]بخاری ،کتاب الاعتصام ،باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ،رقم:1399،مسلم،کتاب،باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لاالہ الا اللہ ،رقم:133
[2]سنن ابو داؤد،کتاب الزکوٰۃ،باب فی زکوٰۃ السائمۃ،رقم:1577
[3]قال الالبانی:حسن،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج4،ص75

قیامت کے دن اس طرح نہ آئے کہ وہ اپنی گردن پر ایک ایسی
بکری اٹھائے ہوئے ہو جو چلا رہی ہو اور وہ مجھ سے کہے
کہ اے محمد!مجھے عذاب سے بچائیے میں اسے یہ جواب دوں
گا کہ تیرے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا سو میں نے پہنچا دیا۔
اسی طرح کوئی شخص اپنی گردن پر اونٹ لیے ہوئے قیامت
کے دن نہ آئے کہ اونٹ چلا رہا ہو اور وہ خود مجھ سے فریاد
کرے ' اے محمد)صلی اللہ علیہ وسلم !(مجھے بچائیے اور میں
یہ جواب دے دوں کہ تیرے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں
نے تجھ کو)اللہ کا حکم زکوٰۃ(پہنچا دیا تھا"[1]

اسی بخاری کی دوسری روایت ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور پھر اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں ادا کی تو)آخرت میں(اس کا مال نہایت زہریلے سانپ بن کر جس کی آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں گے۔ اس کی گردن میں طوق کی طرح پہنا دیا جائے گا۔ پھر وہ سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا کہ میں ہی تیرا مال ہوں، میں ہی تیرا خزانہ ہوں، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت" لاَ يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ "کی ''اور جو لوگ کہ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مال ان کے حق میں بہتر ہے۔''آخر تک"[2]

مال کے حوالے سے اُن کے لیےاسلام صرف زکوٰۃ دینے کا حکم ارشاد نہیں فرماتا بلکہ دیگر صدقات میں بھی اُن کا حصہ مقرر کیا گیا ہے جیسے صدقۃ الفطر۔عید کی خوشیوں میں فقراء ومساکین کا حصہ کرنا ایک طرف اُن کو عید کی خوشیوں میں شریک کرنا ہے اور دوسری طرف اُن سے احساس تنہائی کو دور کرنا ہوتا ہے۔جس سے معاشرے میں ترقی اور امن آتا ہے ۔چوری اور تخریبی ذہن سازی جیسے جرائم کی سدباب کیا جاتا ہےفطرانے کی خصوصیات میں سے چند یہ بھی ہیں۔

*:عید کے موقع پر فقراء ومساکین کی مہمان نوازی کے لیے دیا جانے والا مال باعث اجر وثواب ہے۔

*:فطرانہ عموما علاقے میں غالب الاستعمال غذا میں سے دیا جاتا ہے۔جس سے غرض عید کے دن بھوکے انسانوں کو کھلانا ہے۔

حدیث پاک میں اس طرف کچھ یوں اشارہ کیا گیا ہے:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی علیہ
السلامنے فطر کی زکوٰۃایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو
فرض قرار دی تھی۔ غلام ' آزاد ' مرد ' عورت ' چھوٹے اور
بڑے تمام مسلمانوں پر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا
کہ نمازکے لیے جانے سے پہلے یہ صدقہ ادا کر دیا جائے"[3]

اور امام ابوداؤدرحمہ اللہ کی رویت میں ہے کہ:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلامنے صدقہ فطر صائم کو لغو اور بیہودہ باتوں سے پاک کرنے کے لیے اور مسکینوں کے کھانے کے لیے فرض کیا ہے، لہٰذا جو

---

[1]بخاری،کتاب الزکوۃ،باب اثم مانع الزکوٰۃ،رقم:1402

[2]بخاری،کتاب الزکوٰۃ،باب مانع الزکوٰۃ،رقم:1403

[3]بخاری،کتاب ا لزکوٰۃ،باب فرض صدقۃ الفطر،رقم:1503

اسے)عید کی(نماز سے پہلے ادا کرے گا تو یہ مقبول صدقہ ہو گا اور جو اسے نماز کے بعد ادا کرے گا تو وہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہو گا"[1]،[2]

زکوٰۃ،فطرانے اور دیگر کفارات سے حاصل شدہ مال کی حصولی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے جن کے مصارف میں فقراء ومساکین بھی آتے ہیں۔اس سے اسلام نےاِن لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے کا ایک وسیع میدان فراہم کیا ہے۔جس میں بعض ایسی صورتیں ہیں جس میں مال دینے کی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ ہر انسان اپنی استعداد اور اخروی اجر کی امید اور یقین کے مطابق اُن کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔اسی اہمیت کی وجہ سے احادیث نبویہ میں مسلمانوں کو فقراء ومساکین کی ان مادی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے باربار احکامات آتے ہیں۔ارشاد نبوی ہے:

"نبی علیہ السلامکونے فرمایا کہ جہنم سے بچو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی سہی)مگر ضرور صدقہ کر کے دوزخ کی آگ سے بچنے کی کوشش کرو"[3]

نبی علیہ السلام اس بارے میں عملی طور پر بہت عمدہ طریقے سے وضاحت فرماتے تھے۔جیسا کہ روایت میں ایک صحابی سے منقول ہے:

"نبی علیہ السلامنے عصر کی نماز ادا کی پھر جلدی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لے آئے۔ اس پر میں نے پوچھا یا کسی اور نے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں گھر کے اندر صدقہ کے سونے کا ایک ٹکڑا چھوڑ آیا تھا مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ اسے تقسیم کئے بغیر رات گزاروں پس میں نے اس کو بانٹ دیا"[4]

اور ایک روایت میں مال جمع کرکے رکھنے اور بار بار گننے کی ممانعت آئی ہے کہ:

"اسماء رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ مجھ سے نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ خیرات کو مت روک ورنہ تیرا رزق بھی روک دیا جائے گا۔اور عبدۃ کی روایت میں ہے کہ:آپ نےفرمایا کہ شمار کرکے نہ رکھ دو ورنہ اللہ تعالی بھی تمہیں حساب(محدود) دے گا"[5]

اورصحیحین کی روایت میں ہے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

"جو اللہ کے راستے میں دو چیزیں خرچ کرے گا اسے فرشتے جنت کے دروازوں سے بلائیں گے کہ اے اللہ کے بندے! یہ دروازہ اچھا ہے پھر جو شخص نمازی ہو گا اسے نماز کے دروازہ سے بلایا جائے گا جو مجاہد ہو گا اسے جہاد کے دروازے سے بلایا جائے جو روزہ دار ہو گا اسے »باب الریان«سے بلایا جائے گا اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والا ہو گا

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب الزکوٰۃ،باب زکوٰۃ الفطر،رقم:1611
[2]قال الالبانی:حسن،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج4،ص109
[3]بخاری،کتاب الزکوٰۃ،باب اتقواالنار ولو بشق تمرۃ، رقم:6540
[4]بخاری،کتاب الزکوٰۃ،باب من احب تعجیل الصدقۃ من یومہا،رقم:1430
[5]بخاری ،کتاب الزکوٰۃ،باب التحریض علی الصدقۃ والشفاعۃ فیھا،رقم:1433

اسے زکوۃ کے دروازہ سے بلایا جائے گا۔ اس پر ابوبکر رضی الله عنہ نے پوچھا میرے ماں باپ آپ صلی الله علیہ وسلم پر فدا ہوں یا نبی علیہ السلام !جو لوگ ان دروازوں)میں سے کسی ایک دروازہ(سے بلائے جائیں گے مجھے ان سے بحث نہیں، آپ یہ فرمائیں کہ کیا کوئی ایسا بھی ہو گا جسے ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا؟ آپ صلی الله علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی انہیں میں سے ہوں گے"[1]

اور امام مسلم رحمہ الله نے اپنی صحیح مسلم میں ایک روایت نقل کی ہے کہ:

اور ایک روایت میں آتا ہے کہ:

"سیدنا ابو ہریرہرضی الله عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ بیواؤں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والا الله کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا اس شخص کی طرح ہے جو دن میں روزے رکھتا ہے اور رات کو عبادت کرتا ہے"[2]

مادی ضروریات کے علاوہ فقراء ومساکین کی دیگر ضروریات پوری کرنا

اسلام فقراء ومساکین کی صرف مادی مدد کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کے علاوہ بھی اُن کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیتا ہے ۔معاشرتی حقوق میں بھی اُن کو برابر کی حیثیت دیتا ہے۔تا کہ معاشرے میں اُن کو ایک باوقار مقام مل جائے۔ایک کامیاب اور ترقی یافتہ معاشرہ تب وجود میں آسکتا ہے جب اُس میں غریب ومال دار برابر ہو،چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے کے لیے ایک جیسا قانون ہو۔اِن لوگوں کے متعلق سنت نبویہ کی خصوصیات میں سے چند یہ ہیں۔

1۔فقراء ومساکین کی اخروی حیثیت:انسان پر فقرکا آناایک کڑا امتحان ہوتا ہے۔بلکہ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے جس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے،کیونکہ اگر ایسے لوگوں کی بروقت اور مناسب مدد نہ کی گئی تو پھر یہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جرائم کے مرتکب ہوں گے جس سے ماحول میں انتشار اور بد امنی پھیلنے کا قوی خطرہ ہے۔قوموں کے عروج وزوال پر ایسے لوگوں کا کردار انتہائی اثرانداز ہوتا ہے۔ لیکن ایک اسلامی معاشرے میں اس جیسے خطرات نہیں ہوتے کیونکہ اسلام ایسے فقراء ومساکین کے لیے جو اپنے فقر پر صبر کرنے والے ہوتے ہیں،آخرت میں بہترین بدل اورانعامات کی یقین دہانی کرتا ہے۔دنیا کی زندگی جیسی تیسی گزر جائے گی لیکن آخرت کی زندگی نہ ختم ہونی والی زندگی ہے اوروہاں ایسے لوگ مزوں اور عیش وعشرت میں ہوں گے جو اپنی اس فانی زندگی میں فقروفاقے جیسے امتحان کو الله تعالی کی طرف سے آزمائش سمجھ کر اس پر صبر کرنے والے ہوں۔اور اپنی حالت پر واویلا نہ کرنے والے ہوں آخرت میں اعلی درجات کے مستحق ہوں گے۔نبی علیہ السلام نے ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا:

"نبی علیہ السلامنے بیان کیا کہ میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو وہاں رہنے والے اکثر غریب لوگ تھے اور میں نے جہنم میں جھانک کر دیکھا)شب معراج میں(تو وہاں عورتیں تھیں"[3]

اسی طرح عبدالله بن عمرو بن العاص رضی الله عنہ سے روایت ہے کہ:

---

[1]بخاری،کتاب الصوم،باب الریان للصائمین،رقم:1897،مسلم،کتاب الزکوٰۃ،باب من جمع الصدقۃ واعمال البر،رقم:2418

[2]بخاری،کتاب الادب،باب الساعی علی الارملۃ،رقم:5353،مسلم،کتاب الزھد والرقاق،باب الاحسان الی الارملۃ والمسکین والیتیم،رقم:7659

[3]بخاری،کتاب الرقاق،باب صفۃ الجنۃ والنار،رقم:3241

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا "فقراء و محتاج مہاجرین جنت میں مالداروں سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے"[1]

2.غریب ومال دار کے درمیان مساوات: اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سب انسان برابر ہے کسی کو کسی پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔کوئی مال دار ہو تو اُسے خصوصی اہمیت دی جائے اور کوئی غریب ہو تو وہ کسی بھی حق کا مستحق نہ ہو اسلام میں ایسا تصور موجود ہی نہیں بلکہ ایسا خیال رکھنے والوں کی مذمت کرتا ہے ۔بحیثیت انسان سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

فضیلت کا معیار اگر کچھ ہے تو وہ صرف اللہ تعالی سے ڈرنے پر ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" نَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "[2] بے شک تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ متقی ہو"جو شخص جتنا زیادہ تقوی اختیا کرے گا اُتنا ہی وہ اللہ کے دربار میں انعام کا مستحق ہوگاپس معاشرے میں بھی فضیلت کا معیار تقوٰی ہی ہو گی۔اگر ہم نبی علیہ السلام کی مجلس کے ارکان پر نظر دوڑائیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ "مجلس نبوی"میں فقراء کی ایک خاص حیثیت ہوتی تھی۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔اہل صفہ میں یہ وہی صحابی ہے جس کو زیادہ احادیث حفظ ہونے کا اعزازحاصل ہے۔ اور یہ فقراء مہاجرین میں سے تھے۔فقیہ صحابی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فقر نے اُنہیں جماعتِ صحابہ کے کبار علماء میں سے بننے سے رکاوٹ نہیں بنی۔نبی علیہ السلام کی خاص شفقت اور مصاحبت ہی تو تھی جس کے بدولت اہلِ حبش سے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ مؤذن رسول بنے۔سیدنا خباب رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں کہ "مجلسِ رسول"میں اُن کا کتنا اہم مقام تھا جن کے بارے خود اللہ تعالی فرماتا ہے:

> "جو لوگ اپنی رب سے صبح وشام دعا کرتے ہیں اس کی ذات کے طلبگار ہیں ان کو مت نکالو۔ ان کے حساب کی جوابدہی تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی ان پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا) اگر ان کو نکالوگے تو ظالموں میں ہوجاؤ گے"[3]

نبی علیہ السلام کے اور ارشادات کے بدولت مسلمان فقراء کو قدراور عزت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آرہے ہیں ۔نبی علیہ السلام کی احادیث میں اسی بات کی ترغیب دی جاتی تھی جیسا کہ ارشاد ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ولیمہ کا وہ کھانا بدترین کھانا ہے جس میں صرف مالداروں کو اس کی طرف دعوت دی جائے اور محتاجوں کو نہ کھلایا جائے اور جس نے ولیمہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی"[4]

ایسے طعام کو" شَرُّ الطَّعَامِ "اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس طعام کو مذموم مقصد کے خاطر اغنیاء تک مخصوص کردیا جا تا ہے۔مال داروں کے لیے یہ طعام تیا ر کیا جاتا ہے اور

---

[1]مسلم،کتاب الزہد والرقاق،باب حدثنا قتیبۃ بن سعید۔رقم:7654

[2]الحجرات13:49

[3]الانعام52:6

[4]بخاری،کتاب النکاح،باب من ترک الدعوۃ فقدعصی اللہ ورسولہ،رقم:5177

فقراء کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔کیونکہ بہترین اور زیادہ اجر والا طعام وہ ہوتا ہے جس میں فقراء ومساکین کومدعو کیا جائے کیونکہ وہی ہی اس کے محتاج ہوتے ہیں [1]۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ:

" ایک صاحب(جو مالدار تھے)نبی علیہ السلامکے سامنے سے گزرے۔ نبی علیہ السلامنے اپنے پاس موجود صحابہ سے پوچھا کہ یہ کیسا شخص ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ اس لائق ہے کہ اگر یہ نکاح کا پیغام بھیجے تو اس سے نکاح کیا جائے، اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے، اگر کوئی بات کہے تو غور سے سنی جائے۔ سہل نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلاماس پر چپ ہو رہے۔ پھر ایک دوسرے صاحب گزرے، جو مسلمانوں کے غریب اور محتاج لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ نبی علیہ السلامنے دریافت فرمایا کہ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی کے یہاں نکاح کا پیغام بھیجے تو اس سے نکاح نہ کیا جائے اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے، اگر کوئی بات کہے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ یہ شخص اکیلا پہلے شخص کی طرح دنیا بھر سے بہتر ہے"[2]

حدیث کےیہ معنی نہیں ہیں کہ ہر فقیر ہر مال دار سے افضل ہوتاہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں فضیلت کا معیا ر"مال" نہیں ہے۔بلکہ تقوی اور پر ہیزگاری ہے۔

<u>3۔فقراء کو صبر کی تلقین اور کسی سے مانگنے سے اپنے آپ کو بچا کے رکھنے کی تلقین:</u>اسلام معاشرے میں امن واستحکام چاہتا ہے کوئی بھی ایسی حرکت جس سے معاشرے میں انتشار اوربے چینی پھیلے،اسلام قطعا اس کی اجازت نہیں دیتا۔اسلام یہ نہیں چاہتا کہ کوئی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاکر اپنے آپ کو ذلیل کرے جس کے بعد دوسرے لوگ اُسے حقارت کی نظرسے دیکھیں گے ،پھر وہ ہمیشہ کے لیے احساس کمتری کاشکار ہوکر آخر کار بے راہ روی کا شکار ہوجائے گا جو معاشرے کے لیے ایک ناسور کی صورت میں ابھرے گا۔اس وجہ سے اسلام نے اس اہم پہلو کی طرف خود فقراء ومساکین کی توجہ دلائی ہے ۔دینی طورپر بھی یہ فعل ،فعلِ شنیع ہے۔بلکہ دین تو یہ سکھاتا ہے کہ فقراء کواپنی حالت پرصبر کرنا چاہئیے اور یہ ایمان رکھنا چاہئیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔کیونکہ رزق تو اللہ تعالی کے قبضہ قدرت میں ہے جسے چاہے بہت کچھ دے اور جسے چاہے کچھ بھی نہ دے۔اسی یہ بھی یقین رکھنا چاہئیے کہ رزق کے باب میں مخلوق میں جو کمی بیشی کا تفاوت پایا جاتا ہے یہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کے تحت ہے۔جیسا کہ خود اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

> "کیا یہ لوگ تمہارے رب کی رحمت کوتقسیم کرتے ہیں ؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے رب کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے"[3]

---

[1]سلیمان بن خلف،الباجی،المنتقی شرح موطا مالک،ج3،ص231،س م نامعلوم
[2]بخاری،کتاب النکاح،باب الاکفاء فی الدین،رقم:5091
[3]الزخرف32:43

اسی وجہ سے فقراء کو اُن کے فقر پر صبر کرنے اور کسی سے سوال کرنے سے اپنے آپ کو بچانے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ اس کے بدلےمیں اُن کے لیے آخرت میں بہترین اجرو ثواب ہے۔

اسی سلسلے میں بخاری کی روایت ہے جو کہ پہلے بھی گزر چکی ہے کہ:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور پہلے انہیں دو جو تمہارے بال بچے اور عزیز ہیں اور بہترین صدقہ وہ ہے جسے دے کر آدمی مالدار رہے اور جو کوئی سوال سے بچنا چاہے گا اسے اللہ تعالیٰ بھی محفوظ رکھتا ہے اور جو دوسروں)کے مال(سے بےنیاز رہتا ہے ' اسے اللہ تعالیٰ بےنیاز ہی بنا دیتا ہے"[1]

اور خود نبی علیہ السلام تو ایسے حالات میں صبر کے پہاڑ ہوا کرتے تھے،آپ تو امت کےلیے بہترین نمونہ ہے،اسی وجہ سے ایک فقیر کے لیے یہ کیا کم ہے کہ نبی علیہ السلام اور اُس کے درمیان یہ" خیر" مشترک ہےپس اُسے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئیے۔ نبی علیہ السلام کی فقر وفاقہ کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ کیا نبی علیہ السلامنے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامنے ایسا کبھی نہیں کیا۔ صرف ایک سال اس کا حکم دیا تھا جس سال قحط پڑا تھا۔ نبی علیہ السلامنے چاہا تھا)اس حکم کے ذریعہ(کہ جو مال والے ہیں وہ)گوشت محفوظ کرنے کے بجائے(محتاجوں کو کھلا دیں اور ہم بکری کے پائے محفوظ رکھ لیتے تھے اور اسے پندرہ پندرہ دن بعد کھاتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایسا کرنے کے لیے کیا مجبوری تھی؟ اس پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور فرمایا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سالن کے ساتھ گیہوں کی روٹی تین دن تک برابر کبھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ اللہ سے جا ملے"[2]

اور مسلم کی روایت میں ہے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے نبی علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ ایک دن ردی کھجور پیٹ بھرنے کے خاطر تناول فرمارہے تھے"[3]

اس حدیث میں آپ کے سادہ خوراک استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ فقیروں سے اظہار یکجہتی بھی واضح ہوتی ہے "[4]

الغرض آج دنیا اقتصادی مسائل سے نکلنے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کررہی ہے ، پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔کیونکہ کبھی ایک بات کو اور کبھی دوسری بات کو بنیاد بناکر دنیا انسانی افکار کی روشنی میں اس مسئلے کے حل کے لیے قوانین بنا رہی ہے جو کہ ظاہر ہے کہ پائیدار اور مستقل نہیں ہو سکتیں،اس وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے وہ نظام چل جاتا ہے

---

[1]بخاری،کتاب الزکوٰۃ،لاصدقۃ ال عن ظھر غنی،رقم:1427

[2]بخاری،کتاب الاطعمۃ،باب ماکان السلف یدخرون فی بیوتھم واسفارھم من الطعام واللحم وغیرہ،رقم:5423

[3]صحیح مسلم،کتاب،باب،رقم:7652

[4]عبدالرحمان،ابن الجوزی،کشف المشکل من حدیث الصحیحین،ج1،ص104،دار النشر/دار الوطن،الریاض،1418ھ

لیکن پھر اس کی خامیاں اتنی زیادہ سامنے آئی ہیں کہ اسے چھوڑے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا۔سوشلزم اور کمیونزم کی مثالیں آج بھی ہمارے سامنے ہیں دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا یہ نظام آج پوری دنیا رد کر چکی ہے۔اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام آیا۔جس کودنیا نے خوش آمدید کہا لیکن اس نظام میں دولت چند مخصوص ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی اسی وجہ سے آج پوری دنیا کا امن وامان تباہ ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام کانظام جو آج پندرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی پرانا نہیں ہوا بلکہ اب بھی وہ دنیا کو اس جھنجھال سے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ صحیح اسلامی ا صولوں کو بروئے کا لایا جائے۔آج دنیائے مغرب کے ماہرینِ اقتصادیات بھی اس اٹل حقیقت کااعتراف کرکے تسلیم کرچکے ہیں ،کہ ہمارے موجودہ معاشی بگاڑ کاحل صرف اسلامی نظامِ معیشت میں موجود ہے ابھی چند برس پہلے کے بات ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں پوری دنیا جس بحران کی شکار ہوئی تھی اس سے صرف وہ ادارے محفوظ رہ سکے تھےجو کسی نہ کسی شکل میں اسلامی اصولوں پر کاربند تھے۔

اسلامی نظامِ معشیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا سے "فقر"ختم کرنے کا علاج بھی خود تجویز کرتا ہےجو زکوٰۃ،صدقات اور کفارات وغیر ہ کی صورتوں میں موجود ہیں۔اس سلسلے میں اسلام صرف فرد کے لیے نہیں بلکہ پورے معاشرے کے لیے کچھ قوانین مقررکرتا ہے ۔ہر شخص کی مسؤلیت قائم کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے:" كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ[1]

" تم میں سے ہر فرد ایک طرح کا حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا"

اس وجہ سے اسلامی معاشرے میں مال داروں کی مسؤلیت یہ ہے کہ اُن کے مال میں غریبوں کاحق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں:

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا تھا"[2]

اور ارشاد ہے:" اور وہ لوگ جن کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے(دونوں کا) ایک مقررحصہ ہے"[3]

اور یہی اسلامی اصولِ اقتصادیات ہی دنیا کے تمام معاشروں سے"فقر" جیسے اہم مسئلے کاخاتمہ کر سکتے ہیں ۔آج دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی وجہ سے دولت چونکہ چند مخصوص ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ یہ نظام جلد یا بدیر معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کرکے ختم ہو جائے گا ۔

سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں مریضوں کے سماجی حقوق:

"مرض" اصل میں نقصان کو کہا جاتاہے۔کیونکہ اس کی وجہ سےبدنی قوت میں نقصان آتا ہے۔اور اس وجہ سےدینی افعال میں بھی "نقصان یعنی کمی "آتی ہے[4]۔ مریض کی جمع "مرضٰی"آتی ہے[1]۔

---

[1]صحیح بخاری،کتاب ،باب العبد راع فی مال سیدہ ولایعل الا باذنہ،رقم2409،صحیح مسلم،کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علیہ،رقم4828

[2]الذاریات19:51

[3]المعارج70 :25،24

[4]تہذیب اللغۃ،ج12،ص26

امام جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:مرض وہ کیفیت ہے جس کے آنے کی وجہ سے بدن اپنے خاص اعتدال سے نکل جاتا ہے[2]۔ اور مناوی لکھتے ہیں کہ:مرض اُس کمزوری کانام ہے جو قوٰی میں آکر افعال میں خلل ڈالتا ہے[3]۔

پس مرض اُس کیفیت کانام ہےکہ جب یہ انسانی جسم کو پیش آتی ہے تو اُس کو اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری سے کمزور کر دیتی ہے۔اور یہ کیفیت ہر انسان کو پیش آسکتی ہے کیونکہ انسان زندگی کے مختلف مراحل میں کسی نہ کسی صورت میں امراض کا نشانہ بن سکتا ہے۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ بڑھاپے میں عمر کے گزرنے کے سبب امراض کی کثرت ہوتی ہیں۔

مریض چونکہ وقتی طور پر متاثر ہو تا ہےیا ہمیشہ کے لیے معذور ہوکر اپنی حاجاتِ اصلیہ کی ادائیگی سے عاجز رہتا ہے کیونکہ وہ نے چارہ بیماری سے متاثر ہو کر دوسروں کا محتاج بن چکا ہوتا ہے ۔

طاقت نہ رکھنے کے سبب اسلام نےبھی بہت سارے اعمال میں اُنہیں چھوٹ دی ہوتی ہے۔جس میں عبادات وغیرہ بھی شامل ہیں۔شریعت انسان کی حالت اور طاقت کو دیکھ کر احکامات لاگو کردیتی ہے ۔شریعت کا ایک حکم بھی ایسا نہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ جیسا کہ خود اللہ تعالی فرماتےہے:"اللہ تعالی کسی(بھی) شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا "[4]

اورسیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

> "نبی علیہ السلامنے فرمایا بیشک دین آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آ جائے گا(اور اس کی سختی نہ چل سکے گی(پس)اس لیے)اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو۔ اور جہاں تک ممکن ہو میانہ روی برتو اور خوش ہو جاؤ (کہ اس طرز عمل سے تم کو دارین کے فوائد حاصل ہوں گے،عبادت سےنماز پنج وقتہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ پابندی سے ادا کرو"[5]

"دین میں چونکہ آسانی" ہے اس لیے مریض کی مخصوص حالت کی وجہ سے اُسے بعض مشقت والے احکام(جس میں قوت زیادہ استعمال ہوتی ہے) سے مستثنٰی قراردیا ہے جیسا کہ جہاد وغیرہ۔ شریعت نے اُسے عذر کا نام دے کر اُنہیں معاف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> " نہ تو اندھے پر گناہ ہے (کہ سفر جنگ سے پیچھے رہ جائے) اور نہ لنگڑے پر گناہ ہے اور نہ بیمار پر گناہ ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کے فرمان پر چلے گا اللہ اس کو بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اور جو روگردانی کرے گا اسے برے دکھ کی سزا دے گا"[6]

اسی طرح روزے میں بھی کافی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔جس کی ادائیگی مریض کے لیے مشکل ہوتی ہے لیکن بیماروں کی حیثیت مختلف ہوتی ہے بعض بیماری توعارضی ہوتی

---

[1]مقاییس اللغۃ،ج5،ص311

[2]التعریفات للجرجانی،ج1،ص268

[3] التعریفات للمناوی،ص649

[4]البقرۃ286:2

[5]بخاری،کتاب الایمان،باب الدین یسر،رقم:39

[6]الفتح17:48

ہے اور کچھ بیماری دائمی ہوتی ہے لہذا جو مریض عارضی طور پر بیمار ہوتے ہیں وہ جب صحت یاب ہوجائیں تو بعدمیں اُن کو روزوں کی قضاء کرنے کا حکم دیا جائے گااور اگر مرض دائمی ہو تو پھر روزوں کی قضاء کرنے کے بجائے فدیہ کاحکم ہے۔سورۃ البقرۃ میں اس طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

" گنتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کرلے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔ اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے"[1]

نماز کے معاملے میں وضوء کی اہمیت مسلّم ہے لیکن دین کی بنیاد چونکہ آسانی پر ہے،اس لیے بیمار کے لیے وضوء کرنے کے بجائے تیمم کا حکم ہے ۔قرآن میں ارشاد ہے:

"اے مومنو ! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک جو منہ سے کہو سمجھنے لگو نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی جب تک کہ غسل کرلو ہاں اگر بحالت سفر رستے چلے جارہے ہو اور پانی نہ ملنے کے سبب غسل نہ کرسکو تو تیمم کرکے نماز پڑھ لو) اور اگر تم بیمار ہو سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں پر مسح کرلو بےشک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"[2]

اسی طرح نماز کی ادائیگی میں "قیام"بھی ایک اہم رکن ہے۔جس کے بارے میں مریضوں کے لیے آسانی کا حکم ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مریض کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھ سکتا تو اُسے بیٹھ کر،لیٹ کر یا اشارے سے ادا کرنے کی اجازت ہے۔
سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں مریضوں کے ساتھ خصوصی رعایت کاحکم ہے ۔ذیل میں اُن کے بارے میں تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

<u>(الف)مریضوں(بیماروں) کی بدنی خبر گیری:</u>بیماری کی حالت میں انسان کمزوری کا شکاررہتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی طرح امور زندگی کی انجام دہی کی طاقت نہیں رکھتابلکہ وہ تواپنے آپ کو موت کے قریب دیکھتا ہےاس وجہ سے اُس پر نفسیاتی اثر ہوتا ہےجو بعض اوقات اُس کی بیماری میں شدت کا باعث بنتا ہے۔اس وجہ سے سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں اُن کے ساتھ ایسے رویے کا حکم ہے جو اُسے نفسیاتی طور پر قابو میں رکھے۔لہذا اُن کے ساتھ درجہ ذیل طریقوں سے تعاون کیا جا سکتا ہے۔

<u>(1)اخروی اجر وثواب کی تلقین کے ذریعے اُس کی ایمانی طاقت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرنا:</u>جب کسی مریض کے پاس بیٹھے لوگ اُسے اُس کی بیماری کےبدلے میں آخرت کے اجر وثواب کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے بیمار کی حوصلہ افزائی ہوجاتی ہے اور وہ جزع فزع کے بجائے صبر سے کام لیتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ ہر بیماری پر اجروثواب ملتا ہے:

---

[1] البقرۃ2:184
[2] النساء4:43

ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے
فرمایا کہ مسلمان جب بھی کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال،
تکلیف اور غم میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی
کانٹا بھی چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ
بنا دیتا ہے"[1]

اسی طرح صحیحین کی روایت میں ہے کہ:

"نبی علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے
خبر دی کہ آپ نے نبی علیہ السلامسے طاعون کے متعلق
پوچھا۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ یہ ایک عذاب تھا اللہ تعالیٰ
جس پر چاہتا اس پر اس کو بھیجتا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے
مومنین)امت محمدیہ کے لیے(رحمت بنا دیا اب کوئی بھی اللہ
کا بندہ اگر صبر کے ساتھ اس شہر میں ٹھہرا رہے جہاں
طاعون پھوٹ پڑا ہو اور یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ
نے اس کے لیے لکھ دیا ہے اس کے سوا اس کو اور کوئی
نقصان نہیں پہنچ سکتا اور پھر طاعون میں اس کا انتقال ہو
جائے تو اسے شہید جیسا ثواب ملے گا"[2]

ایک حدیث میں ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا، میں نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بخار آیا ہوا تھا میں نے اپنے ہاتھ سے نبی علیہ السلامکا جسم چھوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ ہاں مجھے تم میں کے دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا ہے۔ میں نے عرض کیا یہ اس لیے ہو گا کہ آپ کو دگنا اجر ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اس کے بعد نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ کسی بھی مسلمان کو مرض کی تکلیف یا کوئی اور کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو اس طرح گراتا ہے جیسے درخت اپنے پتوں کو گرا دیتا ہے"[3]

اس حدیث میں بہت سے ایسے فوائد کا تذکرہ ہے جو بیماروں کی جسمانی حالت کاخیال رکھنے سے متعلق ہےجس پر عمل کرنے کی صورت میں مریضوں کے لیےبہت ساری سہولتیں ملتی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے:" بَابُ أَشَدُّ النَّاسِ بَلاَءً الأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الأَوَّلُ فَالأَوَّلُ "اسی ترجمۃ الباب میں اگر غور کیا جائے تو مریض کواپنی بیماری پر صبر کرنے کی دعوت ملتی ہے۔ کیونکہ جب مریض کی بیماری میں شدت آتی ہے تو وہ ثواب کے اعتبار سے اپنے آپ کو انبیاءکے قریب سمجھتا ہے اور وہ اس بیماری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر اس پر صبر کرتا ہے ۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسرا باب باندھا ہے کہ:" باب وضع اليد على المريض "(یعنی مریض کے سر وغیرہ پر ہاتھ رکھنا)جو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اِن الفاظ سے معلوم ہوتا ہے" فَمَسِسْتُهُ بِيَدِي " اور سنت نبویہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کرنا مریض کی عیادت کرنے کے آداب میں سے ہے۔

---

[1] بخاری،کتاب المرضی،باب ماجآء فی کفارۃ المرض،رقم:5642، 5641

[2] بخاری،کتاب احادیث الانبیاء،باب نمبر53،رقم:3474

[3] بخاری،کتاب المرضیٰ،باب وضع الید علی المریض،رقم:5660

بیماری کے باعث اجر وثواب ملنے کے بارے میں حدیث میں آتا ہے : " المَبطون شہِید وَالْمَطْعُونُ شَہِيدٌ[1] "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ پیٹ کی بیماری میں یعنی ہیضہ سے مرنے والا شہید ہے اور طاعون کی بیماری میں مرنے والا شہید ہے۔

(2)مریضوں کی بیمار پُرسی اور اُن کے ساتھ نرم گفتاری:ابیماری میں انسان کا دل بہت تنگ ہوتا ہے ہر وقت نفسیاتی دباؤ کا شکار رہتا ہے اس وجہ سے شریعت نے اُن کی عیادت کرنے کا حکم دیا ہے تا کہ اُن کو تسلی ہو ۔مریض کی عیادت کرنا سنت نبویہ میں سے ہے، جیساکہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور مریض کی عیادت یعنی مزاج پرسی کرو اور قیدی کو چھڑاؤ"[2]

اور مریض کی عیادت پر کتنا اجر ملتا ہے اس کا اندازہ ان احادیث سے ہوتا ہے:"بیمار کی بیمارپرسی کرنے والا(ایسا ہے جس طرح کوئی) جنت(تک جانے) کے راستے پر ہوتا ہے جب تک وہ واپس نہ ہو"[3]

دوسری روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :جب تم مریض کے پاس یا کسی مرے ہوئے آدمی کے پاس آؤ تو اچھی بات کہو اس لیے کہ جو تم کہتے ہو اس پر ملائکہ آمین کہتے ہیں"[4]

(3)بیمار کے لیے شفا کی دعا کرنا:اپنے لئے یا کسی اور کے لئے دعا مانگنا نبوی عمل ہے لیکن مریض کے سامنے اس کے لیے صحت یابی کی دعا کرنے سے اس کی تسلی ہوجاتی ہے ۔نبی علیہ السلام کے عمل مبارک سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہ نبی علیہ السلامجب کسی مریض کے پاس تشریف لے جاتے یا کوئی مریض آپ کے پاس لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے:

اے رب لوگوں کے! بیماری دور کر دے، اے انسانوں کے پالنے والے! شفاء عطا فرما، تو ہی شفاء دینے والا ہے۔ تیری شفاء کے سوا اور کوئی شفاء نہیں، ایسی شفاء دے جس میں مرض بالکل باقی نہ رہے"[5]

مریض کے لیے جب کوئی دعا کی جائے تو مریض کو پورے یقین کے ساتھ اس پر آمین کہنا چاہئیے کیونکہ وہ قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ناامیدی کا اظہار نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ اللہ تعالی اپنے بندے کے ساتھ اُس کے گمان کے مطابق معاملہ فرماتا ہے۔حدیث قدسی ہے:

" سیدناابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جو وہ میرے متعلق رکھتا ہے ۔

حدیث میں ایک واقعہ آیا ہے کہ:

"ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامایک اعرابی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس سے کہا کہ کوئی مضائقہ نہیں یہ)بیماری(تمہارے لیے پاکی کا باعث

---

[1]بخاری،کتاب الطب،باب مایذکر فی الطاعون،رقم:5733

[2]بخاری،کتاب المرضٰی،باب وجوب عیادۃ المریض،رقم:5373

[3]مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب فضل عیادۃ المریض،رقم:6716

[4]مسلم ،کتاب الجنائز،باب مایقالعند المریض والمیت،رقم:2168

[5]بخاری،کتاب المرضٰی،باب دعاءالعائد للمریض،رقم:5675

ہے، اس پر اس نے کہا کہ جناب یہ وہ بخار ہے جو ایک بڈھے پر جوش مار رہا ہے اور اسے قبر تک پہنچا کے رہے گا، نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر یونہی ہو گا"[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیادت کرنے والاجو بھی دعا مانگے مریض کو اُس پر یقین کرتے ہوئے آمین کہنا چاہئیے ورنہ پھر وہی حالت باقی رہے گی۔

(ب)مریضوں کاعلاج کرنا،امراض کے لیے مخصوص نبوی ادویات: سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیناچاہئیے کہ علاج کرنا سنت نبوی ہے۔دوائی میں اپنی کوئی تاثیر نہیں ہوتی لیکن چونکہ شریعت نے اس طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اس وجہ سے ہمارا یقین ہے کہ یقیناَ اس میں خیر وبر کت ہوگی دوسرا یہ کہ بیماری کے لیے اللہ نے علاج پیدا فرمایا ۔لہٰذا مریض کو خود بھی علاج معالجہ کرنا چاہئیے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرنی چاہئیے۔ابو داؤد میں ایک روایت ہے کہ:

"اسامہ بن شریک [2]رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ کے اصحاب اس طرح)بیٹھے(تھے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، تو میں نے سلام کیا پھر میں بیٹھ گیا، اتنے میں ادھر ادھر سے کچھ دیہاتی آئے اور انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا ہم دوا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :دوا کرو اس لیے کہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی نہیں پیدا کی ہے جس کی دوا نہ پیدا کی ہو، سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے"[3]،[4]

اس حدیث میں نبی علیہ السلام نے باقاعدہ دوائی استعمال کرنے کی اجازت بلکہ تلقین فرمائی ہے کہ علاج کے لیے دوا ئی استعمال کرنی چاہئیے۔پھر اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مریض کے لیے دوائی کا استعمال کرنا صرف مباح ہے یا مستحب ؟اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے علماء کہتے ہیں کہ خود نبی علیہ السلام کے فعل نے یہ ثابت کیا ہےکہ دوائی کا استعمال کرنا مستحب اور باعث ثواب ہے،کیونکہ آپ ﷺ نےکچھ بیماریوں کے لیے خاص علاج بھی تجویز فرمایا ہے ۔جو اس بات پر دلالت کرتاہے کہ علاج اور دوائی استعمال کرنا مستحب ہے"[5]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یہ رویت بھی نقل کی ہے کہ:

"نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے :ہر مرض کے لیے دوا ہے پس جب اسی مرض کو دواپہنچے تو اللہ کے حکم سے وہ مرض ٹھیک ہوجاتا ہے"[6]

بیماریوں کے علاج کے لیے نبوی طریق علاج:

بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ فلاں بیماری میں مؤثر ہے۔فلاں بیماری کے لیے مفید ہے جیسا کہ "کلونجی" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ:

---

[1]بخاری،کتاب التوحید،باب فی المشیۃ والارادۃ،رقم:3616

[2]اسامہ بن شریک،ذبیانی رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہے۔بنی ثعلب سے تعلق رکھتے تھے۔الاستیعاب78/1

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الطب،باب فی الرجل یتداوی،رقم:3857

[4]قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص355

[5]النووی،ج14،ص191

[6]مسلم،کتاب السلام،باب لکل داء واستحباب التداوی،رقم:5871

(1)- ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی علیہ السلامسے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیاہ دانوں میں ہر بیماری سے شفاء ہے سوا »سام«کے۔ ابن شہاب نے کہا کہ »سام«موت ہے اور سیاہ دانہ کلونجی کو کہتے ہیں"[1]

(2) اسی طرح نبی علیہ السلام نے شہد وغیرہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ شفاء تین چیزوں میں ہے پچھنا لگوانے میں، شہد پینے میں اور آگ سے داغنے میں مگر میں اپنی امت کو آگ سے داغنے سے منع کرتا ہوں"[2]

(3)اور شہد کے متعلق مزید فرمایا کہ یہ اسہال میں مفید ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ [3]نے کہ ایک صاحب نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا بھائی پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ انہیں شہد پلا پھر دوسری مرتبہ وہی صحابی حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس مرتبہ بھی شہد پلانے کے لیے کہا وہ پھر تیسری مرتبہ آیا اور عرض کیا کہ)حکم کے مطابق(میں نے عمل کیا)لیکن شفاء نہیں ہوئی(۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے اور تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، انہیں پھر شہد پلا۔ چنانچہ انہوں نے شہد پھر پلایا اور اسی سے وہ تندرست ہو گیا"[4]

(4)عود ہندی کے متعلق آپ کا ارشاد ہوا:

" تم لوگ اس عود ہندی کا استعمال کیا کرو کیونکہ اس میں سات بیماریوں کا علاج ہے۔ حلق کے درد میں اسے ناک میں ڈالا جاتا ہے، پسلی کے درد میں چبائی جاتی ہے"[5]

(5) اسی طرح آنکھوں کے علاج کے لیے " کھنبی" کی دوا تجویز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :" کھنبی »من«میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفاء ہے۔[6]

(6)"عجوہ" کھجور کے متعلق فرمایا کہ اس میں تریاق ہے جیسا کہ ارشاد ہے:"عجوہ)کھجور(جنت کا پھل ہے، اس میں زہر سے شفاء موجود ہے اور صحرائے عرب کا "فقعہ" ایک طرح کا "من"سلوی والا "من"ہے، اس کا عرق آنکھ کے لیے شفاء ہے"[7]"[8]

(7)بخار میں کمی کے لیے ٹھنڈا پانی اکسیر ہوتا ہے۔اس کے متعلق فرمایا:" الْحُمَّى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَأَبْرِدُوهَا بِالْمَاءِ[9]"بخار جہنم کی بھاپ ہے، لہٰذا اسے پانی سے ٹھنڈا کرو"

---

[1]بخاری،کتاب الطب،باب الحبۃ السوداء،رقم:5688

[2]بخاری،کتاب الطب،باب الشفاء فی ثلٰث،رقم:5681

[3]آپ ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدری،انصاری ،خزرجی ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ 10ق ھ/613ء کو پیدا ہوئے۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ نبی علیہ السلام کے علاوہ جابر بن عبداللہؓ،عمر بن الخطابؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے فیض حاصل کیا جبکہ آپؓ سے ابراہیم نخعیؒ، حسن بصریؒ اور جابر بن عبداللہؓ نے فیض حاصل کیا۔بارہ غزوات میں حصہ لیا۔ 74ھ/693ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص181۔ابن حجر،الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج3،ص78۔الزرکلی،الاعلام،ج3،ص87)۔

[4]صحیح مسلم،کتاب السلام،باب التداوی بسقی العسل،رقم:5901

[5]صحیح بخاری،کتاب الطب،باب السعوط بالقسط الهندی البحری،رقم:5692

[6]بخاری،کتاب الطب،باب وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوی،رقم:4478

[7]سنن ترمذی،کتاب الطب،باب الکمأۃ والعجوۃ،رقم:2066

[8] یہ حدیث صحییح ہے۔الالبانی،صحیح و ضعیف سنن ترمذی،ج5،ص66

[9]بخاری،کتاب،باب صفۃ النار وانها مخلوقۃ، رقم:3263

(8)اونٹ کا دودھ اور پیشاب بھی اپنے اندر شفاء رکھتا ہے اس وجہ سے آپ نے اسے بطور علاج تجویز فرمایا،جیساکہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"(عرینہ کے)کچھ لوگوں کو مدینہ منورہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی تھی تو نبی علیہ السلامنے ان سے فرمایا کہ وہ آپ)نبی علیہ السلام(کے چرواہے کے ہاں چلے جائیں یعنی اونٹوں میں اور ان کا دودھ اور پیشاب پئیں۔ چنانچہ وہ لوگ نبی علیہ السلامکے چرواہے کے پاس چلے گئے اور اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیا جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے انہیں تلاش کرنے کے لیے لوگوں کو بھیجا جب انہیں لایا گیا تو نبی علیہ السلامکے حکم سے ان کے بھی ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے اور ان کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی)جیسا کہ انہوں نے چرواہے کے ساتھ کیا تھا"[1]

نوٹ:یہ تو شاید اُن لوگوں کی خصوصیت ہو یا نبی علیہ السلام کی۔اب اس طریقے سے علاج کی اجازت نہیں ہے۔

(9) دل کے امراض اور پریشانی سے بچاؤ کے بارے میں فرمایا:" التَّلْبِينَةُ مُجِمَّةٌ لِفُؤَادِ الْمَرِيضِ تَذْهَبُ بِبَعْضِ الْحُزْنِ[2]" تلبینہ (رواء، دودھ اور شہد ملا کر دلیہ) مریض کے دل کو سکون پہنچاتا ہے اور غم کو دور کرتا ہے)کیونکہ اسے پینے کے بعد عموماً نیند آ جاتی ہے یہ زود ہضم بھی ہے"۔

(10)قُرآن کریم سے علاج:بچھو کے کاٹے کا قُرآن کریم پڑھ کر دم کرنے سے علاج بھی ثابت ہے جیسا کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:"نبی علیہ السلامکے چند صحابہ در حالت سفر عرب کے ایک قبیلہ پر گزرے۔ قبیلہ والوں نے ان کی ضیافت نہیں کی کچھ دیر بعد اس قبیلہ کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا، اب قبیلہ والوں نے ان صحابہ سے کہا کہ آپ لوگوں کے پاس کوئی دوا یا کوئی جھاڑنے والا ہے۔ صحابہ نے کہا کہ تم لوگوں نے ہمیں مہمان نہیں بنایا اور اب ہم اس وقت تک دم نہیں کریں گے جب تک تم ہمارے لیے اس کی مزدوری نہ مقرر کر دو۔ چنانچہ ان لوگوں نے چند بکریاں دینی منظور کر لیں پھر)ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ(سورۃ فاتحہ پڑھنے لگے اور اس پر دم کرنے میں منہ کا تھوک بھی اس جگہ پر ڈالنے لگے۔ اس سے وہ شخص اچھا ہو گیا۔ چنانچہ قبیلہ والے بکریاں لے کر آئے لیکن صحابہ نے کہا کہ جب تک ہم نبی علیہ السلامسے نہ پوچھ لیں یہ بکریاں نہیں لے سکتے پھر جب نبی علیہ السلامسے پوچھا تو آپ مسکرائے اور فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ سورۃ فاتحہ سے دم بھی کیا جا سکتا ہے، ان بکریوں کو لے لو اور اس میں میرا بھی حصہ لگاؤ۔[3]

(11)قُرآن کریم پڑھ کر دم کر لینا بھی حدیث میں آیا ہے:

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ نبی علیہ السلامجب بیمار پڑتے تو اپنے اوپر معوذتین)سورۃ الفلق اور سورۃ الناس(پڑھ کر دم کر لیا کرتے تھے اور اپنے جسم پر اپنے ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے، پھر جب وہ مرض آپ کو لاحق ہوا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو میں معوذتین پڑھ کر آپ پر دم کیا کرتی تھی اور ہاتھ پر دم کر کے نبی علیہ السلامکے جسم پر پھیرا کرتی تھی"[4]

---

[1]بخاری،کتاب الطب،باب الدواء بابوال الابل،رقم:5686

[2]بخاری،کتاب الطب،باب التلبینة،رقم:5417

[3] بخاری،کتاب الطب،باب الرقی بفاتحۃ الکتاب،رقم:5736

[4]بخاری،کتاب المغازی،باب مرض النبی ووفاتہ،رقم:4439

(12) ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:
"عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے مجھے حکم دیا یا (آپ نے اس طرح بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے)حکم دیا کہ نظر بد لگ جانے پر معوذتین سے دم کر لیا جائے"[1]

(13) اسی طرح صحیحین کی روایت میں ہے کہ:
"نبی علیہ السلامنے ان کے گھر میں ایک لڑکی دیکھی جس کے چہرے پر)نظر بد لگنے کی وجہ سے(کالے دھبے پڑ گئے تھے۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اس پر دم کرا دو کیونکہ اسے نظر بد لگ گئی ہے"[2]

<u>(ج)شرعی احکام میں بیماروں کے لیے رعایت:</u>بعض اوقات مریض کی حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ وہ شرعی احکام کی تکمیل کی پوری طاقت نہیں رکھ سکتا۔اس وجہ سے شریعت نے اُس کی کمزوری کا لحاظ کرکے احکام کی بجاآوری میں اُسے کچھ نہ کچھ رعایت دی ہے۔جیسے اگر نماز کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر یا لیٹ کر ادا کرے۔سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

> "عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ اس لیے میں نے نبی علیہ السلامسے نماز کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو"[3]

بیماروں کی تو یہاں تک رعایت رکھی گئی ہے کہ امامت کرتے ہوئے امام کو پابند کردیا گیا ہے کہ وہ جماعت مختصر کردے تا کہ مقتدیوں کو تکلیف نہ ہو۔روایت میں آتا ہے کہ:

> "ابومسعود انصاری [4]سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص(نے)نبی علیہ السلامکی خدمت میں آ کر(عرض کیا۔ یا رسول اللہ! فلاں شخص لمبی نماز پڑھاتے ہیں اس لیے میں (جماعت کی)کیونکہ میں دن بھر اونٹ چرانے کی وجہ سے رات کو بہت زیادہ تھک جاتا ہوں اور طویل قرآت سننے کی طاقت نہیں رکھتا۔(راوی کہتا ہے)کہ اس دن سے زیادہ میں نے کبھی نبی علیہ السلامکو وعظ کے دوران اتنا غضب ناک نہیں دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو !تم)ایسی شدت اختیار کر کے لوگوں کو دین سے(نفرت دلانے لگے ہو۔)سن لو(جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ ہلکی پڑھائے، کیونکہ ان میں بیمار، کمزور اور حاجت والے)سب ہی قسم کے لوگ(ہوتے ہیں"[5]

---

[1]بخاری،کتاب الطب،باب رقیۃ العین،رقم:55738

[2]بخاری،کتاب الاشربہ،باب رقیۃ العین،رقم:5739

[3]بخاری،کتاب تقصیر الصلوٰۃ،باب اذالم یطق قاعدا صلی علی جنب،رقم:1117

[4]عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اسیرہ۔خزرجی،انصاری،ابو مسعودرضی اللہ عنہ،بدری کے نام سے مشہور ہے لیکنجمہور کے نزدیک بدر میں شریک نہیں تھے۔عقبہ میں شریک تھے۔قال خلیفۃ:قیل لہ بدری لانہ سکن مآء بدر،کوفہ میں مقیم تھے۔ 41ھ یا42ھ اورایک قول کے مطابق 60ھ کے بعدوفات پائے۔(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب4:1757،رقم:3173)

[5]بخاری،کتاب العلم،باب الغب فی الموعظۃ والتعلیم اذارای ما یکرہ،رقم:90

اور بیمار کی تسلی کرتے ہوئے سنت نبویہ ہے کہ۔

"سیدنا جابررضی اللہ عنہ فرماتے ہے کہ ہمنبی علیہ السلام کے ساتھ ایک غزوے میں شریک تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جہاں بھی تم چلے اور جس وادی کو بھی تم نے قطع کیا وہ)اپنے دل سے(تمہارے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ کسی عذر کی وجہ سے رک گئے تھے"[1]

(د)وبائی امراض کے متعلق نبوی ارشادات:اسلام ایک جامع دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مرحلے کے لیے ہدایات دیتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں سنت نبویہ لوگوں کو یہ ہدایت جاری کرتی ہے کہ جہاں وبائی ا مراض پھیل جائیں وہاں نہ جایا کریں اور جہاں تم رہتے ہوں اگراس علاقے وبائی امراض ہوں تووہاں سے نہیں بھاگنا چاہئیے جیسا کہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ جب تم سن لو کہ کسی جگہ طاعون کی وبا پھیل رہی ہے تو وہاں مت جاؤ لیکن جب کسی جگہ یہ وبا پھوٹ پڑے اور تم وہیں موجود ہو تو اس جگہ سے نکلو بھی مت"[2]

الغرض سنت نبویہ میں بیماروں کے حقوق اور اُن کے لیے فائدہ مند تمام امور کے بارے میں واضح ارشادات موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ایک طرف تو مرض میں کمی آتی ہے اور دوسری طرف مریض کی تسلی ہو جاتی ہے۔آج دنیا بیماروں کے لیے کاوشیں تو کررہی ہیں لیکن امراض ختم ہونے کے بجائے اورزیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔کیونکہ تمام ادویہ میں کیمیکل استعمال ہوتے ہیں جس کا سائیڈ ایفیکٹ بہت زیادہ ہوتا ہے ۔ کیمیکل سے بنی ہوئی ادویات سے بیماری عارضی طور پر دب جاتی ہے۔لیکن بیماری ختم ہونے کے بجائے اپنے ساتھ دیگر بہت ساری بیماریاں لے کر آتی ہے۔اس وجہ سے آج ترقی یافتہ دنیا ایسے طریقۂ علاج دریافت کرنے کے درپے ہے جو مریض کے لیے مفید بھی ہو اور اس کا سائیڈ ایفیکٹ بھی نہ ہو۔اس سلسلے میں نظر سنت نبویہ کی طرف جاتی ہے کہ یہی واحد وہ طریقہ ہے جو امراض کا سد باب کر سکتی ہے۔جس میں حجامہ،شہد سے علاج،دودھ اور کلونجی وغیرہ سے علاج کرنا ہے۔دنیا میں جہاں بھی ایسی ادویات تیار ہوتی ہیں جن میں مذکورہ اشیاء میں سے کوئی چیز استعمال ہوتی ہو تو اُس کا مرجع سنت نبویہ ہی ہوگا۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا جب تاریخ پر نظر ڈالتی ہے تو اُن کو واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ اِن مذکورہ طریقوں کے استعمال ہی کے وجہ سے خیرالقرون میں بیماریوں کی شرح آج کے بنسبت بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔اس وجہ سے وہ مجبور ہوکر سنت نبویہ کے طرف آرہے ہیں۔

---

[1] مسلم،کتاب الامارۃ،باب ثواب من حبسہ عن الغزو مرض او عذر آخر،رقم:5041

[2] بخاری،کتاب الطب،باب مایذکر فی الطاعون،رقم:5728

فصل پنجم
خُدَّام،طلباء،علماء،ہمسائیوں اولوالامر(حکاّم) اور غیر مسلموں کے سماجی حقوق

اسلام نے دنیا کو آقا و غلام کا تصور نہیں دیا ہےبلکہ پہلے سے آتے رہنے والے "غلامی"کے نظام کی بیخ کنی کی ہے ۔اسلام غلام بنانے پر نہیں بلکہ غلاموں کو آزاد کرانے پر زور دیتا ہے۔ غلاموں کوآزاد کرانے کے بارے میں اسلامی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں کہ یہ کتنے بڑے اجر وثواب کی بات ہےبلکہ کچھ مخصوص صورتیں تو ایسی بھی ہیں کہ اُن میں مسلمان سےاگر کہیں کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اُن صورتوں میں غلام آزاد کرکے اپنی اُس غلطی کا ازالہ کرے گا۔اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو مکرم پیدا فرمایا ہے اس وجہ سے وہ کسی کی غلامی میں زندگی بسر کرکے اپنی تکریم برقرار نہیں رکھ سکتا۔اس وجہ سے فطری طور پر انسان کو آزاد ہو نا چاہئیے۔۔جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> "اور انسان کو ہم نے عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں(بوجھ وغیرہ اُٹھانے کے لیے) سواری دی اور پاکیزہ خوراک دے دی اور فضیلت دی اُسے اپنی بہت سی مخلوقات پر"[1]

---

[1] الاسراء70:17

گذشتہ زمانے میں عام طور پر غلاموں سے خدمت لی جاتی تھی جیسا کہ آج کل عام خادموں سے بھی لی جاتی ہے۔آج کل غلاموں کا تصورتوتقریباََ ختم ہوچکا ہے۔لیکن آج بھی خادموں اور نوکروں کی ضرورت موجود ہے پس اسلام اللہم کے حقوق کے سلسلے میں بھی ہدایات دیتا ہے۔اُن سب میں یہ بات مشترک ہے کہ خادم تمہاری طرح ہی کا انسان ہوتا ہے اپنے لیے خدمت کاپیشہ اختیا کرنے کی وجہ سے وہ اچھوت نہیں بن جاتا لہٰذا اُ سکے ساتھ انسانوں جیسا سلوک روا رکھنا چاہئیے۔ذیل میں چند حقوق کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

1۔ خوراک وپوشاک میں حق: یہ دونوں ایسی بنیادی ضرورتیں ہیں جو کہ تقریباََ ہر انسان کی جزو زندگی ہے اور ان کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے اسلام کی نظر میں تمام انسان اس حق میں برابر ہیں۔ارشاد نبوی ﷺ کو نقلاََ سیدناابوذررضی اللہ عنہ[1]سے روایت کرتے ہوئے ایک صاحب کہتے ہے:

> "میں نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان کے بدن پر اور اُن کے غلام کے بدن پر ایک ہی قسم کا جوڑا تھاہم نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ایک دفعہ میری ایک صاحب سے میری کچھ گالی گلوچ ہو گئی تھی۔ انہوں نے نبی علیہ السلامسے میری شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے انہیں ان کی ماں کی طرف سے عار دلائی ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہارے غلام بھی تمہارے بھائی ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری ماتحتی میں دے رکھا ہے۔ اس لیے جس کا بھی کوئی بھائی اس کے قبضہ میں ہو اسے کھلا نے اور پہنانے میں خو دجیسا سلوک کرو اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ لیکن اگر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالو تو پھر ان کی خود مدد بھی کر دیا"[2]

اس حدیث میں امت کے لیے یہ ہدایت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خادم یا نوکر کی اولاد میں سے ہو تو اُ سے اُس پر عار نہیں دلانی چاہئیے۔اور ترجمۃ الباب سے اس کا تعلق واضح ہے کہ خادموں کو اپنے جیسا کھانا اور لباس دینا چاہئیے۔ اور اُن سے اُن کی طاقت سے زیادہ کام نہیں لینا چاہئیے۔ خوراک اور پوشاک دینا مالک پراگر چہ واجب تو نہیں ہے لیکن مستحب ضرور ہے اور طاقت سے زیادہ کام لینے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہے"[3]

اسی طرح " إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ " کے الفاظ سے واضح ہے کہ اُن کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک اختیار کرنا چاہئیے۔ہر مسلمان اپنے خادم اور نوکر کو اپنے بھائی کی نظر سے دیکھے نہ کہ ایک آقا کی نظر سے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے خادم کو ایسی شکایت کرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔
ایک دوسری حدیث میں اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر بٹھانے سے متعلق تاکید آئی ہے :

---

[1]سیدناابوذر غفاری جندب بن جنادہؓ ہیں۔صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔نبی علیہ السلام اور معاویہ بن ابو سفیانؓ سے روایت لی ہے۔تلامذہ میں انس بن مالکؓ،اسامہ بن سلمانؒ اور احنف بن قیسؒ شامل ہیں۔ 32ھ/652ء میں وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج8،ص369۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص75۔ابن حجر،الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج7،ص125)۔

[2]بخاری،کتاب الایمان، باب المعاصی من امر الجاهلية،رقم:30

[3]النووی،ج11،ص133

نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم میں کسی شخص کا خادم اس کا کھانا لائے تو اگر وہ اسے اپنے ساتھ نہیں بٹھا سکتا تو کم از کم ایک یا دو لقمہ اس کھانے میں سے اسے کھلا دے)کیونکہ(اس نے)پکاتے وقت(اس کی گرمی اور تیاری کی مشقت برداشت کی ہے"[1]

خادم کا اپنے ساتھ بٹھانا مستحب ہے کوئی واجب اور ضروری نہیں ہے۔اس حدیث میں مکارم اخلاق اورخوراک میں برابری کا درس ہے۔اور خاص کر اس کھانے میں جو اُس خادم نے خود تیار کیا ہو یا کہیں دوسری جگہ سے لایا ہو،کیونکہ ایک طرف اُس نے اُس طعام کو تیا ر کرنے میں گرمی برداشت کی اور دوسری طرف اُس کھانے کی خوشبو سونگھ کر کھانے کی طرف رغبت دل میں ضرور پیدا ہوئی ہوگی۔

<u>2۔خادموں کو مارنے کی ممانعت:</u> انسان ہو نے کے ناطے خادم سے غلطی ہو سکتی ہے لہٰذا اگر کسی خادم سے غلطی سرزد ہو جائے تو اس وقت مالک کو چاہئیے کہ اسے نہ مارے اور اگر مارے بھی تو چہرے ہر بالکل نہ مارے کیونکہ رسول اللہ کی صریح حدیث ہے:

" ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا اتنے میں میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی: اے ابومسعود! جان لو،لیکن میں غصے میں ہونے کی وجہ سے بات نہیں سمجھ سکا۔پھر فرماتے ہیں کہ جب وہ میرے قریب آیا۔تو وہ نبی علیہ السلام تھے جو فرماتے تھے" ابومسعود! جان لوابومسعود! جان لو " میں نے کوڑا زمین پر پھینک دیا،آپ ﷺ نے فرمایا: ابومسعود! جان لو اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت و اختیار رکھتا ہے جتنا تم اس)غلام(پر رکھتے ہو، میں نے عرض کیا:آئندہ کے لیے کبھی بھی نہیں ماروں گا"[2]

اس سے زیادہ سختی کا حکم فرماتے ہوئے آپ ﷺنے ارشاد فرمایا:

"جو شخص اپنے غلام کو تھپڑ لگائے یا اسے مارے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے"[3]

<u>(3)حسن معاشرت کالحاظ کرتے ہوئے نوکروں کو مناسب الفاظ سے</u>

<u>پکارنا:</u>سنت نبویہ کا مطالع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی خادم کو ایسے نامناسب الفاظ سے مخاطب نہیں فرمایا جس میں اُس عزت نفس مجروح ہوئی ہو،امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ:

> "نبی علیہ السلام نے فرمایا"کوئی شخص یہ نہ کہے۔ اپنے رب کو کھانا کھلا، اپنے رب کو وضو کرا، اپنے رب کو پانی پلا"۔ بلکہ صرف میرے سردار، میرے آقا کے الفاظ کہنا چاہئے۔ اسی طرح کوئی شخص یہ نہ کہے۔"میرا بندہ، میری بندی، بلکہ یوں کہنا چاہئے میرا چھوکرا، میری چھوکری، میرا غلام"[4]

---

[1]بخاری،کتاب الاطعمۃ،باب الاکل مع الخادم،رقم:5460

[2]مسلم،کتاب الایمان،باب صحبۃ الممالیک وکفارۃ من لطم عبده،رقم:4396

[3]مسلم،کتاب الایمان،باب صحبۃ الممالیک وکفارۃ من لطم عبده ،رقم:4388

[4] بخاری،کتاب العتق،باب کراھیۃ التطاول علی الرقیق۔رقم:2552،مسلم،کتاب الالفاظ من الادب،باب حکم اطلاق لفظۃ العبد والامۃ والمولی والسید،رقم:6014

(4)خادموں کی اچھی تربیت کرنا: اچھی تربیت سے انسان میں انسانیت آتی ہے اس وجہ سے اگر خادموں کی بھی اچھی تر بیت کا اہتمام کیا جائے تو اس سے ایک طرف معاشرے کا فائدہ ہے دوسری طرف مالک کا بھی،کیونکہ پھر وہ اچھے طریقے سے مالک کی خدمت کر سکے گا اس سلسلے میں ایک حدیث میں اس طرف اشارہ ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا ’’جس کسی کے پاس بھی کوئی باندی ہو اور وہ اسے پورے حسن و خوبی کے ساتھ ادب سکھائے، پھر آزاد کر کے اس سے شادی کر لے تو اسے دوگنا ثواب ملتا ہے اور جو غلام اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے بھی تو اسے بھی دوگنا ثواب ملتا ہے"[1]

اللہم چونکہ بنفسہ آزاد ہوتے ہیں لیکن اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے نوکری اور خدمت کے پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں۔یہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔خدمت گاری کا پیشہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔خو دنبی علیہ السلام کے خادم تھے جن میں سب سے زیادہ مشہو ر جلیل القدر صحابی سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہے۔

خادم کسی معاوضے کے بدلے میں لوگوں کی خدمت کرتا ہے جو کہ دنیاوی حیثیت سے ایک کمزور پیشہ ہے۔مالک اور خادم کے درمیان خدمت کی وجہ سے باربار ملنے ملانے کے مواقع آتے ہیں جس میں کبھی کبھار خادم سے کوتاہی ہوجاتی ہے اس وجہ سے سنت نبویہ میں اُن کی خوراک،پوشاک،ظلم سے پر ہیز،مارنے اور گالی دینے کی ممانعت کے بارے میں واضح احکامات آئے ہیں۔نبی علیہ السلام کی زندگی مبارک اس حوالے سے بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔خادموں کے ساتھ حسن سلوک بیان کرتے ہوئے سیدنا انس رضی اللہ عنہ اپناواقعہ بیان کرتے ہیں:

"انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی علیہ السلامکی دس سال تک خدمت کی لیکن آپ نے کبھی مجھے اف تک نہیں کہا اور نہ کبھی یہ کہا کہ فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا"[2]

خادموں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ آسانی کے برتاؤ اور تعاون کرنے کا حکم ہے۔سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ کی روایت ہے کہ:

"ایک شخص نبی علیہ السلامکے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم خادم کو کتنی بار معاف کریں، آپ)سن کر(چپ رہے، پھر اس نے اپنی بات دھرائی، آپ پھر خاموش رہے، تیسری بار جب اس نے اپنی بات دھرائی تو آپ نے فرمایا” :ہر دن ستر بار اسے معاف کرو"[3]،[4]

جیسا کہ سنت نبویہ نے مالکوں کے لیے ہدایات دی ہے اسی طرح خادموں کی بھی کچھ ذمہ داریاں مقرر کی ہے۔وہ یہ کہ مالک کے مال،جان اور عزت کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"تم میں سے ہر کوئی ایک طرح کا حاکم ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ پس بادشاہ حاکم ہی ہے اور اس کی رعیت کے بارے میں اس سے سوال ہو گا۔ ہر انسان

---

[1]بخاری،کتاب العتق،باب العبد اذااحسن عبادة ربہ ونصح سیده، رقم2547

[2]بخاری،کتاب الادب،باب حسن الخلق والسخاء ومایکره من البخل۔رقم:6038

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الادب،باب فی حق المملوک،رقم:5166

[4]قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج11،ص164

اپنے گھر کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ یہ سب میں نے نبی علیہ السلامسے سنا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ نبی علیہ السلامنے یہ بھی فرمایا تھا کہ مرد اپنے والد کے مال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔ پس ہر شخص حاکم ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا"[1]

الغرض سنت نبویہ نے زندگی کا کوئی ایساشعبہ نہیں جس کے لیے سنت نبویہ نے ہدایات نہ دی ہو ۔معاشرے کے استحکا م کے لیے شریعتِ مطہرہ جتنا اہتمام فرماتی ہے دنیا کا کوئی بھی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔اسلام طاقتوروں کے مقابلے میں کمزوروں کے حقوق کی زیادہ اہمیت بیان کرتا ہے۔ تاریخ اسلام میں جتنی نامور شخصیات گزری ہیں ،اُن میں اکثر کا تعلق (مالی طور پر) کمزور خاندانوں سے رہا ہے۔صحابہ ہوں،تابعین ہوں ،تبع تابعین ہوں یا سلف صالحین ۔اُن میں کبار علما،فقہاء،مفتی حضرا ت،سپہ سالار،میدان جہاد کے شہسوار اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے حضرات ہوں ۔سب نے ایسے کارنامے انجام دئے ہیں کہ تاابد ان کے نام یاد رکھے جائیں گے ۔مسلمانوں کی قیادت جیسے اہم شعبہ میں بھی ان کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ۔اسی طرف اللہ تعالی کے اس ارشاد میں اشارہ ہے:

"اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں اُن پر احسان کریں اور اُن کو پیشوا بنائیں اور انہیں (ملک کا) وارث کریں"[2]

---

[1] صحیح بخاری،کتاب ،باب العبد راع فی مال سیدہ ولایعمل الا باذنہ،رقم2409،صحیح مسلم،کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علیہ،رقم4828

[2] القصص5:28

طلبااورعلما کے سماجی حقوق

اللہ کے دین سے منسلک رہنے والے تمام افراد قابل عزت ہو تے ہیں ۔پھر اُن میں جنہوں نے اپنی زندگیاں اللہ تعالی کے دین کے لیے وقف کی ہوں اُن کے حقوق دوسرےعام لوگوں کے بنسبت بہت اہم ہوتے ہیں۔چونکہ یہ براہ راست علوم وحی کے امین ہوتے ہیں اس وجہ سے معاشرے میں اُن کی توقیرواحترام کرنا سب مسلمانوں کے لیے ضروروی ہے۔

اللہ تعالی جسے چاہتا ہے علم کے ذریعے سر بلندی عطا فرمادیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے اللہ ان کے درجے اونچے کرے گا۔ اور اللہ تمہارے سب کاموں سے خبردار ہے"[1]

یہاں پر علم کاذکر ایسے محل میں کیا گیا ہے جو اللہ تعالی کی نعمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اور آیت ِقرآنی کے مطابق اللہ جل شانہ نے انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے علم میں اضافے کی دعا کرتا رہے ۔جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:"رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا[2]"

اللہ تعالی کے دین کے سمجھ رکھنے والے اللہ کے دربار میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔اور وہ ہی حقیقی طور پر اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ جل شانہ کاارشاد ہے:" إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء[3]"اللہ تعالی سے تو اس کے بندوں میں سے صاحب علم ہی ڈرتے ہیں "

اس وجہ کی بناء پر سے عام مسلمانوں سے ان کا درجہ بلند رکھا گیا۔تعلیم کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں قُرآنی آیات اوراحادیث مبارکہ کو عنوان کے طور پر لائے ہیں۔

اللہ تعالی کے اس ارشاد سے علم کی اہمیت معلوم ہوجاتی ہے

"آپ جان لیجیئے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے[4](تو)گویا(اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتداء فرمائی"

---

[1] المجادلۃ11:58
[2] طہ114:20
[3] فاطر28:35
[4] محمد19:47

اور حدیث میں ہے "علماء انبیاء کے وارث ہیں،پیغمبروں نے علم کا ورثہ چھوڑا ہے۔ پھر جس نے علم حاصل کیا اس نےبہت بڑی مقدار حاصل کر لی۔ اور جو شخص کسی راستے پر حصول علم کے لیے چلے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے"[1]

اور اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔{إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ[2]}.اللہ تعالی سے تو اس کے بندوں میں سے صاحب علم ہی ڈرتے ہیں " دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:"{وَمَا يَعْقِلُهَا إِلاَّ الْعٰلِمُونَ[3]}.اور اس کو عالموں کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک جگہ ارشاد ہے

"{وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ ، أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحٰبِ السَّعِيرِ[4]}""اور ان لوگوں نے کہا اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو دوزخی نہ ہوتے"

اور ارشاد ہے:" "کیا علم والے اوربے علم برابر ہیں؟"[5]

اور حدیث میں ہے"نبی علیہ السلامنے فرمایا، جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی چاہتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عنایت فرما دیتا ہے[6]۔دوسری جگہ ارشاد ہے: اور علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے"[7]،[8]

"اور ابوذر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اس پر تلوار رکھ دو، اور اشارہ کیا اپنی گردن کی طرف ،اور مجھے گمان ہو کہ میں نے نبی علیہ السلامسے جو ایک کلمہ سنا ہے، گردن کٹنے سے پہلے بیان کر سکوں گا تو یقیناً میں اسے بیان کر ہی دوں گا اور نبی علیہ السلامکا فرمان ہے کہ حاضر کو چاہیے کہ)میری بات(غائب کو پہنچا دے"[9]

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آیت »كُونُوا رَبَّنِيِّينَ«سے مراد حکماء، فقہاء، علماء ہیں"[10]

اور »رباني«اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل سمجھا کر لوگوں کی)علمی(تربیت کرے"[11]

<u>مسلمان ہونے کے ناطے علماء سے حسن سلوک کرنا:</u>علماء وطلبا چونکہ انسانوں کی طرح انسان ہوتے ہیں اور پھر مسلمان بھی ہوتے ہیں اس جہ سے اُن کا سب سے

---

[1]بخاری،کتاب العلم، بَاب العلم قبل القول والعمل ۔
[2]فاطر28:35
[3]العنکبوت43:29
[4]الملک10:67
[5]الزمر9:39
[6]بخاری،کتاب العلم، باب قول اللہ تعالٰی:{فان للہ خمسہ } ،رقم:3116
[7]مسندالبزار،ج4،ص523،رقم:2055
[8]قال الالبانی:حسن،صحیح وضعیف الجامع الصغیر،ج10،ص40
[9]بخاری،کتاب العلم، باب قول اللہ تعالیٰ:فان للہ خمسہ ،رقم:3116
[10]طبری،ج5،ص528
[11]طبری،ج5،ص528

پہلا حق ان کو انسان اور مسلمان کی نظر سے دیکھنا ہے۔جو حقوق عام مسلمانوں کو حاصل ہیں وہ اُن کو بھی حاصل ہیں۔کیونکہ اللہ جل شانہ کاارشاد ہے:" إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ[1]"تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے" اور حدیث میں آتا ہے:"المؤمن اخو المؤمن لایظلمہ ولایسلمہ[2]" مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اُس پر خود ظلم کرے گا اورنہ اُسے ظلم کے حوالے کیا جائے گا" لہٰذا ایک مسلمان اور عالم ہونے کے ناطے اُن کو وہ حقوق ملنے چاہئیے جو کہ تمام انسانوں کو ملتے ہیں۔

<u>علماء کی توقیر کرنا:</u> چونکہ اللہ تعالیٰ اسلام کی حفاظت علماء ہی کے ذریعے فرماتا ہے اس وجہ سے اِن کی توقیر وعزت کرنا ہرمسلمان پر لازم ہے۔خود باری تعالی نے اُن کی صفت بیان فرمائی ہے:"اللہ گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور علم والے اور ملائک، جوانصاف پر قائم ہے وہ بھی"[3]

"اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنی شہادت کے ساتھ اہل علم کی شہادت کا تذکرہ فرمایادوسرا یہ کہ یہ تذکرہ علماء کی تعدیل کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے علماء کے علاوہ کسی اور کا تذکرہ شہادت کے طور پر ارشاد نہیں فرمایا یہ صرف علماء ہی کے حصے میں آیاہے

اللہ تعالی نے دنیا میں علمائے حق کو دینی بصیرت دی ہوئی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اُن کی زندگیاں تقوٰی کا نمونہ پیش کرتی ہیں اور تقوٰی کے بارے میں اللہ تعالی فرماتا ہے " إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "[4] بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ (انسان)ہے جو زیادہ متقی ہو"

اسی تقوی کی وجہ سے بھی اللہ تعالی کے دربار میں علماء کامقام بہت بلند ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے :

"نبی علیہ السلام نے فرمایا :وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑوں کی توقیر ،چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتااور عالموں کے حقوق نہ جاننے والا ہو "[5]،[6]

اورصحیحین کی روایت ہے کہ:

> "سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ[7]نبی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس علم و ہدایت کے ساتھ بھیجا ہے اس کی مثال زبردست بارش کی سی ہے جو زمین پر)خوب(برسے۔ بعض زمین جو صاف ہوتی ہے وہ پانی کو پی لیتی ہے اور بہت

---

[1]الحجرات10:49

[2]طبری5:528

[3]آل عمران18:3

[4]الحجرات13:49

[5]مسند احمد،ج5،ص323،رقم:22807

[6]قال الالبانی:حسن،صحیح الترغیب والترهیب،ج1،ص24

[7]عبداللہ بن قیس بن سلیم بن حضار بن حرب بن عامر بن اشعر ، ابو موسیٰ،الاشعری ہیں۔صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔12 قبل ھ کو یمن میں پیدا ہوئے۔ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا۔زبید،عون اور بصہ کے والی رہ چکے ہیں۔اصبہان اور اہواز آپ رضی اللہ عنہ نے فتح کئے۔آپ سے 355 احادیث مروی ہیں۔44ھ کو وفات پائے۔صحاح ستہ کے راوی ہیں۔ شیوخ میں نبی علیہ السلام کے علاوہ عمرؓ عبداللہ بن مسعودؓ جبکہ تلامذہ میں انس بن مالکؓ، حسن بصریؒ اور ثابت بن قیسؒ مشہور ہیں۔44ھ/665ء میں وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج3،ص376، الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج6،ص186)

بہت سبزہ اور گھاس اگاتی ہے اور بعض زمین جو سخت ہوتی ہے وہ پانی کو روک لیتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں اور سیراب کرتے ہیں۔ اور کچھ زمین کے بعض خطوں پر پانی پڑتا ہے جو بالکل چٹیل میدان ہوتے ہیں۔ نہ پانی روکتے ہیں اور نہ ہی سبزہ اگاتے ہیں۔ تو یہ اس شخص کی مثال ہے جو دین میں سمجھ پیدا کرے اور نفع دے، اس کو وہ چیز جس کے ساتھ میں مبعوث کیا گیا ہوں۔ اس نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے سر نہیں اٹھایا)یعنی توجہ نہیں کی(اور جو ہدایت دے کر میں بھیجا گیا ہوں اسے قبول نہیں کیا"[1]

اس حدیث میں علم کی تشبیہ "غیث" بارش کے ساتھ دی گئی ہے۔کیونکہ "حلم"اور "بارش" مسلمان کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں ۔ ایک(پانی)سے انسان کی جسمانی زندگی قائم ہے،جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: واللہ الذی ارسل الریٰح فتثیر سحابا فاحیینا بہ الارض بعد موتہ:[2]

" اور "علم"سے انسان کی روحانی زندگی قائم ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: آیا وہ جو پہلے مردہ تھا اُس کے بعد ہم نے اُسے زندگی دی اور اُس کے چلنے پھرنے کے لیے روشنی کردی اُس آدمی کے طرح ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں ہواور اس سےنکل نہ سکے اسی طرح کا فر لوگوں کو اپنا عمل اچھا دکھائی دیتا ہے[3]

اور ارشاد ہے:"اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول کاحکم مانو جب اللہ کا رسول تمہیں ایسے کا م کے واسطے بلاتاہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے[4]

اسی طرح علماء کی توقیر کے بارے میں آیا ہے:" علماء کی نا قدری کرنے والا شخص اخروی زندگی سے محروم رہے گا، حکمرانوں کی نا قدری کرنے والا شخص دنیوی زندگی سے محروم رہے گا اور اپنے بھائی کی نا قدری کرنے والا شخص اچھے اخلاق وکردار سے محروم رہے گا۔[5]

ملاقات میں آداب کاخیال رکھنا: علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں اور انبیاء کے ساتھ ملاقات کے آداب بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے بہت زیادہ تاکید کی ہے ۔کیونکہ یہ ایمان کاحصہ ہوتا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالی کے اس ارشاد میں ہے:

"اے ایمان والو ! پیغمبر کی آواز سےاپنی آوازیں اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو

---

[1]بخاری،کتاب العلم،باب فضل من علم و علم،رقم:79،مسلم،کتاب الفضائل،باب بیان مثل ما بعث بہ النبی من الھدی والعلم،رقم:6093

[2]فاطر9:35

[3]الانعام122:4

[4]الانفال24:8

[5]الذہبی، سیر أعلام النبلاء ۱۷:۲۵۱

ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔[1]

اسی آیت کو دیکھتے ہوئےبعض علماء نے فرمایا کہ: علماء ومشایخِ دین کا بھی یہی حکم ہے۔کیونکہ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔اور اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جس میں نبی کریم نے سیدنا ابوالدرداء کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے آگے چلتے ہوئے دیکھ کر تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا وآخرت میں تم سے بہترہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع وغروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر(رضی اللہ عنہ)سے بہتر ہو۔اس لیے علماء نے فرمایا کہ اپنے استاد اور مرشد کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئیے۔[2]

<u>دینی امور میں اُن کی رہ نمائی حاصل کرنا:</u>علماء کا عامۃ المسلمین پر یہ حق بنتا ہے کہ دینی مسائل میں اُ ن سے استفادہ کیا جائے تا کہ مسلمان گمراہی سے بچے اور سیدھی راہ پر چلے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:" فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ[3]": جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو کہ اگر تمہیں علم نہ ہو "اور اللہ کا ارشاد ہے:
"وہ جس کو چاہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی"[4]

اس آیت کریمہ میں علماء کے بارے میں قرآن کریم کایہ ارشاد ہے کہ علماء کو اللہ جل شانہ کی طرف سے بہت بڑا انعام دیا گیا ہے اس وجہ سے عام مسلمانوں کو ان سے مستفید ہونا چاہئیے اور اپنے تمام دینی امور میں اُن سے ہدایات لینی چاہئیے۔
طلباء کے بارے میں ارشاد ہے کہ:
"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے فرمایا جو شخص کسی مومن پر سے کوئی سختی دنیا کی دور کرے تو اللہ تعالی اُس پر سے آخرت کی سختیوں میں سے ایک سختی دور کرے گا اور جو شخص مفلس کو مہلت دیوے اللہ تعالی اُس پردنیا وآخرت میں آسانی کرے گا۔اور جوشخص دنیا میں کسی مسلمان کا عیب ڈھانکے گا تو اللہ تعالی دنیا وآخرت میں اس کا عیب ڈھانکے گا۔اور اللہ تعالی بندہ کی مدد میں رہے گا جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہے گا۔اور جو شخص علم حاصل کرنے کی راہ چلےاللہ تعالی اُس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا۔اور جولوگ اللہ کی کسی گھر میں اللہ کی کتاب پڑھنے اور پڑھانے کے لیے جمع ہو تو اُن پراللہ تعالی کی رحمت اتری گی اور رحمت اُن کو ڈھانپ لے گی اور فرشتے اُن کو گھیر لیں گے اور اللہ تعالی فرشتوں کے مجلس میں اُن لوگوں کا ذکر کرے گا۔اور جس کا عمل کوتاہی کرے تو اس کا خاندان کچھ کام نہ آئے گا"[5]

اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں میں آپ کے پاس کسی اور غرض سے نہیں آیا ہوں، اس پر ابوالدرداء نے کہا: میں نے نبی علیہ السلامکو فرماتے ہوئے سنا ہے" :جو شخص طلب علم کے لیے راستہ طے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اسے جنت کی راہ چلاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی بخشش کی دعا کرتے ہیں یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں دعائیں کرتی ہیں، اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے

---

[1] الحجرات49 :1،2،3
[2] محمد شفیع،مفتی،معارف القُرآن،ج8ص100،ادارۃ المعارف،کراچی،1422ھ
[3] النحل43:16
[4] البقرۃ269:2
[5] مسلم،کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ،باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر،رقم:7028

جیسے چودھویں رات کی تمام ستاروں پر، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور نبیوں نے اپنا وارث درہم و دینار کا نہیں بنایا بلکہ علم کا وارث بنایا تو جس نے علم حاصل کیا اس نے ایک وافر حصہ لیا"[1]،[2]

ان احادیث سے علم کی طلب میں نکلنے والوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔چونکہ اِن لوگوں کا تعلق علومِ الٰہیہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کامرتبہ دوسروں کے بنسبت بہت اونچا ہوتا ہے۔ایک مسلمان معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے کچھ حقوق ہیں جن کا پورا کرنا معاشرے کے افراد کے فرائض میں داخل ہیں۔مثلاََ

علماء کے لیے دُعا اوراستغفارکرنا،
علماء کی توقیر،احترام کرنا،
علماء سے تواضع کے ساتھ ملنا،
علماء کو سلام کرنا،
علماء کے اجازت لئے بغیربات شروع نہ کرنا،
علماء سے کوئی سوال پوچھنا ہو تو اس کے لیےمناسب وقت کا انتحام کرنا،
اُن کی مجالس میں شرکت کرنا،
وفات کے بعد اُن کی جنازوں میں شریک ہونا اور
اُن کے علوم کو لوگوں میں پھیلانا

طلباء کی سر پرستی وحوصلہ افزائی کرنا:

طلباء سے محبت کرنا:چونکہ وحی کے علوم حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں اس وجہ سے اُن سے محبت کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ایک صاحب [3]کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے پوچھا:

"میں نے امیر المومنین عمر بن عبد العزیز سے پوچھا کہ یہ جوکہا جاتا ہے کہ: اگر تم میں ایک عالم بننے کی صلاحیت ہو تو جہاں تک ممکن ایک عالم بننے کی کوشش کرو، اور اگر تم نہیں بن سکتے تو پھر ایک طالب علم بنو، اور اگر طالب علم بننے کی بھی صلاحیت نہیں ہے تو پھر ان سے (علماء ؤ طالب علم) سے محبت کرو، اگر تم ان سے محبت کے قابل بھی نہیں ہو تو پھر (کم از کم) ان سے نفرت مت کرو"۔عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا ":سبحان اللہ،اللہ تعالی نے اس (آخری) بندے کو بھی مہلت دی ہے[4]۔

ہمسائیوں کے سماجی حقوق:

ہمسائے کو عربی میں"الجَار"کہا جاتا ہے۔لغت میں"جار" اُس کو کہا جاتا ہے جو کسی کے قریب میں رہتا ہو جیسا کہ لسان العرب میں ہے: الجار،والجوار: المجاورۃ،والجار الذی یجاورک،وجاورالرجل مجاورۃ،وجوارا ،وجُوارا"جار"ہمسائے کو کہا جاتا ہے۔ وجِوار اورجُوار

---

[1]سنن ابوداؤد،کتاب العلم،باب الحث علی طالب العلم،رقم:3643

[2]یہ حدیث صحیح ہے،الالبانی،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص141

[3]یہ صاحب علامہ عون بن عبداللہ رحمہ اللہ تھے ۔ یعقوب بن سفیان،ابویوسف، الفارسي الفسوي، المعرفۃ و التاریخ،ج3،ص380،مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت،طبع ثانی، 1401 ھ۔

[4] یعقوب بن سفیان،ابویوسف، الفارسي الفسوي، المعرفۃ و التاریخ،ج3،ص380،مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت،الطبعۃ: الثانیۃ، 1401 ھ۔
ابن عبدالبر جامع البیان العلم ، ١٤٢.١-١٤٣

دونوں الفاظ مستعمل ہیں لیکن کسرے کے ساتھ زیادہ فصیح ہے ۔اصطلاح میں ہر اس شخص کو "جار"کہا جاتاہے جو کسی کے قریب رہتا ہو،بیٹھا ہویاجارہاہو۔دوست ہو یا دشمن،نیک ہو یابد،اچھا ہو یا بُراوغیرہ جیساکہ لسان العرب میں ہے"

"جار"سےمراد ہر وہ شخص ہے جو تیرے ہمسائیگی میں رہتا ہو چاہے مسلمان ہویاکافر ،نیک ہو یاگناہ گار ،دوست ہو یادشمن ،نفع دینے والا ہو یانقصان دینے والا ،اپنا ہویاپرایا اور ملکی ہو یا غیر ملکی۔[2]

لیکن ہمسائیگی صرف سکونت کی حد تک محدود نہیں بلکہ یہ بازار،دکان،زمین،سکول،کالج اوردوسرے چیزوں میں بھی آتی ہے۔

اسی طرح " ہم سفر"ساتھی بھی ہمسائے کی تعریف میں آتا ہے کیونکہ وہ بدن اور مکان دونوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ ساتھ رہنے کی وجہ سے بیوی کو " جارۃ "کہا جاتا ہے۔

سفر میں ساتھ بیھٹے ہوئے ساتھی کو بھی "ہمسایہ"کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے ساتھ بیھٹے ہوئے انسان کے بدن اور جگہ میں ہمسائیگی اختیار کرنے ولا ہوتا ہے۔اور ہر ایک کا دوسرے پے ہمسائیگی کا حق ہے۔یہی وجہ ہے کہ بیوی کو بھی" جارۃ "کہا جاتا ہے۔

ہمسائیوں کے حقوق کے بارے میں قرآن اور سنت نبویہ میں بہت تاکید آئی ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> " اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور والدین اوررشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسائیوں اور اجنبی ہمسائیوں اور پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا"[3]

ہمسائے کے حق کی اہمیت کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس اندازِ کلام سے ہوتا ہے کہ جس میں اللہ تعالی نے ہمسایہ کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی وحدانیت کے عقیدے کے ساتھ اکٹھا ذکر کیا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے:

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا :جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے"[4]

دوسری روایت میں ہے:

" جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسائے کے اکرام کرے"[5]

اور یہ الفاظ بھی آئے ہیں:" یعنی جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اپنے ہمسائے کے ساتھ احسان کرے"[6]

---

[1]لسان العرب،ج4،ص153
[2]نفس مصدر
[3]النساء36:4
[4]بخاری،کتاب الادب،باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلایوذ جارہ، رقم:6018
[5]بخاری،کتاب الادب،باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلایوذ جارہ،رقم:6019
[6]مسلم،کتاب الایمان،باب احث علی اکرام الجار،رقم:185

ہمسائے کو تکلیف دینا گناہ اورباعث عذاب ہے:اسلام کسی بھی صورت میں اس بات کا روادار نہیں کہ کوئی اپنے ہمسائے کو تنگ کرے اور اگر کوئی اس فعل کا مرتکب ہوا تووہ اللہ تعالی کی لعنت کا مستحق ہوا جیسا کہ روایت میں آتا ہےکہ:

" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اپنے پڑوسی کی شکایت کر رہا تھا، آپ نے فرمایا" :جاؤ صبر کرو"پھر وہ آپ کے پاس دوسری یا تیسری دفعہ آیا، تو آپ نے فرمایا" :جاؤ اپنا سامان نکال کر راستے میں ڈھیر کر دو"تو اس نے اپنا سامان نکال کر راستہ میں ڈال دیا، لوگ اس سے وجہ پوچھنے لگے اور وہ پڑوسی کے متعلق لوگوں کو بتانے لگا، لوگ)سن کر(اس پر لعنت کرنے اور اسے بد دعا دینے لگے کہ اللہ اس کے ساتھ ایسا کرے، ایسا کرے، اس پر اس کا پڑوسی آیا اور کہنے لگا: اب آپ)گھر میں(واپس آ جائیے آئندہ مجھ سے کوئی ایسی بات نہ دیکھیں گے جو آپ کو ناپسند ہو"[1]،[2]

اور بُری ہمسائیگی کو قیامت کی نشانیوں میں سے شمار کیا گیا ہے جیسا مسند بزار کی روایت ہے:،اللہ کی قسم قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ(لوگوں میں) برے ہمسائیگی نہ آئے"۔[3]

ہمسائیگی کے حقوق کی اہمیت:نبی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمسائیوں کے بارے میں اتنی تاکید آتی رہی جس کی وجہ سے آپ کے دل میں یہ بات آئی کہ شاید یہ لوگ میراث میں بھی حصہ دار ہوں گےجیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا "جبرائیل علیہ السلام مجھے اس طرح باربار پڑوسی کے حق میں وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال گزرا کہ شاید پڑوسی کو وراثت میں شریک نہ کر دیں"[4]

ہمسایوں کو تکلیف نہ دیناجنت کے داخل ہونے کا ذریعہ ہے:مسلمان جتنے بھی نیک اعمال کرتا ہے،اُ س کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ اللہ تعالی کی رضا حاصل کرکے جنت میں جانے کا مستحق بن سکتا ہے۔ لیکن جس نے اپنے ہمسائے کو بلاوجہ تکلیف دی وہ اس نعمت سے محروم ہو سکتا ہےجیسا کہ نبی علیہ السلام کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے

"سیدناابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے شر سے اُس کے ہمسائے محفوظ نہ ہوں"[5]

اور صحیح بخاری کی روایت ہے کہ:

"اللہ کی قسم کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا، اللہ کی قسم کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا، اللہ کی قسم کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس کے ہمسائے اُس کے شر سے محفوظ نہ ہو"[1]

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب الادب،باب فی حق الجوار،رقم:5155

[2]یہ حدیث حسن صحیح ہے،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج11،ص153

[3]احمد بن عمرو،البزار،مسند البزار،ج6،ص410،مکتبۃ العلوم والحکم،مدینہ منورہ،2009م

[4]بخاری،کتاب الادب،باب الوصاۃ بالجار،رقم:6014،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ،رقم:6854

[5]مسلم،کتاب الایمان،باب بیان تحریم ایذاء الجار،رقم:181

ہمسائے کی چادر اور چاردیواری کا تحفظ کرنا: اسلام نے ہر کسی پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کی آبرو کی حفاظت کرے۔کیونکہ معاشرہ تبھی پُرامن بن سکتا ہے جب اُس میں ہر کسی کی ناموس وعزت محفوظ ہو۔تمام افراد پورے اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتے ہوں،لیکن اگر اُسے اپنے ہمسائے سے اپنی عزت و ناموس کے حوالے سے کوئی خطرہ ہو تو وہ زیادہ دیر تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتا جس کی وجہ سے اس کے تمام امورِزندگی متاثر ہو سکتے ہیں۔اس وجہ سے سنت نبویہ میں ہمسائے کی عزت پر حملہ آور ہونے کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا جیسا کہ ارشاد ہے:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صاحب یعنی خود آپ نے کہا :اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا یہ کہ تم اللہ کا کسی کو شریک ٹھہراؤ جبکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ پوچھا: پھر کون سا؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر یہ کہ تم اپنے لڑکے کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائے گا۔ پوچھا: پھر کون سا؟ فرمایا پھر یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل کی"اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ کسی ایسے انسان کی ناحق جان لیتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا[2]۔۔آخر آیت تک"[3]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے:

"نبی علیہ السلام نے صحابہ سے پوچھا:آپ لوگ زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ صحابہ نے جواب دیا ۔یہ تو حرام ہے اللہ اور اُس کے رسول نے اِسے حرام قرار دیا ہے پس قیامت تک یہ حرام ہے۔آپ نے فرمایا:آدمی کا دس عورتوں سے زنا کرنا اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا بڑا گناہ ہمسائے کے بیوی سے زنا کرنا ہے۔(پھر آپ نے پوچھا)چوری کے بارے میں آپ لوگ کیا کہتے ہو؟صحابہ نے جواب دیا یہ تو حرام ہے اللہ اور اُس کے رسول نے اِسے حرام قرار دیا ہے پس قیامت تک یہ حرام ہے۔آپ نے فرمایا:آدمی کا دس گھروں سے چوری کرنا اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا بڑا گناہ ہمسائے کے گھر سے چوری کرنا ہے"[4]،[5]

ہمسائے کو کھلانے پلانے کا حق: مسلمان جو خود کھاتا ہے اُس کو چاہئیے کہ وہ اپنے ہمسائےکا بھی خیال رکھے۔اس بارے نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے:

"سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے فرمایا۔اے ابوذر! جب تو گوشت پکاوے تو شوربا بہت رکھ اور اپنے ہمسائیوں کا خیال رکھ۔جب تو گوشت پکاوے تو شوربا بہت رکھ اور اپنے ہمسایہ کے گھر والوں کو دیکھ۔اُن کو اُس میں سے بھیج"[6]

امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا:اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والی سے اچھا سلوک کرنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین ہمسایہ وہ ہے جو اپنے ہمسائے کے ساتھ اچھا ہو"[7]

---

[1] بخاری،کتاب الادب،باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ،رقم:6016

[2] الفرقان25:68

[3] بخاری،کتاب الدیات،باب قول اللہ ومن یقتل مؤمنا متعمدافجزاؤہ جھنم،رقم:6861

[4] مسند البزار،ج6،ص50

[5] قال الالبانی:اسناد ھذاالحدیث جید،ورجالہ کلھم ثقات،سلسلۃالاحادیث الصحیحۃ،ج1،ص64

[6] مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ،رقم:6855،6856

[7] محمدبن اسماعیل،البخاری،الادب المفرد،باب خیرالجیران،ج1،ص53،دارالبشائر الاسلامیۃ،بیروت،1409ھ

ہمسائیگی میں قرب وبعد: سنت نبویہ میں اس حوالے سے بھی احکام موجود ہیں۔کہ کس ہمسائے کا حق پہلے ہے اور کس کا دوسرا؟ سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ میں نے نبی علیہ السلام سے اس بارے میں پوچھا:

"ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں، میں ان دونوں میں سے پہلے کس کے ساتھ احسان کروں؟ آپ نے فرمایا" :ان دونوں میں سے جس کا دروازہ قریب ہو اس کے ساتھ"[1]

شفعہ کا حق: ہمسائے کے حقوق میں سے ایک حق "شفعہ" بھی ہے کہ کسی گھر،زمین یادکان وغیرہ فروخت کرتے وقت ہمسائے کا یہ حق ہوتا ہے کہ اگر وہ لینا چاہے تو کوئی دوسرا اُسے نہیں لے سکتا۔تاآنکہ وہ خود اجازت نہ دے ۔ بخاری کی روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ پڑوسی اپنے پڑوس کا زیادہ حقدار ہے"[2]

دوسری حدیث میں اس سے زیادہ وضاحت ہے کہ:

"جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :جس کے پاس کھجور کے درخت ہوں یا زمین ہو تو وہ اسے اس وقت تک نہ بیچے، جب تک کہ اسے اپنے شریک پر پیش نہ کر دے"[3]،[4]

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے:

" پڑوسی اپنے پڑوسی کے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے، اس کا انتظار کیا جائے گا اگر وہ موجود نہ ہو جب دونوں کا راستہ ایک ہو"[5]،[6]

دوسری روایت ہے:

" گھر بیچنے کے وقت گھر خریدنا، سب سے پہلے ہمسائے کا حق بنتا ہے"[7]،[8]

ہمسایوں کے حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر وہ اپنی کسی ضرورت کے لیے تمہاری دیواراستعمال کرنا چاہے تو اُس کو اِس کی اجازت دینی چاہئیے جیسا کہ صحیحین کے روایت میں ہے کہ:

> "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، کوئی شخص اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔ پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے، یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس سے منہ پھیرنے والا پاتا ہوں۔ قسم اللہ! اس کھونٹی کو تمہارے کندھوں کے درمیان گاڑ دوں گا"[9]

دنیاوی امور میں ہمسائے کے ساتھ تعاون کا حق: انسانی زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ۔بیماری،کمزوری،ضرورت مندی،شادی غمی،فوتگی اور اس جیسے

---

[1] بخاری،کتاب الشفعۃ،باب ای الجوار اقرب،رقم:2259

[2] نفس مصدر،باب عرض الشفعۃ علی صاحبہا قبل البیع،رقم:2258

[3] محمد بن يزيد،القزويني،ابن ماجہ،سنن ابن ماجہ،کتاب الشفعۃ،باب من باع رباعا فلیؤذن شریکہ،رقم:2492، مكتبة أبي المعاطي،بدون تاريخ

[4] البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے،صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ،ج5،ص492

[5] سنن ابوداؤد،کتاب الشفعۃ،باب الشفعۃ بالجوار،رقم:3520

[6] قال الالبانی: صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص18

[7] سنن الترمذی،کتاب الاحکام،باب الشفعۃ،رقم:1368

[8] قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج3،ص368

[9] بخاری ،کتاب المظالم،باب لایمنع جار جارہ ان یغرزخشبہ فی جدارہ،رقم:2463،مسلم،کتاب المساقاۃ،باب غرزالخشب فی جدارالجار،رقم:4215

بہت سے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسی حالات میں ہمسائے کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔تاکہ اُس کے ساتھ ہمدردی بھی ہو اور تکلیف ،مشقت میں کمی بھی۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اپنے اہل ومال کے ڈر کی وجہ سے اُس سے اپنا دروازہ بند رکھتا ہے۔ اور وہ شخص بھی مومن نہیں ہو سکتا جس کے شر سے اُس کے ہمسائے محفوظ نہ ہوں۔کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمسائے کے کیا حقوق ہیں؟یہ کہ اگر وہ تم سے مدد مانگے تو اُس کی مددکرو،اگر قرض مانگے تو اُسے قرض دو،اگر غریب ہو جائے تو اُس کے ساتھ تعاون کرو،اگر بیمار ہو جائے تو بیمار پرسی کرو،اگر فوت ہو جائے تو اُس کے جنازے میں شریک ہو جاؤ،اگر اُسے کو ئی انعام مل جائے تو اُسے مبارکباد دو،اگر اُسے کوئی مصیبت پہنچ جائے تو اُس کی تعزیت کرو،اُس کی اجازت کے بغیر اپنی آبادی اتنی اونچی نہ کرو کہ ہو ارُک جائے،اگر کچھ پھل وغیرہ لاؤتو اُسے بھی کچھ ہدیے کے طور پر بھیج دو ،اگر نہیں بھیج سکتے تو چپکے سے لاؤ(تاکہ وہ یا اُس کے بچے نہ دیکھے)تمہارے اولاد میں سے کوئی اُس پھل کو باہر نہ لائے تا کہ اُس کے بچے پریشان نہ ہو،پس نبی علیہ السلام ہمسائے کے بارے میں اتنی تاکید فرماتے کہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ شاید ہمسایہ میراث میں بھی شریک ہوگا"[1]

اسی روایت میں آگے ہمسائیوں کی مختلف اقسام بیان کرکے اُن کے حقوق سے متعلق مزید ارشاد ہے۔کہ ہمسایہ مسلمان ہو،مسلمان بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو ،ہمسایہ غیر مسلم ہو،سب کے لیے الگ الگ ہدایات موجود ہیں:

"پھر نبی علیہ السلام نے فرمایا:ہمسائے کے تین اقسام ہیں۔ایک وہ جس کے تین حقوق ہیں دوسرا وہ جس کے دو حقوق ہیں اور تیسرا وہ جس کا ایک حق ہے۔جس کے تین حقوق ہیں یہ وہ ہمسایہ ہے جومسلمان رشتہ دار ہمسایہ ہو اُس کے لیےہمسائیگی،رشتہ داری اور مسلمان ہونے کے حقوق ہیں۔اوروہ ہمسایہ جس کے دو حقوق ہیں وہ مسلمان(غیر رشتہ دار)ہمسایہ ہے جس کے لیے ہمسائیگی اور مسلمان ہونے کے حقوق ہیں۔اور وہ ہمسایہ جس کا صرف ایک حق ہے وہ غیر مسلم ہمسایہ ہے جس کے لیےصرف حقِ ہمسائیگی ہے۔صحابہ نے دریافت کیا،اے اللہ کے رسول! کیا ہم غیر مسلموں کو قربانی کا گوشت دے سکتے ہیں ؟آپ نے فرمایا غیر مسلموں کو قربانی کا گوشت نہ دیا کرو"[2]

ہمسائے کے کھانے پینے کے متعلق ارشاد ہو اکہ:" نبی علیہ السلام نے فرمایا وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جو خود تو پیٹ بھر کر رہے اور اُس کا ہمسایہ بھوکا رہے"[3]،[4]

ہمسائیوں کو تکلیف دینا جہنم کے داخل ہونےکا سبب ہے: ایک دفعہ نبی علیہ السلامکی مجلس میں ایک ایسی عورت کا ذکر ہوا جو نماز روزے کی پابند تھی لیکن اپنے ہمسائیوں کو تکلیف دیتی رہتی تھی اُس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے :

" رسول اللہ کو ایک عورت کے بارے میں بتایا گیا کہ فلاں عورت دن کوروزہ رکھتی ہے اور رات کو تہجد پڑھتی ہے لیکن اپنے ہمسائیوں کو تکلیف دیتی ہے آپ نے فرمایا اُس میں کوئی خیر نہیں ہے(کیونکہ) وہ دوزخی ہے۔پھر ایک دوسری عورت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ

---

[1] سلیمان بن احمد،الطبرانی،مسند الشامیین،ج3،ص339،رقم:2430،مؤسسة الرسالة،بیروت،1405ھ
[2] مسند الشامیین،ج3،ص339،رقم:2430
[3] الادب المفرد،ج1،ص52،رقم:112
[4] قال الالبانی،حدیث صحیح،السلسلة الاحادیث الصحیحة،ج1،ص148،رقم:149

صرف فرض نمازوں کی پابند ہے لیکن اپنے ہمسائیوں کو تکلیف نہیں دیتی آپ □ نے فرمایا وہ جنتی عورت ہے"[1]،[2]

اسی طرح ارشاد ہے:"اللہ تعالیٰ اُس شخص سے محبت رکھتا ہے جس کا ایک برا ہمسایہ ہو جو اُسے تکلیف دیتا ہو لیکن یہ شخص اُس تکلیف پر صبر کرتا ہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُسے زندگی(میں نیک بناتاہے)یا موت کے ذریعے نجات دیتا ہے"[3]

<u>اچھی ہمسائیگی اللہ تعالی کی طرف سے ایک نعمت ہے:</u>اللہ کے رسول □ نے فرمایا :"آدمی کی نیک بختی میں سے ایک یہ ہے کہ اُس کا ہمسایہنیکہو"[4]،[5]

ہمسائے کے نفع نقصان کا اتنا خیال رکھنا چاہئیے جتنا آدمی اپنے نفع نقصان کا خیال رکھتا ہے کیونکہ نبی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا :اللہ کی قسم کوئی بھی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے ہمسائے/بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے"[6]

<u>کسی بھی ہمسایہ کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئیے:</u>اسلام میں کسی بھی صورت میں انسان کی تحقیر کی اجازت نہیں ہے ۔مسلمان اور وہ بھی ہمسایہ،اُس کی تو اور زیادہ خیال رکھ کر اشارۃً بھی تحقیر نہیں کرنی چاہئیےلیکن داد رکھنا چاہئیے کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق مکلف ہو تا ہے ۔اس وجہ سے اگر وہ اپنے ہمسائے کو زیادہ کچھ نہیں دے سکتا ،تو کوئی حرج نہیں ہے جتنا اُس کی طاقت میں ہو ،اُتنا ہی دیا جائیں۔ اس سلسلے میں نبی علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ:

"ابو ہریرہ ضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامفرمایا کرتے تھے ”اے مسلمان عورتو! تم میں سے کوئی عورت اپنی کسی پڑوسن کے لیے کسی بھی چیز کو(ہدیہ میں)دینے کے لیے حقیر نہ سمجھے خواہ بکری کا پایہ ہی کیوں نہ ہو"[7]

<u>گناہ گارہمسایے کی بھی پردہ پوشی کرنی چاہئیے:</u>اگر کوئی ہمسایہ کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوجائے اور اُس کا وہ گناہ علانیہ نہ ہو تو پھراس سے اعراض ہی بہتر ہے تاہم اس کی خیر خواہی کی نیت سے تنہائی میں اُس کو سمجھانا چاہئیے۔اور اگراُس کا گناہ علانیہ ہو اور نصیحت بھی اُس پر اثر نہیں کرتی تو پھر اُس سے سوشل بائیکاٹ کرکے بالکل تعلق توڑنا ہی بہتر ہے۔لہذااگر اکثر اوقات میں تارکِ نماز ہو اور باربار نصیحت کرنے پروہ نمازکی طرف نہیں آتا تو اُس کو راہ راست پر لانے کی خاطر عارضی طور پر اس سے قطع تعلق کی گنجائش ہے ۔

<u>کچھ ہمسایہ سے تعلق توڑنے کی اجازت:</u>کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر نہ نصیحت اثر کرتی ہے اور نہ سوشل بائیکاٹ۔ایسی صورت میں اسلام ہمیں درجہ ذیل صورتیں اختیار کرنے کی اجازت دیتاہے۔

---

[1]مسند البزار،ج17،ص129

[2]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے،سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ،ج1،ص189

[3]سلیمان بن داؤد،الطیالسی،مسند ابو داؤد الطیالسی،ج1،ص375۔رقم:470،ھجر للطباعۃ والنشر،1419ھ

[4]مسند احمد،ج3،ص407،رقم:15446

[5]یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے،الالبانی،صحیح الترغیب والتربیب،ج2،ص348

[6]مسلم،کتاب الایمان،باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ المسلم ما یحب لنفسہ،رقم:180

[7]بخاری،کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا.باب الْحَضُّ عَلَى الْهِبَةِ رقم:2566

1۔کسی کا ہمسایہ دیوث (من لا یغار علی اهله)ہو یا بے غیرت ہو یا اس کی بیوی بد چلن ہو۔تو ایسے ہمسائے سے دور رہناہی بہتر ہے۔اپنے گھر کی عورتیں اُس کی عورتوں سے دور رکھیں ۔اپنے گھر میں اسے کبھی بھی داخل نہ ہونے دیں۔

2۔اسی طرح کسی کا ہمسایہ ایسا ہو کہ وہ مسلمانوں کو اور خصوصا صحابہ کو (نعوذباللہ)کافر کہتا ہویا گالی دیتا ہویا بد عتی ہو۔تو جہاں تک ممکن ہو اُس کی اصلاح کی جائے اور وہ ہدایت پر نہیں آتا۔تو اس سے بھی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔

3۔اگر ہمسایہ کوئی غیر مسلم (یہودی یا عیسائی)ہو۔تو عام معاشرت میں اس کے ساتھ رواج کے مطابق معاملہ رکھنا چاہئیے۔لیکن دلی تعلق کبھی بھی غیر مسلم سے جائز نہیں ۔البتہ کبھی کبھار اگر وہ کوئی ہدیہ دے یا تم اُسے اپنی عید وغیرہ کے موقع پر کوئی کھانا دو تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کی عادت بنانا بہر حال ٹھیک نہیں کیونکہ یہ نص قُرآنی کے خلاف ہے اللہ تعالی فرماتے ہیں:

> " جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو نہیں دیکھو گے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہو۔ خواہ وہ ان کے والد، بیٹے، بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان تحریر کردیا ہے اور غیبی فیض سے ان کی مدد کی ہے۔ اور وہ ان کو بہشتوں میں جن نیچے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش۔ یہی گروہ اللہ کا لشکر ہے۔ سن رکھو کہ اللہ ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے"[1]

مطلب یہ ہے کہ اُن کی قربت میں اس بات کا خدشہ ضرور ہے کہ کہیں یہ قربت خودپر اثر انداز نہ ہو ۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر وہ تمہارے رشتے دار ہو تو پھر اس کا حکم بدل جاتا ہے۔پس اگر والدین ہو،بہن بھائی ہو یا کوئی دوسرے رشتے دار،تو اُن کے ساتھ حسن سلوک کاحکم اپنی جگہ موجود ہے۔یہاں دو قسم کے حقوق جمع ہوجاتے ہیں ایک رشتے داری کا حق اور دوسرا ہمسائیگی کا حق۔دونوں کا لحاظ رکھنا چاہئیے۔غیرمسلم پر سلام میں پہل نہیں کرنا چاہئیے اور اگر وہ سلام کہے تو تم بھی کہو"وعلیکم"۔لیکن اُن کے ساتھ محبت میں مبالغہ نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> " تو اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گاایسے لوگوں کو، جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو نرمی کرینمومنوں کے حق میں اور سختی سے پیش آئینکافروں سے "[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مومن اپنے ہم مذہب کے ساتھ تواضع کرنے والااوراپنے آپ کو کمزور سمجھنے والا ہوگا جبکہ کافر کے لیے سخت ہو گا ۔غیر مسلم کی اتنی زیادہ تعظیم نہیں کرے گا جتنی کہ ایک مسلمان کی کرتاہے۔کیونکہ اُس کا عزت کرنا اُس کے مذہب کو تقویت دینے کا باعث بنتا ہے جو کہ ازروئے شریعت حرام ہے۔اسی طرح اُن کے ساتھ دلی محبت رکھنی کی بھی اجازت نہیں ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اُسے بغیر کسی وجہ کے تکلیف پہنچانا گناہ اور حرا م ہے۔کیونکہ اسلام کافر سے نہیں اُس کے کفرسے نفرت کرتا ہے۔

---

[1] المجادلہ22:58

[2] المائدہ55:5

اولوالامر (حاکموں) کے حقوق: اولوالامر سے مرادوہ لوگ ہیں جو حکومت چلانے والے ہوتے ہیں،عوام کی ملّی اور دینی ضروریات اور تقاضے پورا کرنے والے ہوتے ہیں ۔تاج العروس کے مطابق اس سے مراد" أُولُو *الأَمْرِ : الرُّؤَسَاءُ والعُلَماءُ "[1]

انگریزی میں اولوالامر کی تعریف یوں کی گئی ہے: أُولُو الأَمْرِ"

وہ مسلمان جو نگران ہو،یا جن کے پاس اختیار ہو اور یا جو رہنما ہو،مسلمانوں کو اُن کے احکامات بجا لانے کا حکم دیا جاتا ہے جب تک وہ اللہ تعالی کے احکامات اور نبی علیہ السلام کی تعلیمات کے مخالف نہ ہو"۔[2]

اولوالامر کے بارے میں سنت نبوی میں احکام اور ہدایات موجود ہیں۔قُرآن کریم میں ارشاد ہے:

> " اے مومنو ! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سےحکمران ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے"[3]

صحیح بخاری شریف میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے :نبی علیہ السلام نے ایک چھوٹے سے لشکر میں عبداللہ بن حذافہ بن قیس کو بھیجا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں نازل ہوئی[4]

اور امام طبری[5]رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ:

" سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا جس کا امیر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بنایا اس لشکر میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے یہ لشکر جس قوم کی طرف جانا چاہتا تھا چلا، رات کے وقت اس کی بستی کے پاس پہنچ کر پڑاؤ کیا ان لوگوں کو اپنے جاسوسوں سے پتہ چل گیا اور چھپ چھپ کر سب راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف ایک شخص رہ گیا اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا انہوں نے اس کا سب اسباب جلا دیا یہ شخص رات کے اندھیرے میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آیا اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا کہ اے ابوالیقظان میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور گواہی دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں میری ساری قوم تمہارا آنا سن کر بھاگ گئی ہے صرف میں باقی رہ گیا ہوں تو کیا کل میرا یہ اسلام مجھے نفع دے گا؟ اگر نفع نہ دے تو میں بھی بھاگ جاؤں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا یقیناً یہ اسلام تمہیں نفع دے گا تم نہ بھاگو بلکہ ٹھہرے رہو۔ صبح کے وقت جب سیدنا خالد رضی اللہ

---

[1] تاج العروس،ج10،ص71

[2] انور محمود زناتی،معجم المصطلاحات الاسلامیہ،ج1،ص139

[3] النساء4:59

[4] بخاری،کتاب التفسیر،باب واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولوا الامر منکم،رقم:4584

[5] ابو جعفر محمد بن جریر بن یزیدطبریؒ ہیں۔ طبریستان میں 224ھ/838ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے بڑے امام،فقیہ، مورخ اور مفسر قرآن تھے۔ تصانیف میں التاریخ،اختلاف الفقہاء اور تفسیرطبری مشہور ہیں۔ 310ھ/ 922ء میں وفات پائی۔ (الزرکلی، الاعلام، ج6،ص69۔الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج2،ص322)۔

عنہ نے لشکر کشی کی تو سوائے اس شخص کے وہاں کسی کو نہ پایا اسے اس کے مال سمیت گرفتار کر لیا گیا جب سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا اسے چھوڑ دیجئیے یہ اسلام لا چکا ہے اور میری پناہ میں ہے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم کون ہو جو کسی کو پناہ دے سکو؟ اس پر دونوں بزرگوں میں کچھ تیز کلامی ہو گئی اور قصہ بڑھا یہاں تک کہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی پناہ کو جائز قرار دیا اور فرمایا آئندہ امیر کی طرف سے پناہ نہ دینا پھر دونوں میں کچھ تیز کلامی ہونے لگی اس پر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے حضور سے کہا اس ناک کٹے غلام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کہتے؟ دیکھئے تو یہ مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا'' :خالد، عمار کو برا نہ کہو، عمار کو گالیاں دینے والے کو اللہ گالیاں دے گا، عمار سے دشمنی کرنے والے سے اللہ دشمنی رکھے گا، عمار پر جو لعنت بھیجے گا اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو گی''۔ اب تو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو لینے کے دینے پڑھ گئے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ غصہ میں چل دیئے، آپ دوڑ کر ان کے پاس گئے، دامن تھام لیا معذرت کی اور اپنی تقصیر معاف کرائی تب تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ راضی نہ ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی"[1]

اولوالامر کی اطاعت: ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جائز کاموں میں اولوالامر کی اطاعت کرے اور ناجائز کاموں میں اُن کی اطاعت بالکل نہ کرے ۔جیسا کہ صحیحن کی روایت میں آتا ہے کہ:

"نبی علیہ السلام نے ایک لشکر بھیجا جس کی سرداری ایک انصاری رضی اللہ عنہ کو دی ایک مرتبہ وہ لوگوں پر سخت غصہ ہو گئے اور فرمانے لگے کیا تمہیں نبی علیہ السلام نے میری فرمانبرداری کا حکم نہیں دیا؟ سب نے کہا ہاں بیشک دیا ہے، فرمانے لگے اچھا لکڑیاں جمع کرو پھر آگ منگوا کر لکڑیاں جلائیں پھر حکم دیا کہ تم اس آگ میں کود پڑو۔ ایک نوجوان نے کہا لوگو سنو آگ سے بچنے کے لیے ہی تو ہم نے دامن رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لی ہے تم جلدی نہ کرو جب تک کہ نبی علیہ السلام سے ملاقات نہ ہو جائے پھر اگر آپ بھی یہی فرمائیں تو بے جھجھک اس آگ میں کود پڑھنا چنانچہ یہ لوگ واپس نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا آپ نے فرمایا'' :اگر تم اس آگ میں کود پڑھتے تو ہمیشہ آگ ہی میں جلتے رہتے۔ سنو فرمانبرداری صرف معروف میں ہے"[2]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ:

" مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے جی چاہے یا طبیعت رو کے لیکن اس وقت تک کہ (اللہ تعالیٰ اور رسول کی)نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے "[3]

اور ارشاد ہے کہ:

"سیدنا عبادہ بن صامت[1] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم سے نبی علیہ السلام نے بیعت لی کہ کام کے اہل سے اس کام کو نہ چھینیں۔ لیکن جب تم ان کا کھلا کفر دیکھو جس کے بارے میں

---

[1]طبری،ج7،ص178،رقم:9929

[2]بخاری،کتاب الجہاد والسیر،باب سریۃ عبداللہ بن حذافہ السہمی ،رقم:4340

[3]بخاری،کتاب الجہاد والسیر،باب السمع والطاعۃ للامام،رقم:2955

تمہارے پاس کوئی واضح الہی دلیل بھی ہو"

امیر کی اطاعت بہر حال لازم اور ضروری ہے۔چاہے وہ عمر میں چھوٹا ہو یا بڑا،نسب کے اعتبار سے اعلی ہو یا کم۔آزاد ہو یا غلام ۔جیسا کہ نبی علیہ السلام کے اس فرمان مبارک میں ہے:

" سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنایا گیا ہو چاہے کہ اس کا سر کشمکش (جیسا)ہے"[3]

اس سلسلے میں یہ حکم بھی ہے کہ کسی بھی صورت میں امیر سے بغاوت کرکے الگ نہ ہوجاؤ۔اگر چہ تمہیں اُس کا کوئی فعل اچھا نہ لگے جیسا کہ ارشاد ہے:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا ”جس نے اپنے امیر میں کوئی برا کام دیکھا تو اسے صبر کرنا چاہئے کیونکہ کوئی اگر جماعت سے ایک بالشت بھی جدا ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا""[4]

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ :

"نبی علیہ السلام نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں فرمایا” :چاہے تم پر غلام عامل بنایا جائے جو تمہیں کتاب اللہ کے مطابق تمہارا ساتھ چاہے تو تم اس کی سنو اور مانو"[5]

ایک روایت میں"وَقَالَ عَبْدًا حَبَشِيًّا مُجَدَّعًا[6]" غلام حبشی اعضاء کٹا کے الفاظ ہیں ۔

تفسیر طبری میں اس آیت کے ذیل میں ہے کہ:

"ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنے تفسیر"طبری"میں ذکر کیا ہے :میرے بعد والے تم سے ملیں گے نیکوں سے نیک اور بدوں سے بد تم ہر ایک اس امر میں جو مطابق ہو ان کی سنو اور مانو کہ میرے بعد نیک سے نیک اور بد سے بد تم کو ملیں گے تم پر ایک میں نے جو حق پر ہو اس کا سننا اور ماننا تم سے اور ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہو اگر وہ نیکی کریں گے۔ تو ان کے لیے تفع ہے اور تمہارے لیے بھی اور اگر وہ بدی کریں گے تو تمہارے لیے اچھائی ہے اور ان پر گناہوں کا بوجھ ہے"[7]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو امیر کی اطاعت سے نہیں نکلنا چاہئیے۔کیونکہ اس سے بہت سے مفسدات کا راستہ کھلتا ہے۔

امیر کی وفات/قانونی معزولی کے بعد دوسرے امیر کی اطاعت:اگر ایک امیر وفات پا جائے یا کسی کبیرہ گناہ وغیرہ کی وجہ سے معزول کیا جائے تو اُسی صورت میں بھی بغیر امیر/حاکم کے نہیں رہنا چاہئیے بلکہ مشورے کے ذریعے دوسرے امیر کا انتخاب کر کے اُس کی اطاعت کرنی چاہئیے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلام نے فرمایا” :بنو اسرائیل میں مسلسل لگاتار رسول آیا کرتے تھے ایک کے بعد ایک اور میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر خلفاء بکثرت ہوں گے“، لوگوں نے پوچھا: پھر

---

[1]عبادہ بن صامت بن قیس بن اصرم،انصاری رضی اللہ عنہ۔لیلۃ العقبہ کو آپ رضی اللہ عنہ بھی نقباء میں سے تھے۔بدری صحابی ہے۔بیت المقدس میں رہتے تھے۔تمام غزوات میں شریک رہے۔سڈول بدن والے حسین وجمیل اور جری صحابی تھے۔34ھ کو72 سال کے عمر میں رملہ میں وفات پائے۔سیر اعلام النبلاء،ج5،ص5-10

[2]بخاری،کتاب الفتن،باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ستروںبعدی امورا تنکرونہا ،رقم:7056

[3]بخاری،کتاب صلاۃ الجماعۃ والامامۃ،باب إِمَامَةِ الْعَبْدِ وَالْمَوْلَىرقم:693

[4]بخاری،کتاب الاحکام،باب السمع والطاعۃ للامام ما لم تکن معصیۃ۔رقم:7143

[5]مسلم،کتاب الامارۃ،باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ۔رقم:4864

[6]مسلم،کتاب الامارۃ،باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ ،رقم:4866

[7]محمد بن جریر،الطبری،جامع البیان فی تاویل القرآن،ج8،ص502رقم:9876،مؤسسۃ الرسالۃ،1420ھ

اے اللہ کے رسول ! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا : پہلے کی بیعت پوری کرو پھر اس کے بعد آنے والے کی ان کے حق انہیں دے دو اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں سوال کرنے والا ہے"[1]

مسلم شریف کی ایک طویل روایت میں ہے ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

" میں بیت اللہ شریف میں گیا دیکھا تو سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما ہیں اور لوگوں کا ایک مجمع جمع ہے میں بھی اس مجلس میں ایک طرف ہوکر بیٹھ گیا اس وقت سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی فرمایا ایک سفر میں ہم نبی علیہ السلام کے ساتھ تھے ایک منزل میں اترے کوئی اپنا خیمہ ٹھیک کرنے لگا کوئی اپنے نیز سنبھالنے لگا کوئی کسی اور کام میں مشغول ہو گیا، اچانک ہم نے سنا کہ منادی والا ندا دے رہا ہے۔ ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور سنا کہ نبی علیہ السلام فرما رہے ہیں” :ہر نبی پر اللہ کی طرف سے فرض ہوتا ہے کہ اپنی امت کو تمام نیکیاں جو وہ جانتا ہے سکھادے اور تمام برائیوں سے جو اس کی نگاہ میں ہیں انہیں آگاہ کر دے۔ سنو میری امت کی عافیت کا زمانہ اول کا زمانہ ہے آخر زمانے میں بڑی بڑی بلائیں آئیں گی اور ایسے ایسے امور نازل ہوں گے جنہیں مسلمان ناپسند کریں گے اور ایک پر ایک فتنہ برپا ہو گا ایک ایسا وقت آئے گا کہ مومن سمجھ لے گا اسی میں میری ہلاکت ہے پھر وہ ہٹے گا۔ تو دوسرا اس سے بھی بڑا آئے گا جس میں اسے اپنی ہلاکت کا کامل یقین ہو گا بس یونہی لگاتار فتنے اور زبردست آزمائشیں اور کامل تکلیفیں آتی رہیں گے پس جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ جہنم سے بچ جانے اور جنت کا مستحق ہو اسے چاہیئے کہ مرتے دم تک اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھے اور لوگوں سے وہ برتاؤ کرے جو خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ سنو جس نے امام سے بیعت کر لی اس نے اپنا ہاتھ اس کے قبضہ میں اور دل کی تمنائیں اسے دے دیں۔ اور اپنے دل کا پھل دے دیا اب اسے چاہیئے کہ اس کی اطاعت کرے اگر کوئی دوسرا اس سے خلافت چھیننا چاہے تو اس کی گردن اڑا دو“۔ عبدالرحمٰن رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں یہ سن کر قریب گیا اور کہا آپ کو میں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کیا خود آپ نے اسے نبی علیہ السلام کی زبانی سنا ہے؟ تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کان اور دل کی طرف بڑھا کر فرمایا میں نے نبی علیہ السلام سے اپنے ان دو کانوں سے سنا اور میں نے اسے اپنے اس دل میں محفوظ رکھا ہے۔ مگر آپ کے چچا زاد بھائی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہمیں اپنے مال باطل سے کھانے اور آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرنے کا حکم دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کاموں سے ممانعت فرمائی ہے، ارشاد ہے:

مومنو ! ناحق ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ ہاں اگرباہمی رضا سے تجارت کا لین دین ہو اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے[2]۔ اسے سن کر عبداللہ ذرا سی دیر خاموش رہے پھر فرمایا اللہ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرو اور اگر اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو اسے نہ مانو"[3]

اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اولوالامر میں علماء بھی داخل ہیں اس سلسلے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ فرماتے ہیں:" اولو الامر سے دین میں سمجھ بوجھ

---

[1] بخاری،کتاب احادیث الانبیاء،باب ماذُکر عن بنی اسرائیل، رقم:3455

[2] النساء4:29

[3] مسلم،کتاب الامارۃ،باب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاول فالاول،رقم:4882

رکھنے والے اور دین دار یعنی علماء مراد ہیں۔ظاہر بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقیقی علم اللہ کو ہے کہ یہ لفظ عام ہیں امراء علماء دونوں اس سے مراد ہیں جیسے کہ پہلے گزرا قرآن فرماتا ہے:

"یعنی "ان کے علماء نے انہیں جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہ روکا؟"[1]اور جگہ ہے »فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ[2]": جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو کہ اگر تمہیں علم نہ ہو۔[3] "

جمعہ وجماعت پڑھانا:اسلام حاکموں کو صرف حکومت چلانے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس کے علاوہ بھی اُن کے حقوق ہیں جیسے جمعہ پڑھانا،جماعت کرانا وغیرہ۔اس سلسلے میں نبی علیہ السلام اور خلفائے راشدین کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے کہ وہ ان امور کا اہتمام کرتے تھے ۔حسن بصری [4]رحمہ اللہ فرماتے ہیں:"حسن بصر ی رحمہ اللہ حاکموں کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے پانچ کاموں کے ذمےدار ہوتے ہیں۔جمعہ پڑھانا،امامت کرنا،عیدین پڑھانا،ملکی سرحدات کی تحفظ کرنا اورحدوداللہ قائم کرنا۔اللہ کی قسم اِن کے بغیر دین برابر(قائم)نہیں رہ سکتا،اگر چہ یہ لوگ ظلم وزیادتی کریں۔اللہ کی قسم اِن کی فساد کے مقابلے میں ان کی وجہ سے قائم ہونی والی اصلاح زیادہ ہے۔باوجود اس کے کہ اِن کی اطاعت کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے ہیں۔اور اِن سے علٰحیدگی کفر ہے"۔[5]

اجتماعی امور میں حاکموں کے ساتھ تعاون کرنا:اسلام ویسے بھی ہر مسلمان کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ تعاون ہی کے ذریعے معاشرے میں سکون واطمینان کی زندگی ممکن ہے۔مسلمانوں کا حاکم اور امیر چونکہ اُن کے تمام امور کے ذمے دار ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ تمام امور وہ اکیلے سر انجام نہیں دے سکتے اس وجہ سے بحیثیت ایک مسلم رعایا کے اُن کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا لازمی ہوتا ہے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> "اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو"[6]

اس کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:"وَلْيُعِنْ بَعْضُكُمْ أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ بَعْضًا عَلَى الْبِرِّ , وَهُوَ الْعَمَلُ بِمَا أَمَرَ اللَّهُ بِالْعَمَلِ بِهِ"[7] اور ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کے کاموں میں تعاون کرنا چاہئیے۔اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دئے گئے احکام کو بجالائیں۔

اور قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں:چاہئیے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔اور اللہ کی طرف سے دئیے گئے احکام کی لوگوں کو ترغیب دیں اور اس پر عمل کریں۔اور جن امور سے اللہ

---

[1]المائدہ63:5

[2]النحل43:16

[3] طبری،ج7،ص180،رقم:9934

[4]حسن بن ابی الحسن،بصری،مشہور تابعی ہے۔علم ،زہد ،تقوی اور عبادت میں بے مثل تھے۔مدینہ میں 21ھ کو پیدا ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔110ھ کو وفات پائے ،کثرت سے تدلیس کرتے تھے۔اس لیے اُن کی معنعن روات مقبول نہیں ۔وفیات الاعیان69/2،میزان الاعتدال527/1،الاعلام226/2

[5]عبدالرحمان بن شہاب،ابن رجب،جامع العلوم والحکم،ج30،ص11،س م نامعلوم

[6]المائدہ2:5

[7]طبری،ج8،ص52

تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اس سے منع ہو جائیں۔یہ نبی علیہ السلام کے اس ارشاد کے موافق ہے جس میں آپ□ نے فرمایا:نیکی کا راستہ دکھانے والا ایسا ہے جیسا کہ اُس نے وہ نیکی کی۔اور نیکی وتقوی کے کاموں میں تعاون کے چند اقسام ہیں۔ایک عالم پر لازم ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے ،مال دار اپنے مال کے ذریعے اور بہادر اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی بہادری کے ذریعے لوگوں کے مدد کریں۔اور یہ کہ تمام مسلمان ایک ہاتھ کی مانند ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہو۔مؤمنوں کا خون برابر ہے ان میں سب سے زیادہ کمزور بھی اِن کی عہد پالنے کی کوشش کرے گا۔کیونکہ مسلمان غیر مسلموں کے خلاف ایک ہاتھ کے مانند ہوتے ہیں۔ظالم سے اعراض کرنا ، اُس کے مدد سے ہاتھ کھینچنااور اس پر رد کرنالازمی ہوگا۔[1]

اجتماعی امور اولوالامر کے حوالے کرنا: انسان کے ساتھ بہت سے امور متعلق ہوتے ہیں جن میں بعض انفرادی ہوتے ہیں اور بعض اجتماعی۔انفرادی امور میں کسی دوسرے انسان کا عمل دخل نہیں ہوتا ۔وہ جس طرح چاہے اپنے اِن امور میں خود مختار ہوتا ہے لیکن اجتماعی امور چونکہ تمام معاشرے کے ساتھ متعلق ہو تے ہیں اس وجہ سے اِن کا خیال رکھنا اولوالامر(حاکموں)کی ذمہ داری ہوتی ہے لہذا ایسے امور اُن کے حوالے کرکے اس میں انفرادی طور پر عمل دخل نہیں رکھنا چاہئیے۔مثلاََملکی دفاع،کرنسی،خارجہ امور،بین الاقوامی تعلقات اور اس جیسے دیگر اہم امور چونکہ کوئی بھی انسان انفرادی طور پر سر انجام نہیں دے سکتا اس وجہ سے یہ امورحاکموں کے حوالے کئے جانے کا حکم ہے۔(حاکموں سے مراد یہ ہے کہ جہاں لوگوں نے اپنے اندرونی نظامِ انتخاب کے ذریعے اپنے امیروں (حاکموں،حکومتی اہلکاروں،عوامی نمائندوں)کو منتخب کیا ہے)۔

اپنے اولوالامر سے محبت رکھنا،اُن کا اکرام کرنا: اسلام حاکم اور محکوم کے درمیان کے تعلق کا ایسا کوئی تصور نہیں دیتا جس میں حاکم اپنے آپ کو اعلیٰ اوراپنے رعایا کو کمزور سمجھتا ہو ، حکومت تو ایک انتظامی طریقہ کار ہے جس میں حاکم اور محکوم کے درمیان اگر فاصلے زیادہ نہ ہوں بلکہ باہمی محبت اور بھائی چارگی ہو۔دونوں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں ۔تو ایسی صورتِ حال میں امور حکومت چلانا آسان ہوتا ہے
احادیثِ مبارکہ میں ایسے اولوالامر کو بہترین قرار دیا گیا ہے جو اپنے رعایا سے محبت کرنے والے ہوں اور رعایا اُن سے محبت کرنے والے ہوں اور بدترین حاکم وہ ہے جن پر لوگ لعنت کریں جیسا کہ ارشاد نبوی □ ہے :

"نبی علیہ السلام کاارشاد ہے ۔تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہیں وہ تمہارے لیے دعا کرتے ہیں اور تم اُن کے لیے دعا کرتے ہو اور تمہارے برے حاکم وہ ہیں جن کے تم دشمن ہو اور وہ تمہارے دشمن ہیں تم اُن پر لعنت کرتے ہو اور وہ تم پر لعنت کرتے ہیں ۔لوگوں نے عرض کیا،یا رسول اللہ! ہم ایسے برے حاکموں کو تلوار سے دفع نہ کریں آپ□ نے فرمایا،نہیں۔جب تم کوئی بات اپنے حاکموں سے دیکھو تو دل سے اسے برا جانو لیکن اُن کی اطاعت سے باہر نہ ہو"[2]

اور سلطان کی عزت کرنا بھی اللہ تعالی کی عزت کرنا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

---

[1] محمد بن احمد،القرطبی،الجامع لاحکام القرآن،ج6،ص46،45،دارالکتب المصریہ،القاہرہ،1384

[2] مسلم ،کتاب الامارۃ،باب خیر الائمۃ وشرارھم،رقم:4910

ابوموسی اشعری[1] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: "معمر اور سن رسیدہ مسلمان کی اور حافظ قرآن کی جو نہ اس میں غلو کرنے والا ہواور نہ اس سے دور پڑ جانے والا ہو، اور عادل بادشاہ کی عزت و تکریم دراصل اللہ کے اجلال و تکریم ہی کا ایک حصہ ہے"[2]

اصلاح کی غرض سے حاکموں کو نصیحت کرنا: اولوالامر بھی چونکہ انسان ہیں اُن سے غلطیاں ہو سکتی ہیں اس وجہ سے علماء وفقہاء کی یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اُن کی بروقت اصلاح کریں۔تاکہ امیر کی ایک غلطی سے پوری قوم کا نقصان نہ ہو جائے۔ امام ابن تیمیۃ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ:اہل علم،دین دار اورفضیلت والے لوگ کبھی بھی کسی کو حاکموں کی کسی بھی فعل میں نافرمانی ،دھوکے بازی،اور کسی بھی طرح کی بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔جیسا کہ قدیم وجدیداہل السنۃ واہل دین کاشیوہ رہا ہے"[3]

حاکموں کی عزت نفس کا خیال رکھنا: انسان چاہے کسی بھی حالت میں ہو اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا ۔اولوالامر چونکہ ایک ذمہ دار منصب پر بیٹھا ہوتا ہے اس وجہ سے بھی اور ایک انسان اور مسلمان ہونے کی وجہ سے بھی اُن کی عزت نفس کا خیال رکھنا اُن کا حق بنتا ہے اور اُن کے پیچھے باتیں کرنا،گالیاں دینا اوراُن کی بے عزتی کرنا گناہ اور ناجائز ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" جو شخص زمین پر اللہ کے بنائے ہوئے سلطان)حاکم(کو ذلیل کرے تو اللہ اسے ذلیل کرے گا"[4]

اور انس بن مالک کی روایت میں ہے کہ:

"ہمیں اپنے بڑوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم)نے اس بات سے منع کیا ہے :کہ اپنے امراء کو گالیاں نہ دو،اُن سے دھوکہ نہ کرو اور اُن سے دشمنی نہ رکھو۔اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ قیامت قریب ہے"[5]

اور ابو عاصم کاقول ہے کہ:سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اپنے حاکموں کے لعن طعن سے بچ کے رہو،کیونکہ یہ کام بندے کو ہلاک کرنے والاہے۔پوچھا گیا کہ اگر ہم اُن کے کچھ کام کو ناپسند کرتے ہو تو پھر ہم کیا کریں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:صبر اختیار کرو کیونکہ ایسے وقت میں اللہ جل شانہ اُن کی موت کے ذریعے تمہاری گلوخلاصی فرمائی گی۔[6]

---

[1]اُن کااصل نام عبداللہ بن قیس بن سلیم تھا۔مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کرکے اپنے قبیلے میں چلے گئے اور فتح خیبر کے موقع پر مدینے تشریف لائے۔آپ نے اُنہیں یمن کے علاقے ،عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ اور عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا۔صفین میں حَکَم مقرر ہوئے 42ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائے۔الاصابہ211/4،تہذیب الکمال477/15

[2]سنن ابو داؤد،کتاب الادب،باب فی تنزیل الناس منازلھم،رقم:4845

[3]احمد بن عبدالحلیم،ابن تیمیۃ،مجموع الفتاوٰی،ج35،ص12،دارالوفاء،1426ھ

[4]الترمذی،کتاب الفتن،باب من اہان سلطان اللہ فی الارض اہانہ اللہ،رقم:2224

[5]عمروبن ابی عاصم،السنۃ،ج2،ص488،المکتب الاسلامی،بیروت،1400ھ

[6]عمروبن ابی عاصم،السنۃ،ج2،ص488،المکتب الاسلامی،بیروت،1400ھ

غیر مسلموں کے سماجی حقوق

اسلام انسانیت کا درس دینے والا دین ہے جس میں مسلمان اور غیر مسلم سب برابر ہیں ۔جس طرح اسلام مسلمانوں کے حقوق کی بات کرتا ہے با لکل اُسی طریقے سے غیر مسلموں کے حقوق کے لیے بھی آواز اٹھاتا ہے ۔اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ یہ اپنے نہ ماننے والوں کی جتنی رعایت کرتا ہے اور اُن کو جو مراعات دیتا ہےدنیا کا کوئی بھی دین/مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ذیل میں ایک اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق میں سے چند ذکر کئے جاتے ہیں۔

غیر مسلم کی بحیثیت انسان تکریم کرنا:تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے اسی حیثیت سے اُن میں کوئی فرق نہیں ہے ۔اور انسان کی تکریم کے بارے میں اسلام باربارہدایات دیتا ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟ چونکہ غیر مسلم بھی انسان ہی تو ہو تا ہے اس وجہ سے اُس کی تکریم کرناضروری ہوگا جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> "اور انسان کو ہم نے کو عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں(سامان وغیرہ لے جانے کے لیے) سواری دی اور پاکیزہ رزقدےدی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"[1]

اس حکم میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں ۔

اور اللہ تعالی فرماتے ہیں:

> "اےلوگوں ہم نے تم کو ایک (ہی)مرد(آدم علیہ السلام)اور ایک(ہی) عورت سے پیداکیا اورتمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کروبے اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے سب سے خبردار ہے"[2]

مزید فرماتے ہیں :

> " اے لوگوں اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص (آدم علیہ السلام)سے پیدا کیا یعنی اول اس سے اس کا جوڑا

[1] الاسراء70:17

[2] الحجرات13:49

بنایا پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پیدا کرکے
روئے زمین پر پھیلا دئیےاور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے
سے تم ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور قطع
رحمی سے بچو کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[1]

جان،مال اور عزت کا تحفظ:اسلامی معاشرے میں رہنے والے تمام شہری برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق نہیں ہوتا۔لہٰذا اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کوبلاوجہ قتل کردے،یا اُس کا مال ناجائز طریقے سے لے لے یااُس کی عزت پر حملہ آور ہو جائے تو اُس سے قصاص لیا جائے گااور اس طرح دوسرے ناجائز کاموں کی سزا دی جائے گی۔قرآن کریم اور سنت نبویہ میں کھلے الفاظ میں اُن کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔جس کا ہرمسلمان کوانفرادی اور اجتماعی طور پر عمل پیرا ہونے کا پابند بنا دیاگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:

"اور اس کسی کو قتل نہ کرو جس کا قتل اللہ تعالی نے حرام کیا
ہو۔لیکن اگرشریعتِ اسلامی اس کے قتل کی اجازت دے (توپھر
جائز ہے)"[2]

اس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ بلاوجہ غیر مسلم قتل کرنا اللہ تعالٰی کے نزدیک حرام ہے۔اسلام کسی کواس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی بھی غیر مسلم کو ناحق قتل کیا جائے۔قتل انسانی کے بارے میں اللہ تعالی کا فرمان ہے:""جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین کے (ناحق)قتل کر دیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا ۔اس آیت میں "نفس" کا لفظ آیا ہے جو مسلمان اور کافر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ناحق کسی انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے ،اس وجہ سے اسلامی معاشرے میں آباد غیر مسلموں کا قتل بھی اسی حکم کے تحت آتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں غیر مسلم کی حیثیت ایک معاہد کی ہوتی ہے جس کی جان ،مال اور عزت کی حفاظت مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔اس وجہ سےکسی معاہد کا قتل کسی بھی صورت میں قابل معافی جرم نہیں ،اور آخرت میں بھی جواب دہی ہوگی؛حدیث میں آتا ہے کہ:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا” :خبردار! جس نے کسی ایسے ذمی کو قتل
کیا جسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ
حاصل تھی تو اس نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا، لہٰذا وہ جنت کی
خوشبو نہیں پا سکے گا، حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی
مسافت (دوری)سے آئے گی"[3]،[4]

اور کسی مسلمان کو قتل نہ کرنے پر جتنی دیت ضروری ہے اُتنی ہی دیت غیر مسلم کو قتل کرنے پر بھی ہوگی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے :

---

[1] النساء1:4
[2] الانعام151:6
[3] سنن ترمذی،کتاب الدیات،باب فیمن یقتل نفسا معاھدۃ،رقم:1403
[4] قال الالبانی:صحیح،صحیح الترغیب والترھیب،ج3،ص89

" نبی علیہ السلام نے ایک ذمی کو پورا دیت ادا فرمایا تھا۔" [1]، [2]

اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :سنو! جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اس کا کوئی حق چھینا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی مرضی کے لے لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے "وکیل"ہوں گا"[3]،[4]

غیر مسلم معاہدکے مال کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ناجائز طریقے سے اُس کا مال لینا حرام ہے :

"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :خبردار! جو کافر تم سے عہد کر لیں ان کے اموال تمہارے لیے جائز نہیں ہیں سوائے ان کے جو جائز طریقے سے ہوں"[5]،[6]

اسی طرح غیر مسلم کا مال لینا بھی ناجائز ہے :"اسلامی معاشرے میں غیر مسلم شہری کی جان کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی مسلمانوں پر لازم ہے "الدر المختار" میں ہے :"غیر مسلم شہری کی شراب اور اس خنزیر کو تلف کرنے کی صورت میں مسلمان بطور تاوان اس کی قیمت ادا کرےگا۔"اور یہ تو اللہ تعالی کے حکم کے مقابلے بڑی جرات ہوگی،کہ ان کے گھروں کو جلا دیا جائے ۔کیونکہ حرام ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے عمل سے اسلام کے نا لیواؤں کی بد نامی ہوتی ہے ۔اسلام نے کسی بھی انسان کے مال کی چوری کو حرام قرار دیا ہے اور ا س پر نہایت سخت سزا مقرر کی۔ایک موقع پر آپ ﷺنے ارشاد فرمایا کہ اگر میری بیٹی(سیدہ) فاطمہ(رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی تو اُس پر بھی حد جاری کی جاتی "جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مخزومی عورت کا معاملہ جس نے چوری کی تھی، قریش کے لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامسے اس معاملہ میں کون بات کر سکتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا، جو نبی علیہ السلامکو بہت پیارے ہیں اور کوئی آپ سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتا؟ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلامسے بات کی تو نبی علیہ السلامنے فرمایا "کیا تم اللہ کی حدوں میں سفارش کرنے آئے ہو۔"پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا "اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور اللہ کی

---

[1] سنن الدار قطنی،ج4،رقم:3243

[2] البانی کے نزدیک یہ حدیث منکر ہے،سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ،ج1،ص660

[3] ابوداؤد،کتاب الخراج،باب فی تعشیر اھل الذمۃ اذااختلفوا بالتجارات،رقم:3054

[4] قال البانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی ابی داؤد،ج7،ص52

[5] ابوداؤد،کتاب الاطعمۃ،باب النھی عن اکل السباع،رقم:3808

[6] یہ حدیث ضعیف ہے،الالبانی،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص306

قسم: اگر فاطمہ بنتِ محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد)صلی اللہ علیہ وسلم (اس کا ہاتھ ضرور کاٹ ڈالتے"[1]

غیر مسلم کے مذہبی رہنماؤں کے قتل سے اجتناب کرنا: جس طرح کسی غیر مذہب کے بھیجے ہوئے ایلچی کو قتل کرنے سے سخت ممانعت آئی ہے اسی طرح اُن کے مذہبی رہ نماؤں کو قتل کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔جیسا کہ مسند احمد میں روایت ہے:

" نبی علیہ السلام جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تھے تو اُن کو یہ حکم دیا جاتا تھا:غداری نہ کرو،دھوکہ نہ دو،نعشوں کی بے حرمتی نہ کرو،بچوں اور اُن کے مذہبی رہنماؤں (پادریوں) کو قتل نہ کرو"[2]

اس روایت سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ عام حالات میں تو قتل حرام ہی ہے ،اس کے علاوہ بھی دورانِ جنگ بھی کسی قوم کے پادریوں کا قتل جائز نہیں ہے۔

قاتل کے علاوہ کسی دوسرے غیر مسلم سے بدلہ نہ لینا: اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر انسان اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے۔جس نے بھی کوئی غیر قانونی کام کیا بدلہ اُسی ہی سے لیا جائے گا۔دوسرا کوئی بھی شخص(چاہے قاتل سے اس کی کسی بھی قسم کی رشتہ داری ہو)اُس کام کے بدلے کا مستحق نہیں ہوگا۔قتل کے معاملے میں اُس کے اہل وعیال،احباب یا قوم کے دوسرے افراد سے قصاص نہیں لیا جا سکتا ۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اور جو کوئی بھی جو گناہ کرتا ہے،(اُسی کا وبال)اُسی متعلقہ شخص پر ہوتا ہے۔اور کوئی بھی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا"[3]

اسلامی معاشرے میں سزا میں ملوث شخص کے علاوہ کسی دوسرے پُرامن شہریوں کو نہیں دی جا سکتی۔

تجارت کے یکساں مواقع کے فراہم کرنا: انسان کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سارے شعبوں سے واسطہ پڑتا ہے جس کے بغیر اُس کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے،جس میں اُس کے کھانے پینے کے لیے تگ ودو بھی شامل ہے۔اس کے لیے تجارت کا پیشہ ہی زیادہ منافع بخش ہوتا ہے ۔کسی غیر مسلم کو ایک اسلامی معاشرے میں ویسے ہی مواقع میسر ہوں گے جیسے ایک مسلمان کے لیے ہوں گے بلکہ اُن کے ساتھ اشتراک کے طور پر بھی تجارت کرنا جائز ہے جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے

"نبی علیہ السلامنے خیبریہودیوں کے پاس ہی رہنے دیئے تھے کہ وہ ان میں کام کریں اور بوئیں جوتیں اور انہیں ان کی پیداوار کا آدھا حصہ ملے گا"[4]

غیر مسلم کی عیادت کرنا: نبی علیہ السلام کی سنت سے غیر مسلم کی عیادت کرنا ثابت ہے:

---

[1] بخاری،کتاب الحدود،باب کراهیة الشفاعة فی الحد اذا رفع الی السلطان،رقم:6788،مسلم،کتاب الحدود،باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنهی عن الشفاعة،رقم:4506

[2] مسند احمد،ج1،ص300،رقم:2728

[3] الانعام 164:6

[4] بخاری،کتاب المغازی،باب معاملة النبی اهل خیبر ،رقم:4248

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا بیمار پڑا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس عیادت کے لیے آئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے"[1]،[2]

حلف اٹھانے میں اُس کے مذہب کی رعایت کرنا: یہ عمل بھی حدیث سے ثابت ہے،جیسا کہ روایت میں آتا ہے:

" نبی علیہ السلام نے یہودیوں کو (ایک موقع پر قسم دیتے ہوئے)فرمایا:تمہیں اُس اللہ کی قسم جس نے توراۃ موسٰی (علیہ السلام)پر نازل فرمائی:بتاؤ:توراۃ میں زانی کی سزا کیا ہے؟"[3]،[4]

یہاں یہودیوں سےاُن کی کتاب (تورات) دےکرقسم دلوائی گئی ۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام کسی بھی مذہب کی بے احترامی کا قائل نہیں ۔

مذہبی آزادی:اسلام کسی بھی انسان کو جبراََ مسلمان بنانے کا حامی نہیں ہے ۔جیسا کہ ارشاد ہے:" لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ"[5]دین میں(کوئی)جبر نہیں ہے"۔اس وجہ سے جہاں بھی اسلامی معاشرہ ہو گا وہاں اگر کوئی غیر مسلم رہتا ہو تواُس کا یہ حق ہے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کریں۔نبی علیہ السلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں غیر مسلم جب تک مسلم معاشرے میں رہتے تھے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب الجنائز،باب فی عیادۃ الذمی،رقم:3097

[2]یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج7،ص95

[3]ابوداؤد،کتاب الاقضیہ،باب کیف یحلف النبی ﷺ،رقم:3624

[4]قال الالبانی:ضعیف،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج8،ص124

[5]البقرۃ256:2

باب سوم

سیرت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا عالمی منشور برائے انسانی حقوق1948ء سے تقابلی جائزہ

فصل اول

عالمی منشور کے تمہید کاسیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ

عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء کی تمہید:اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلینے 1948ء کو " عالم منشور برائےانسانی حقوق "منظور کرکے اس کا عام اعلان کیا۔اعلان کے بعد اقوام متحد ہ کی اس فورم نے اپنے ممبرز ملکوں کو اس منشور پر عمل کرنے کے احکامات جاری کیں جو کہ اس منشور کی تشہیر اور دنیا بھر میں اس کی نشر واشاعت پر مشتمل تھیں۔یعنی تدریسی اداروں میں پڑھ کر سنانا،پبلک مقامات پر اسے اویزاں

عرف اور تشہیر کی تمام تر وسائل استعمال کرکے اسے ہر فرد تک پہنچائے۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں منشور کی وضاحت بھی تھی اور اس بارے میں کسی ملک یا علاقے کی سیاسی حیثیت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

تمہید:

"چونکہ ذاتی طور پر انسان کی حرمت ،عزت اور ان کے برابری کے بنیاد پر ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اورامن کی بنیاد ہے،چونکہ انسانی حقوق سے لا پرواہی اور اُن کی بے حرمتی اکثرایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے انسانیت کے ضمیر کوسخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سےمحفوظ رہیں،چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانوں کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آکرجبر واستبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو،یہ بات بھی اہم ہے کہ دنیاکے اقوام کےدرمیان دوستانہ تعلقات کو آگےبڑھایا جائے،چونکہ اقوام متحدہ کے ممبر ممالک نے اپنے چارٹر میں انسان کی بنیادی حقوق، نفسِ انسان کی شخصیت کی تقدیس(حرمت) اور قدر اورعورتوں اور مردوں کے برابری کے بنیاد پر حقوق کے بارے میں اپنےعقیدے کی دوبارہ تصویب کر دی ہے اور آزادی کے مبنی بر وسیع مفہوم کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور زندگی کے معیار کو ترقی کی طرف لے جانے کا ارادہ کر لیاہے،چونکہ ممبر ممالک نےیہ عہد کرلیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے تعاون سے اصولی طور پرساری دنیا میں اور عمومی طورپر حقوقِ انسانی اور بنیادی آزادیوں سب سے زیادہ احترام کریں گے اوردوسرے ممالک کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیں گے،اسی طرح چونکہ اس وعدے کی پورا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان آزادیوں اور حقوق کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں،لہذاجنرل اسمبلی کی رو سے یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ حقوقِ انسانی کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے لیے حصولِ مقصد کامشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کریں اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ممالک میں اور اُن قوموں میں جو ممبر ممالک کے ماتحت ہوں،منوانے کے لیے بتدریج کوشش کر سکے۔[1]"

سیرت طیبہ سے موازنہ: یہ چارٹر تمام ممبر ممالک کے لیے لازمی طور پر قابل قبول ہوگا۔اور قبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی نشرواشاعت بھی کریں گے۔گویا یہ دنیا کے لیے ایک بین الاقوامی دستور ہے۔

سیر ت طیبہ (قُرآن وحدیث)میں انسان کو دنیا میں اللہ تعالی کا خلیفہ بنا کر بھیجنے کا ارشاد ہے۔جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

" اور یاد کرو وہ وقت جب تمہارے ربنے فرشتوں سے فرمایا کہ
میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہو"[2]

اس ارشاد کی روشنی میں انسان کو اللہ تعالی اور اُس کے بندوں کے ساتھ تعلق کاپتہ چلتا ہے۔کہ ایک طرف وہ اللہ تعالی کا نائب ہوکر اُس کے ساتھ تعلق رکھےگا اور دوسری طرف

---

[1] آخری مستند متن،عالمی منشور برائے انسانی حقوق،محکمہ اطلاعاتِ عامہ۔اقوامِ متحدہ،نیویارک،جون 1965

[2] البقرۃ30:2

انسان ہونے کے ناطے اپنے جیسے انسانوں سے تعلق رکھے گا۔پس انسان کو دو قسم کے تعلقات استوار رکھنے ہوں گے۔خالق کے ساتھ بھی اور مخلوق کے ساتھ بھی۔

اس تعلق میں انسان کے کچھ حقوق اور کچھ فرائض ہوں گے او رحقوق وفرائض دونوں کی بجا آوری لازمی ہوگی۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقوق دو قسم پر ہیں۔

نمبر1۔اللہ تعالیٰ کے حقوق(حقوق اللہ)

نمبر2۔مخلوق کے حقوق(حقوق العباد)

اور یہ تقسیم انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ اللہ جل شانہ کی جانب سے آج سےپندرہ صدی قبل نازل ہونے والی کتاب کی تقسیم ہے جس میں حق اللہ اور حق العبد کا تذکرہ ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس ارشاد میں ہے:

"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسائیوں اور اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو"[1]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو"[2]

دونوں آیات میں حق اللہ(اللہ کی عبادت)اور حق العبد (والدین،رشتہ دار،یتیم،مسکین،ہمسائے،مسافر اور غلام(خادم))کاذکر ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان پر دو قسم کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور دونوں کا پورا کرنا انسان کے لیے ضروری ہے۔جب ہم اقوام متحدہ کے عالمی منشور برائے انسانی حقوق کی طرف دیکھتے ہیں تو دنیا اسے ایک تاریخی کارنامہ سمجھتی ہے حالانکہ "انسانی حقوق" کا درس تو آج سے پندرہ صدی قبل نبی علیہ السلام نے عملی طور پر دنیا کو دیا تھا اور اس کی تشریح اپنے آخری خطبے"حجۃ الوداع"کے موقع پر فرمائی تھی اور "اقوام متحدہ کا عالمی منشور برائے انسانی حقوق" تو بالکل قریبی زمانے میں کی گئی ایک ناقص کوشش ہے ۔ناقص تو اس وجہ سے ہے کہ اس میں صرف انسانی حقوق کا ذکر ہے خالقِ کائنات کے حقوق کا تذکرہ تک نہیں ۔حالانکہ انسانی حقوق سے زیادہ اہم حقوق اللہ ہوتے ہیں۔ اسلام میں حقوق کا تصور کیا ہے؟تقدیم کن حقوق کو حاصل ہے؟ اس کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے سلمان اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ میں)ہجرت کے بعد(بھائی چارہ کرایا تھا۔ ایک مرتبہ سلمان رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے گئے۔ تو)ان کی عورت(ام الدرداء رضی اللہ عنہا کو بہت پراگندہ حال میں دیکھا۔ ان سے پوچھا کہ یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ہیں

---

[1] النساء36:4

[2] الاسراء24:17

جن کو دنیا کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے پھر ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور ان کے سامنے کھانا حاضر کیا اور کہا کہ کھانا کھاؤ، انہوں نے کہا کہ میں تو روزے سے ہوں، اس پر سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک تم خود بھی شریک نہ ہو گے۔ راوی نے بیان کیا کہ پھر وہ کھانے میں شریک ہو گئے)اور روزہ توڑ دیا(رات ہوئی تو ابوالدرداء رضی اللہ عنہ عبادت کے لیے اٹھے اور اس مرتبہ بھی سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابھی سو جاؤ۔ پھر جب رات کا آخری حصہ ہوا تو سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا اب اٹھ جاؤ۔ چنانچہ دونوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے۔ جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اس لیے ہر حق والے کے حق کو ادا کرنا چاہئے، پھر آپ نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا"[1]

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ اصلاًعربی نہیں تھے بلکہ عجمی تھے مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے غلام تھے۔اُس سے مکاتبت کاعقد کرکے آزاد ہوئے اور حق کی تلاش میں نکلے ۔اُنہی دنوں نبی علیہ السلام ہجرت کرکے مدینے منورے تشریف لے گئے تھے۔ سلمان رضی اللہ عنہ بڑی عمر کے آدمی تھے۔اُن کی کم سے کم عمر اڑھائی سو سال بتائی جاتی ہے[2]۔قبامیں آپ ﷺ سےملاقات کرکے ایمان لائے۔ مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کا رشتہ نبی علیہ السلام نے قائم فرمایا تھا ۔اس سلسلے میں سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اورسیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی بندی فرمائی گئی۔بھائی بننے کے بعد سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اُنہیں گھر لائے۔ جب یہ گھر گئے تو اُنہیں گھرکا ماحول ایسا لگا گویا یہاں کوئی عورت ہی نہیں رہتی کیونکہ گھر میں صفا ئی ستھرائی کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔جب کسی گھر میں کوئی خاتون ہوتی ہےتو گھر کے ماحول سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کوئی ضرور رہتا ہے۔اور یہاں حالات بالکل مختلف تھے۔سلمان رضی اللہ آتے ہی ام الدرداء سے کہنے لگے: اپنے گھر کایہ کیا حال بنا رکھا ہے؟انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا:تمھارے بھائی(ابوالدرداء)کی وجہ سے یہ حالت ہے کیونکہ وہ تو نہ گھرمیں کوئی دلچسپی لیتے ہیں اور نہ مجھ میں۔دن کو روزے سے رہتا ہے اور ساری رات نماز پڑھتے ہوئے گزارتے ہیں،تو میں کیونکر اپنے آپ کواور گھر کو صاف رکھ سکتی ہو۔دوپہر کے کھانے پر بیٹھ گئے تو ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کھانے سے معذرت کرلی کہ میرا روزہ ہے۔سلمان رضی اللہ نے بھی ہاتھ اٹھا لیے پوچھنے پر بتایا کہ جب آپ نہیں کھاتے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔مجبور ہوکر کھانے پر بیٹھ گئے۔

---

[1] بخاری،کتاب الصوم،باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع،رقم:1968

[2] الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج3،ص141،رقم:3359

(قرآن وسنت کی تعلیمات کا یہی نچوڑ ہے کہ فرائض میں سب سے مقدم اللہ کے حقوق ہیں پھر فرائض کے بعد نوافل،مستحبات اور مباحات میں حقوق العباد کا نمبر آتا ہے۔یعنی فرائض میں اللہ کے حقوق سب سے پہلے ہیں اور باقی سب معاملات میں بندوں کے حقوق پہلے ہیں۔تب ہی تو ابوالدرداء روزہ توڑ کر کھانے پر بیٹھ گئے)۔عشا ءکی نماز کے بعد سلمان رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگے کہ آپ آرام فرمالیں میں تہجد کے لیے کھڑاہو جاتا ہوں۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے یہاں بھی اُنہیں بستر پر لیٹ جانے پر مجبور کردیا۔درمیان میں ایک دو دفعہ ابوالدرداَء رضی اللہ عنہ اُٹھے بھی لیکن سلمان رضی اللہ عنہ نے اُنہیں آرام کرنے کا کہتے رہے۔رات کے آخری پہر سلمان رضی اللہ عنہ خود بھی اُٹھے اور اُن کو اُٹھایا۔تہجد پڑھی۔فجر کی نماز کے لیے مسجد چلے،راستے میں سلمان رضی اللہ عنہ اُنہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:تم پر تمہارے رب کا حق ہے،تمہارے نفس کا حق ہے،تمہارے اہل وعیال کا حق ہے پس ہر کسی کاحق ادا کیا کرو"

اور یہی نصیحت اسلام میں حقوق کے تصور کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔حقوق اللہ کا اپنا وقت ہوتا ہے اور حقو ق العباد کا اپنا۔فجر کی نماز کے بعد نبی علیہ السلام نے ابوالدرداَء رضی اللہ عنہ سے پو چھا:سلمان کو کیسے پایا؟آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا واقعہ بیان کیا۔اپنا روزہ تڑوانے اور ساری رات نماز سے رکوانے کی بھی شکایت کی،اور ساتھ ہی سلمان رضی اللہ عنہ کی نصیحت کا بھی ذکر فرمایا۔نبی علیہ السلام نے ایک ہی جملے میں امت کے لیے پورا قانون بیان فرمایاکہ:" صَدَقَ سَلْمَانُ "

الغرض اس واقعے میں واضح طور پر مسلمانوں کے لیے "حقوق اللہ"اور "حقوق العباد"کا تصور موجود ہے۔اس کے برعکس اقوام متحدہ کے اس "عالمی منشور برائے انسانی حقوق "میں حقوق اللہ کا ذکر تو درکنار "حقوق العباد"بھی پورے اور واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ اِن دونوں حقوق کے ادا کرنے میں اعتدال سے کام لینا چاہئیے۔اسلام اس بات کی قطعاًَ اجازت نہیں دیتا کہ صرف حقوق اللہ پورے کئے جائیں اور حقوق العباد کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہے اور نہ ہی اسلام اس بات کا قائل ہے کہ حقوق اللہ کو یکسر چھوڑ کر ساری توانائی حقوق العباد پرصرف کی جائے۔ بلکہ دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں ۔اور ہر ایک کا اپنااپنادائرہ کار ہوتا ہے اسی دائرے میں رہ کر ہی دونوں کی بجاآوری کا حکم ہے۔اسی وجہ سے اسلام دنیا میں "حقوق اللہ" کے نام پرخود ساختہ نظام "رہبانیت" کی نفی کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کے اس ارشاد میں ہے:

" اور لذات سے کنارہ کشی کی تو انہوں نے خود ایک
نئی بات نکال لی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا
مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ، پھر جیسا اس
کو نباہنا چاہیئے تھا نباہ بھی نہ سکے"[1]

اور حدیث میں آتا ہے کہ:

"انس بن مالک نے بیان کیا کہ تین صحابہ(علی بن ابی طالب،
عبداللہ بن عمرو بن العاص اور عثمان بن مظعون [2]رضی اللہ

---

[1]الحدید27:57

[2]۔سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو سائب ہے۔ آپ ان شخصیات میں سے ہیں جن کی نماز جنازہ نبی علیہ السلام نے پڑھائی۔پہلے صحابی ہیں جو بقیع میں دفن ہوئے۔ دو ہجرتیں کئے۔ 2ھ/624ء میں جنگ بدر کے بعد وفات پائی۔ ابن الاثیر،اسد الغابہ،ج3،ص620۔الاستیعاب،ج1،ص244۔ابن حجر،الاصابہ،ج4،ص461۔

عنہم)نبی علیہ السلامکی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف
آپ کی عبادت کے متعلق پوچھنے آئے، جب انہیں نبی علیہ السلامکا عمل بتایا گیا تو جیسے انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہا کہ ہمارا نبی علیہ السلامسے کیا مقابلہ! آپ کی تو تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ آج سے میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا اور کبھی ناغہ نہیں ہونے دوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے جدائی اختیار کر لوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ پھر نبی علیہ السلامتشریف لائے اور ان سے پوچھا کیا تم نے ہی یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ رب العالمین سے میں تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں لیکن میں اگر روزے رکھتا ہوں تو افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں)رات میں(اور سوتا بھی ہوں اور میں شادی بھی کرتا ہوں:

" فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي"

میرے طریقے سے جس نے بے رغبتی کی وہ مجھ میں سے نہیں ہے"[1]

ہمیشہ نماز پڑھنے،ہمیشہ روزے رکھنےاور نکاح نہ کرنے کی توجیہ"رہبانیت"سے ہی ہو سکتی ہے۔جس پر اُن حضرات کو نہ شاباش ملی اورنہ ہی اُن کو اس کی اجازت ملی۔یہ حقو ق اللہ میں غلو ہے جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ۔بلکہ حدیث کے آخری الفاظ" فَلَيْسَ مِنِّي "سے تو اُن کی اور زیادہ قباحت سامنے آجاتی ہے ۔

ایک حدیث میں ایک صحابی کا واقعہ ذکر ہے جس سے بھی اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ "حقوق العباد" اور "حقوق العباد" میں بیلنس رکھنا چاہئیےَ:

" عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے بیان کیا، کہ مجھ سے نبی علیہ السلامنے فرمایا، عبداللہ! کیا یہ خبر صحیح ہے کہ تم دن میں تو روزہ رکھتے ہو اور ساری رات نماز پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کی صحیح ہے یا نبی علیہ السلام ! آپ نے فرمایا، کہ ایسا نہ کر، روزہ بھی رکھ اور بے روزہ کے بھی رہ۔ نماز بھی پڑھ اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تم سے ملاقات کرنے والوں کا بھی تم پر حق ہے بس یہی کافی ہے کہ ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھ لیا کرو، کیونکہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ملے گا اور اس طرح یہ ساری عمر کا روزہ ہو جائے گا، لیکن میں نے اپنے پر سختی چاہی تو مجھ پر سختی کر دی گئی۔ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میں اپنے میں قوت پاتا ہوں۔ اس پر

---

[1]بخاری،کتاب النکاح،باب الترغیب فی النکاح،رقم:5063

آپ نے فرمایا کہ پھر اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام کا روزہ رکھ
اور اس سے آگے نہ بڑھ، میں نے پوچھا اللہ کے نبی داؤد علیہ
السلام کا روزہ کیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایک
دن روزہ رکھتے اور ایک دن بے روزہ رہا کرتے تھے۔ عبداللہ
رضی اللہ عنہ بعد میں جب ضعیف ہو گئے تو کہا کرتے تھے
کاش! میں نبی علیہ السلامکی دی ہوئی رخصت مان لیتا"[1]

ہوا یوں کہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ نے اپنے بیٹے کی شادی کرائی اور الگ مکان بنواکر اُنہیں وہاں منتقل کیا،کچھ روز بعد حال احوال پوچھنے کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے ۔بیٹا تو گھر پرموجود نہیں تھا ۔بہو سے حال احوال پوچھے ۔اُس نے سب اچھا کہا۔لیکن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا:ہمارے لیے ابھی تک فارغ نہیں ہوئے ۔سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ بہو کتنے حسین پیرائے میں اپنے شوہر کی شکایت کررہی ہے۔کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹھے کے بارے میں جانتے تھے۔پھر آپ رضی اللہ عنہ نےنبی علیہ السلام کے سامنے اپنے بیٹے کا معاملہ رکھ دیا۔اس پر آپ ﷺ نے اُنہیں بلا لیا اور اوپر حدیث میں بیان کردہ ارشادات فرماکر اُن کو نصیحت کی ۔

مذہب کے ماننے اور نہ ماننے کے حوالے سےانسانی زندگی دوانتہاؤں سے متاثر ہوتی ہے۔ایک کو"رہبانیت"کہا جاتا ہے جس کے بارے میں درجہ بالا اسلامی تعلیمات ہمارے سامنے آگئیں اور دوسری انتہا"اللہ فراموشی"ہے جس میں انسان اپنی زندگی کو کسی بھی مذہبی تعلیمات کا پابند بنانے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں ہوتا۔یہ دونوں "انتہائیں"غلط اور قابل مؤاخذہ ہیں۔

اب جب ہم اقوامِ متحدہ کے اس عالمی منشور کو دیکھتے ہیں تو اس میں واضح طور پر ثانی الذکر موضوع کے اشارات ملتے ہیں۔کیونکہ کسی بھی لفظ سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس منشور پر عمل کرنے کے نتیجے میں مذہب انسان کو کیا دے گا ؟یا عمل نہ کرنے کی صورت میں مذہب کیاسزا تجویز کرتا ہے خلاصہ یہ کہ اس منشور میں " اللہ پرستی" کا کوئی تصور نہیں ہے۔

اللہ پرستی کا تصور اس لیے بھی انسان کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ انسان(انفرادی یا اجتماعی طور پر) جب کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ وقتی حالات کے پیش نظر کرتا ہے اور حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب کیسے حالات پیدا ہوتے ہیں اس وجہ سے انسانی کوششوں کوحتمی نہیں کہا جا سکتا ۔اس کے برعکس اللہ پرستی کے اصول کے تحت شریعت میں انسانی حالات کے بارے میں جو فیصلہ ہوتا ہے وہ صرف وقتی حالات کے پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ انسان کےمستقبل کے حالات کے لیے بھی ہوتاہے اس وجہ سے وہ فیصلے"حتمی" ہوتے ہیں۔کیونکہ اللہ کو پتہ ہے کہ آئندہ کے لیے اس انسان کے لیے کیا کرنا ہوگا؟حالات کیسے پیدا ہوں گے؟ان سب سے عہدہ براں ہونے کے لیےجو اصول ہوتے ہیں وہ اللہپرستی ہی کے تصور کو ماننے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ۔اگرچہ انسانی ذہن اس کو قبول نہ کرے یا سمجھ نہ آئے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد ذکر کرکے اسلام نے معاشرے میں اعتدال قائم کرنے کی بنیاد رکھی ہے ۔ "اللہ فراموشی"آج کی کوئی نئی بات نہیں ہے اسلام آنے سے پہلے بھی اور آج بھی یہ تصور موجودہے۔جب حقوق اللہ کی بات کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ "اللہ"کو کیا ضرورت ہے؟اللہ تو اللہ ہے ہی ،کوئی اُس کی عبادت کریں یا نہ کریں کوئی اُس کا کچھ نہیں

---

[1]بخاری،کتاب الصوم ،باب حق الجسم فی الصوم،رقم:1975

بگاڑ سکتا۔اس کے برعکس ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپس کے حقوق کو ادا کرو کیونکہ یہ ادا نہیں ہوں گے تو نقصان پیدا ہو جائے گا ۔اسلام نے جو تصور پیش کیاوہ اِس افراط وتفریط سے ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ "عالمی منشور برائے انسانی حقوق "کا مسودہ مغربی فلسفے کے بنیاد پر بنایا گیا ہے جس میں خالقِ کائنات سے مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔علومِ وحی سے استفادہ نہ کرکے یہ منشور "حقیقی انسانی فلاحی منشور" کہلا نے کا مستحق نہیں ۔

معاشرے میں بسنے والے لوگوں کی کیا خواہشات ہیں ؟ اور وہ اپنی خواہشات کوکیسے پوری کریں؟"عالمی منشور "میں صرف اسی بات کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ لہذااس منشور کی رو سے ہر وہ کام ہوجانا چاہئیے جو معاشرے کے افراد چاہتے ہوں ۔چاہے وہ دوسروں کے لیے فائدہ مند ہو یا نقصان دہ۔جبکہ اسلام معاشرے کی بنیاد اپنی پسند وناپسند کے بجائے علوم وحی پر رکھتا ہے ،جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> " اور اللہکے نازل کردہ حکم کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی مرضی کی پیروی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا تاکہ اللہکے نازل کردہ حکم سے کہیں یہ لوگ تم کو بہکانہ دیں اگر یہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ ان کے بعض گناہوں کے سبب ان پر مصیبت نازل کرنا چاہتا ہے اور زیادہ تر لوگ تواطاعت کرنے والے نہیں ہیں"[1]

یعنی حقوق العباد اللہ تعالی کے حکم کے مطابق ادا کرنے چاہئیے نہ کہ افراد کی پسند وناپسند کے مطابق۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اسلام افراد کی پسند کو یکسر مسترد نہیں کرتا بلکہ جہاں انسان کی پسند"حق" کے خلاف ہو وہاں اسلام اسے قبول نہیں کرتا جیسا کہ باری تعالی کا ارشاد ہے:

> " اور حق کے مقابلے میں ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو"[2]

فصل دوم

---

[1] المائدہ49:5
[2] المائدہ48:5

عالمی منشور برائے انسانی حقو ق 1948ءدفعہ 1تا دفعہ 10کا سیرت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ

عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء کادفعہ نمبر1:

"تمام انسان آزاد پیدا کئے گئے ہیں۔عزت،آبرو اور حقوق کے حوالے سے تمام انسان برابر ہے،انسان کو چونکہ عقل اور ضمیر(کی نعمت)دی گئی ہے اس وجہ سے اُس پر لازم ہے کہ وہ دوسرے انسان کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھیں"۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ:

اس فصل کے دفعات (1تا10) میں فرد کی عزت، آزادی،بلاتفریق(جنس ،رنگ، نسل اورمذہب کے) برابری،جان اور مال کاتحفظ،جسمانی سزا، غلامی کی نفی اورحقوق نہ ملنے یا غصب ہو نے کی صورت میں عدالت سے رجوع کا تذکرہ ہے۔یہاں ہم دفعہ نمبر1 پر بات کریں گے۔

حقوق کے حوالے سے ایک بات ذہن میں رہے کہ اقوامِ متحدہ نے مغربی فلسفے کی روشنی میں حقوق کا جوذکر کیا ہے وہ مانگنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس میں فرد کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تمہارا یہ حق ہے جب کہ اسلام حقوق دینے کا درس دیتا ہے۔یہی سے یہ فرق واضح طور پر نظر آتا ہے کہ مغرب حقوق لینے کی بات کرتا ہےجب کہ اسلام حقوق دینے کا درس دیتا ہے کہ تمہارے ذمے فلاں کا یہ حق ہے اسے ادا کرو ۔اب اگر اس فرق کے نتیجے پر غور کیا جائے تودونوں میں زمیں وآسماں کا فرق نکل آئے گا کہ جب معاشرے کے تمام افراد مانگنے پہ آجائیں گے تو اُس معاشرے کی حالت کیسے دگرگو ں ہوگی۔اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جب معاشرے کے تمام افراد حقوق ادا کرنے پہ آجائیں تو کیسا فلاحی اور کامیاب معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

انسانی جان،عزت اور قانونی حیثیت کے حوالے سے اسلامی تعلیمات بالکل واضح اور انصاف کے حامل ہیں۔اس میں کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔

انسان کی عزت اور اس کی توقیر: دفعہ نمبر 1 میں انسان کی عزت وتکریم کے بارے میں کہا گیا ہے ۔سواس حوالے سے اسلام نےایک جامع قانون دیا ہے جیسا کہ قُرآن فرماتا ہے:

"اورانسان کو ہم نے کو عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں(سامان وغیرہ اُٹھانے کے لیے) سواری دی اور پاکیزہ رزقدی اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"[1]

یہاں بحیثیت انسان کوئی فرق نہیں ہے کہ صرف مسلمانوں کو یہ سہولیات میسر ہوں بلکہ حکم عام ہے مسلمان اور کافر سب کو شامل ہے کہ ہر کسی کو اللہ تعالی نے معزز ومکرم پیدا فرمایا ہے۔

اسلام میں انسانی مساوات کے بارے میں باربار ہدایات دی گئی ہیں جن پر عمل پیرا ہونا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دوسرےخلیفہ تھے۔ایک اُن کے کسی گورنر نے ایک شخص کو بلاوجہ مارا۔عمر رضی اللہ نے اُسے طلب کرکے باقاعدہ پوچھ گچھ کی اورپھر اُس کی سرزنش بھی کی جیسا کہ منقول ہے:

"مصر کا ایک شخص سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گورنر کے بیٹے کے شکایت لے کر آئے۔کہ ہم ایک مقابلے میں شریک تھے جس میں گورنر کا بیٹا بھی شریک تھا۔میں مقابلہ جیتا تو وہ مجھے کوڑے سے مارنے لگا اور کہتا رہا کہ میں عزت مند خاندان سے ہوں۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گورنر کو بیٹے سمیت طلب کیا۔بھرے دربار میں مصری کو کہا گیا کہ یہ کوڑا لو اور اسے مارو۔اور کہتے رہے کہ"ابن الالیمین"کو مارتے رہو۔انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اُسے مارتے مارتے دیکھتے رہے۔یہاں تک کہ ہم یہ تمنا کرتے رہے کہ اب بس ہونا چاہئیے۔پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اُس مصری کو کہا کہ اب عمرو(رضی اللہ عنہ)کی بھی خبر لو۔مصری نے کہا :امیر المؤمنین اس کے بیٹے نے مجھے مارا تھا۔میں نے اس سے بدلہ لیا(اُس کے والد سے میرا کیا لینا دینا ہے؟)۔پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمرو رضی اللہ کو مخاطب کرکے فرمایا:تم لوگوں نے کب سے دوسرے لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے حالانکہ اُن کے ماؤں نے اُنہیں آزاد جنے ہیں۔عمرو رضی اللہ کہنے لگے:امیرالمؤمنین نہ مجھے اس مصری پر ظلم ہونے کےبارے میں کچھ علم تھا اور نہ ہی یہ شخص میرے پاس آیا تھا"۔دیکھیے یہاں گورنر کے بیٹے کو سزا بھی دی اور فرمایا:" مذکم تعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا

---

[1] الاسراء70:17

آپ لوگوں نے کب سے آزاد لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے؟"[1]

اب ہم عالمی منشور کے دفعہ نمبر 1 کا سیرتِ طیبہ کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو رائے نہیں کہ انسانوں میں مساوات ہو۔بلکہ دنیا کے کسی بھی مذہب اور قانون سے بڑھ کر اسلام "مساوات" کا درس دیتا ہے۔تو اس دفعے اوراسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن منشور کی روشنی میں دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے اسلام میں ایک تحفظ ضرور ہے کیونکہ منشور کے اس دفعے میں تمام انسان عزت نفس کے اعتبار سے برابر ہیں۔اور وہ تحفظ یہ ہے کہ انسان کی دوحالتیں ہیں ایک حالت میں وہ تکریم کے لائق ہے چاہے کسی بھی مذہب،ملک،قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔اور دوسری حالت میں وہ اس تکریم کے قابل نہیں رہتا بلکہ وہ قابل مواخذہ ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں کا تذکرہ اسلامی تعلیمات میں موجود ہیں ۔ بطور تمہید اس حوالے سے کچھ اسلامی تعلیمات ذکر کرتے ہیں اس کے بعد اس دفعے کی طرف آتے ہیں۔

قُرآن کریم میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے :

"بے شک ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔پھر ہم نے اس کی(وہ بہترین) حالت کو بدترین حالت میں تبدیل کردیا"[2]

اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ :

"یہی چیز ہے جس پر قسم کھایا گیا ہےکہ:اللہ تعالی نےانسان کو اچھی شکل و صورت میں درست قد و قامت والا،صحیح اورمتناسب اعضاء والا خوبصورت اور پیارے چہرے والا پیدا کیا پھر انسان کو اپنے اعمال کے نتیجے میں نیچوں کا نِیچ کر دیا یعنی دوزخی ہو گیا، اگر اللہ تعالی کی اطاعت اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری نہ کی تو اسی لیے مسلمانوں کو اس سے جدا کر لیا"[3]

"بعض علماء کاقول ہے:اس کا مطلب انتہائی بڑھاپے کی طرف لوٹا دینا ہے[4] "سیدنا عکرمہ[5] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں " قرآن جمع کرنے والا اس انتہائی رذیل عمر کو نہ پہنچے گا"۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کوترجیح دی ہے۔ اگر ہم اس قول کو لیتے ہیں کہ اس سے یہی بڑھاپا مراد ہے تواس کے بعد والی آیت میں مومنوں کا استشناء کیوں کیا جاتاہے؟کیونکہ بڑھاپا تو(کفار

---

[1]عبدالرحمان بن عبداللہ،ابن عبدالحکم،فتوح مصر واخبارھا،ج1،ص183،دارالفکر،بیروت،1416ھ

[2]التین 95 :5،4

[3]تفسیر ابن کثیر،ج4،ص435

[4] یہ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عکرمہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔نفس مصدر

[5]عکرمہ بن ابی جہل عمروبن ہشام بن المغیرہ القرشی المخزومی ہے ترمذی نے آپ سے روایت کی ہے،فتح مکہ کے بعد اسلام لایا ۔62 سال کی عمر میں یرموک کے جنگ میں شہید ہوئے۔الأعلام للزركلي،ج4 ،ص 244۔سیرأعلام النبلاء،ج1 ،ص 323

کے علاوہ) مومنوں پر بھی آتا ہے اس وجہ سے درست بات وہی ہے جو اوپر ہم نے ذکر کی ہے"[1]

دوسری جگہ ارشاد ہے جو کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ:"اور انسان کو ہم نے کو عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں(سامان وغیرہ اُٹھانے کے لیے) سواری دی اور پاکیزہ رزق دی اور(اُن کو) اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"[2]

اس کے وضاحت کرتے ہوئے علماء کہتے ہیں کہ:"(تمام مخلوقات میں)سب سے بہترین پیدائش انسان کی ہے جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں "ہم نے انسان کو بہترین صفت پر پیدا کیا ہے۔"کیونکہ یہ انسان جو صحیح چال چلتا ہے یہ اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہونے کی وجہ سے ہے ، اپنے ہاتھوں سے آداب کے ساتھ اپنا خوراک کھاتا ہے اور(اس کے بر عکس) حیوانات ہاتھ پاؤں سے چلتے ہیں منہ سے خوراک(چاراوغیرہ)کھاتے ہیں۔ پھر(دوسرے مخلوق کے برعکس) انسان کو سمجھ بوجھ کی نعمت دی ہے جس کے ذریعےسے انسان اپنےنفع نقصان اوراچھائی برائی سوچ کر کام کرتا ہے، اسی طرح وہ اپنی دینی اور دنیاوی فائدہ معلوم کر لیتا ہے۔انسان کی(سہولت کے خاطر سفر میں آسانی کے لیے)بحروبر میں سواری کا انتظام فرمادیا جو کہ خشکی میں گھوڑے ، چوپائے ، خچر اونٹ اور دوسرے جانور وغیرہ اورپانی میں سفر کے لیے کشتیاں وغیرہ انسان کوبنانی سکھا دیں۔ انسان کوبہترین، خوش ذائقہ اور خوشگوارخوراکی اشیاء دیں۔یہ کھیت ہے، وہ پھل ہیں، ، دودھ ہے ، گوشت ہے اور بہت سے دیگر بہترین، لذیذ، مزیدار اور ذائقے داراشیاء ہیں۔ (اس کے علاوہ سکونت اختیار کرنے کے لیے)اچھے اچھےمکانات ،(زیب تن کے لیے) اچھے خوشنما لباس ،ہرطرح کے، یہاں وہاں کی اشیاء یہاں سے وہاں لے جانے اور لے آنے کے اسباب اس کے لیے مہیا کر دیئے اور تمام مخلوق میں سے عموماً ہرکسی پر اسے فضیلت بخشی"[3]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر ابن کثیر،ج4،ص435
[2] الاسراء70:17
[3] ابن کثیر،ج5،ص97

علماءاس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان ملائکہ سے برتر ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے اللہ تعالی سے کہا کہ تو نے بنی آدم کو دنیا(نعمتیں) دے رکھی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان کھاتے پیتے ہیں اور(کپڑے)پہنتے ہیں۔ اس کے بدل میں ہمارے لیے آخرت میں ہی عطا فرما کیونکہ دنیا میں تو ہم ان نعمتوں سے محروم رہے ہیں۔ اللہ تعالی نے جواباًارشاد فرمایا :مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم اس (آدم)کی نیک اولاد کو جسے میں نے اپنے(قدرت کے) ہاتھ سے پیدا کیا،ہرگز اُس مخلوق کےبرابر نہیں کروں گا جس (مخلوق کو) میں نے " کن " کےکلمہ سے پیدا کیا ہے"[1]،[2]

ایک دوسری روایت میں ہے :

"سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:فرشتوں نے اللہ تعالی سے عرض کیا:یا اللہ: تو نے ہمیں بھی اور آدم اور اُس کے اولاد کو بھی پیدا فرمایا ، بنی آدم کو تو کھانا دیتا ہے پینا دیتا ہے ، پہننے کے لیے کپڑے وہ پہنتے ہیں، (خوشیاں وہ مناتے ہیں جیسا کہ)نکاح شادیاں وہ کرتے ہیں،(سفر میں آسانی کی خاطر) سواریاں ان کے لیے ہیں، آرام وراحت ان کو حاصل ہے، ان (مذکورہ نعمتوں میں) ہم کسی بھی چیز میں حصے دار نہیں۔ اگر دنیا میں(یہ تمام نعمتیں) ان کے لیے ہیں تو یہ اشیاء آخرت میں تو ہمیں مرحمت فرما دیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس (مخلوق کو) میں نے اپنےدستِ قدرت سے پیدا کیا ہے اور جس میں اپنی روح پھونکی ہے اس مخلوق کومیں اس (مخلوق)جیسا نہیں کروں گا جسے میں نے حکم دیا کہ "ہو جاؤ"اور وہ ہو گیا"[3]،[4]

اورابن کثیر نےایک روایت نقل کی ہے:"نبی علیہ السلام نے فرمایا:اللہ جل شانہ کے دربار میں قیامت کے دن انسان سے زیادہ فضیلت والاکوئی نہ ہو گا۔جب پوچھا گیا کہ فرشتے بھی نہیں؟

---

[1]المعجم الکبیر،ج20،ص116

[2]یہ روایت مرسل ہے لیکن دوسرے سند سے متصل بھی مروی ہے۔ تفسیر ابن جریر الطبری،ج15،ص126

[3]احمد بن حسین،البیہقی،شعب الایمان،الایمان بالملائکۃ،فصل فی معرفۃ الملائکہ،رقم:147،مکتبۃ الرشدللنشر،الریاض،1423ھ

[4]قال الالبانی:ضعیف،سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ،ج10،ص733

جواب نہ دے (بلکہ خیر بھی نہیں کیونکہ)وہ تو مجبور ہیں
جیسے چاند، سورج وغیرہ"[1]

اللہ تعالی کا ایک اور ارشاد ہے:" بے شک سب سے زیادہ عزت والا تم میں سےاللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے سب سے خبردار ہے"[2]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین لکھتے ہیں:.امام قتادہ رحمہ اللہ [3]اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں :سب سے بہترین عزت"تقوٰی ہے اور سب سے بدترین بے عزتی"گناہ"ہے"[4]

ایک حدیث میں ہے:"سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ[5] کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"حسب"مال کو کہتے ہیں اور "کرم"سے مراد تقویٰ ہے "[6]،[7]

اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد: دنیاکی عزت "مال داری " اور آخرت کی عزت "تقوٰی" ہے"[8]

ایک روایت میں ہے:

> "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن نبی علیہ السلام نے اپنی سواری پر خانہ کعبہ کا طواف فرمایا اپنے لاٹھی سے ارکانِ خانہ کے استلام فرماتے رہے پھر جب واپس ہوئے تو سواری کے ٹھہرانے کے لیے جگہ نہ پائے۔نیچھے تشریف لائے۔پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمانے لگے۔حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا"تمام تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہیں جس نے تم لوگوں سے جاہلیت کا تکبر دور کیا۔لوگ دو قسم پر ہیں ایک قسم وہ ہے جو نیک اور متقی ہو وہ اللہ کے نزدیک "معزز" ہے اور دوسرا قسم گناہ گا بد بخت ہے جو اللہ کے دربار میں"کچھ"بھی نہیں ہے"[9]

اوربخاری کی روایت ہے:

> " ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامسے کسی نے سوال کیا کہ انسانوں میں کون سب سے زیادہ شریف ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ

---

[1]ابن کثیر،ج5ص98

[2]الحجرات13:49

[3]قتادہ بن دعامہ بن قتادہؒ ہیں۔صحاح ستہ کے راوی ہیں۔محدثین نے آپ کو ثقہ کہا ہے۔شیوخ میں انس بن مالکؓ،حسن بصریؒ اور حبیب بن سالمؒ جبکہ تلامذہ میں حماد بن سلمہؒ سعید بن ابی عروبہؒ اور خالد بن قیس الحدانیؒ شامل ہیں۔ 118ھ/737ء میں وفات پائی۔الذہبی،سیر اعلام النبلاء،ج9،ص323۔الزرکلی،الاعلام،ج11،ص216۔ابن حجر،تہذیب التہذیب،ج8،ص355۔

[4] الحسین بن مسعود،البغوی،معالم التنزیل،ج13،ص348،دار طیبۃ للنشروالتوزیع،1417ھ

[5]سمرہ بن جندب بن ہلال بن خدیج الفزاری ہے۔رسول اللہ ﷺ کاق ایک معزز صحابی ہے ۔58ھ کو یا 59ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔آپ سے بخاری، مسلم،ابوداود،ترمذی،نسائی،ابن ماجہ وگیرہ نے روایتیں کی ہیں ۔آپ اُحد میں شریک ہوئے،پھر بصرہ کو منتقل ہوئے اور وہاں وفات پاگئے۔(الطبقات الکبری، ج7 ،ص 36۔ الاصفہانی، معرفۃالصحابۃ،ج3 ،ص 1415)

[6] سنن ترمذی،تفسیر القرآن،سورۃ الحجرات،رقم:3271

[7] قال الالبانی :صحیح،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج7،ص271

[8]حسین بن مسعود ،بغوی ،شرح السنۃ،ج13،ص123،مکتب اسلامی، بیروت ،طبع دوم 1983م

[9] حسین بن مسعود ،بغوی ،شرح السنۃ،ج13،ص123

شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے سوال کا مقصد یہ نہیں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر سب سے زیادہ شریف یوسف علیہ السلام ہیں »نبي الله ابن نبي الله ابن نبي الله ابن خليل الله«۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارے سوال کا یہ بھی مقصد نہیں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اچھا، عرب کے خاندانوں کے متعلق تم معلوم کرنا چاہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ جاہلیت میں جو لوگ شریف سمجھے جاتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہ شریف ہیں، جبکہ دین کی سمجھ بھی انہیں حاصل ہو جائے"[1]

اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اس حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتا ہے"[2]

اسی طرح کے انسانوں کے بارے میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"یہ لوگ بالکل چوپایوں کی طرح ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ۔یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ اس کے تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"(اس مکرم ومعزز انسان نے جب اپنا مقصدِحیات پس پشت ڈالا تو اُس کی حیثیت چوپایوں کی ہوگئی)کیونکہ یہ لوگ درست سمت کی طرف نہیں جارہے۔اس وجہ اِن کی حیثیت جانوروں جیسی ہو گئی۔کہ اِن کا غرضِ زندگی صرف کھانا پینا رہ گیا۔چوپائے تو کیا ایسے لوگ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ چوپائے تو پھر بھی اپنے نفع،نقصان اور اپنے مالک کو جانتے ہیں،جبکہ یہ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے۔امام عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں :چوپائے (اپنی حیثیت کے مطابق)اللہ کی معرفت رکھتے ہیں جبکہ کافرنہیں رکھتے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ:چوپائے اللہ تعالی کے فرمان بردار ہیں جبکہ کافر نافرمان ہیں۔(أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ)کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں نے تدبر اور سوچ چھوڑدیا ہے اور جنت جانے اور جہنم سے بچنے سے اعراض کرنے والے ہیں"[4]

---

[1] بخاری،کتاب التفسیر،باب لقد كان في يوسف ،رقم:4689

[2] مسلم ،کتاب البر والصلة والادب،باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله،رقم:6708

[3] الاعراف7:179

[4] تفسیر قرطبی،ج7،ص325،324

اس تمہید کے بعدمنشور کے اس دفعے کی تطبیق میں "عالمی منشوربرائے انسانی حقوق اور اسلام کا تصادم نظرآتا ہے۔منشور میں نفس انسان کی تکریم وتوقیر کی بات کی گئی ہے جبکہ اسلام میں توقیر وتکریم کا معیار"تقوٰی" ہے۔جرم کے مرتکب شخص اورغیر مجرم دونوں کی عزت یکساں نہیں ہے۔اسلام یہ اصول سکھاتا ہے کہ معاشرے کو تباہی کی طرف لے جانے والا اُس شخص کی طرح تکریم کے لائق نہیں ہے جس طرح ایک مفید شہری لائق تحسین ہوتا ہے۔جرم چھوٹا ہو یا بڑا،انفرادی ہو یا اجتماعی،قتل کا ہو یا کسی دوسرے معاشرتی جرم کا ارتکاب ہو اس کے مرتکب لوگ اُن لوگوں کی طرح توقیر وتکریم کے مستحق نہیں ہیں جواِن تمام برائیوں سے دور پُرامن طریقے سے رہنے والے ہوں جبکہ اس دفعہ کے تحت پھر کہاجاتا ہے کہ مجرم خواہ کتنا ہی قابل مواخذہ جرم کر بیٹھا ہو اُسے ایسی سزا نہیں دینی چاہئیے جس سے اُس کی تذلیل ہوتی ہو۔یہ منشور ہر حال میں انسان کی عزت وتوقیر کے قائل ہے لیکن اسلام کی نظر میں ایسا نہیں ہےکیونکہ اگر مجرم اور غیر مجرم ایک جیسی عزت وتوقیر کے لائق قرارپائیں تو پھر دنیا میں جرائم کا روک تھام کیسےہو گا؟کردار کی بنیاد پر اسلام افراد کے درمیان عزت وتکریم میں فرق کا قائل ہے۔ورنہ جیسے پہلے عرض کیا گیا کہ اسلام اور اس پہلے دفعہ کے درمیان کوئی تصادم نہیں ہے لیکن اس دفعے کے بنیاد پر جو تطبیقات ہوتے ہیں اس میں اسلام مجرم اور غیر مجرم کی یکساں توقیر کا قائل نہیں ہے۔

دفعہ نمبر:۲

ہرانسان کو حق حاصل ہے کہ وہ اس ڈیکلریشن میں ذکر شدہ تمام حقوق اور آزادیوں سے بلاتفریق فائدہ حاصل کریں۔بلاتفریق(امتیاز)سے مرادرنگ،نسل،زبان،قوم،سیاسی یامذہبی اوردیگر نظریات،وطن،معاشرہ،دولت یا پیدائش کی تمیز وشناخت ہے،اس کے ساتھ جو کوئی جہاں سے بھی تعلق رکھتا ہے اسکی سیاسی کیفیت دائرہ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پراس سے کوئی الگ سلوک نہیں کیا جائے گاچاہے وہ ملک یاعلاقہ آزاد ہویاتولیتی ہو یاغیر مختار ہویاسیاسی طورپر کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

<u>سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کا جائزہ:</u>اس دفعے میں ایسا کوئی سقم نہیں ہے جو اسلامی تعلیمات کے کسی شق سے متصادم ہو۔کیونکہ سیرت طیبہ کی مثال ہمارے سامنے ہے،جس میں عملاً دنیا کو یہ سکھلایا گیا ہے کہ تمام حقوق سب کے لیے برابر ہیں۔عربی ہو،عجمی ہو،گورا ہو ،کالا ہو،افریقہ سے تعلق رکھتا ہو،یورپ کا ہو یاامریکی ہو، تمام انسانی حقوق میں سب برابر ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق کسی بھی سیاسی نظرئے سے ہو،کسی بھی ملک کی شہریت رکھتا ہو،کسی بھی طرزحکمرانی کا قائل ہو،شہنشائی نظامِ حکوت کے تحت زندگی گزارتا ہو ،جمہوری طرز حکومت کے تحت ہو یاکسی اور طرزحکومت کاپابند ہو،تمام صورتوں میں تمام لوگ(مردہو،عورت ہو،بچہ ہو،جوان ہویابوڑھا ہو)تمام انسانی حقوق میں برابر ہوتے ہیں ۔جیسا کہ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے کھلے الفاظ میں ارشاد فرمایا:

> "اے لوگو!تمہارا رب ایک ہے۔خبردار!کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔(کیونکہ اللہ جل شانہ کاارشاد ہے)بے شک تم میں سے سب سے زیادہ فضیلت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو"[1],[2]

دفعہ نمبر:۳

ہر شخص کواپنی جان،آزادی اورذاتی تحفظ کا حق ہے۔

---

[1]شعب الایمان،ج7،ص132،رقم:4774

[2]علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔فتح الباری ج6،ص527

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کا جائزہ: اس دفعے میں کسی کی جان(زندگی)اوراُس کا تحفظ بیان کیا گیا ہے۔اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کسی بھی انسان کی جان کی تحفظ کی بات کرتی ہیں۔انسان تو انسان ہے اسلام تو حیوانات کے حقوق اوراُن کے تحفظ کی بات کرتا ہے۔ انسانی جان کے حوالے سے قُرآن فرماتا ہے:

" کسی کوناحققتل کرنے والا شخص یا ملک میں فساد پھیلانے کی سزا کی خاطر،ایسا ہے اُس نے گویا تمام لوگوں کوقتل کیا"[1]

اس قُرآنی حکم سے واضح ہوتا ہے کہ ناحق کسی ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔جس سے انسانی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایاکہ:

"جس نے ایک انسان بلا کسی قانونی سبب کے قتل کیا یا زمین میں بگاڑ پیدا کی اوراپنے اس فعل کو جائز اور حلال جانا یہ ایسا ہے گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کیا ۔کیونکہ ایک انسان اور تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے"[2]

اور روایت میں آتا ہے:

"سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جب باغی گھیر لیتے ہیں، تو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں میں ''آپ رضی اللہ عنہ کی طرف داری میں آپ رضی اللہ عنہ کے مخالفین سے لڑنے کیلئے آیا ہوں، آپ رضی اللہ عنہ ملاحظہ فرمائیے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے''۔ یہ سن کر معصوم خلیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''کیا تم اس بات پر آمادہ ہو کہ سب لوگوں کو قتل کر دو، جن میں ایک میں بھی ہوں''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''نہیں نہیں''۔ فرمایا ''سنو ایک کو قتل کرنا ایسا برا ہے جیسے سب کو قتل کرنا۔ جاؤ واپس لوٹ جاؤ، میری یہی خواہش ہے اللہ تمہیں اجر دے اور گناہ نہ دے''، یہ سن کر آپ رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے اور نہ لڑے"[3]

اورابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"یعنی انسانیت کو زندگی دینے کا مطلب یہ ہے کہ بلاکسی حق کے کسی کا خون نہ کیا جائے یہ ایسا ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دی۔ جس نے انسانیت کے ناحق قتل کو ناجائز اور حرام جانا اسی نظرئے کی بنیاد پرانسانیت کی زندگی کا تحفظ ہوجاتا ہے(مطلب یہ ہے کہ قتل کا اجر دنیا کی بربادی کا باعث ہے اور اس کی روک لوگوں کی زندگی کا سبب ہے)"[4]

ایک جگہ ارشادہے:

---

[1] المائدہ5:32

[2] ابن کثیر،ج3،ص92

[3] احمد بن مروان،الدینوری،المجالسۃ وجواھرالعلم،ج2،ص160دار ابن حزم:بیروت،1419ھ

[4] ابن کثیر،ج3،ص92،93

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں .ناحق ایک کا قتل پوری انسانیت کی قتل ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ [1]فرماتے ہیں
''ایک مسلمان کا خون حلال کرنے والا تمام لوگوں کا قاتل ہے اور ایک مسلم کے خون کو بچانے والا تمام لوگوں کے خون کو گویا بچا رہا ہے"[2]

اور طبری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے:
"نبی علیہ السلام کو اور عادل مسلم بادشاہ کو قتل کرنے والے پر ساری دنیا کے انسانوں کے قتل کا گناہ ہے اور نبی اور امام عادل کے بازو کو مضبوط کرنا دنیا کو زندگی دینے کے مترادف ہے"[3]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:
"ایک کو بے وجہ مار ڈالتے ہی جہنمی ہو جاتا ہے گویا سب کو مار ڈالا۔مجاہد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں ''مومن کو بے وجہ شرعی مار ڈالنے والا جہنمی دشمن رب، ملعون اور مستحق سزا ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ سب لوگوں کو بھی مار ڈالتا تو اس سے زیادہ عذاب اسے اور کیا ہوتا؟ جو قتل سے رک جائے گویا کہ اس کی طرف سے سب کی زندگی محفوظ ہے"

اور بعض [4]فرماتے ہیں کہ:

"اور ایک روایت میں مجاہد رحمہ اللہ کاقول ہے"اس آیت کی تفسیر میں حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ایک قتل کے بدلے ہی اس کا خون حلال ہو گیا، یہ نہیں کہ کئی ایک کو قتل کرے، جب ہی وہ قصاص کے قابل ہو، اور جو اسے زندگی دے یعنی قاتل کے ولی سے درگزر کرے اور اس نے گویا لوگوں کو زندگی دی"۔ اورمجاہد کا قول ہےکہ جس نے انسان کی جان بچا لی مثلاً ڈوبتے کو نکال لیا، جلتے کو بچا لیا، کسی کو ہلاکت سے ہٹا لیا۔حسن اور قتادہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں :اس میں اشارہ ہے کہ قتلِ ناحق ایک عظیم (گناہ کاکام)ہے۔قتادہ رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں۔اللہ کی قسم انسان کا قتل اور بچاؤ بہت بڑےکام ہیں"[5]

انسانی عظمت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے روایت میں آتا ہے:

---

[1]سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی ہیں۔کبار تابعین میں سے ہیں۔ صحاح ستہ کے راوی ہیں۔محدثین نے آپ کو ثقہ کہا ہے۔شیوخ میں عبداللہ بن زبیرؓ،عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ جبکہ تلامذہ میں بکیر بن شہابؒ،حبیب بن ثابتؒ اور ثابت بن عجلانؒ شامل ہیں۔ 95ھ/714ءمیں وفات پائی۔(الذہبی،سیر اعلام النبلاءج7،ص355۔الزرکلی،الاعلام،ج6،ص242۔تہذیب التہذیب،ج11،ص17)۔

[2] ابن کثیر،ج3،ص93

[3] طبری،ج10،ص233

[4] یہ عبد الرحمن بن زید بن أسلم کا قول ہے۔ابن کثیرج3،ص93

[5] ابن کثیرج3،ص93

ایک مرتبہ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے درخواست کی کہ نبی علیہ السلام مجھے کوئی ایسی بات بتائیں کہ میری زندگی با آرام گزرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :کیا کسی کو مار ڈالنا تمہیں پسند ہے یا کسی کو بچا لینا تمہیں محبوب ہے؟ جواب دیا بچا لینا، فرمایا :بس اب اپنی اصلاح میں لگے رہو "[2]

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی علیہ السلام نے پوری انسانیت کے بچاؤ اور قتلِ ناحق کی حُرمت کے سلسلے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہ دسویں تاریخ کو نبی علیہ السلامنے منیٰ میں خطبہ دیا، خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا لوگو! آج کون سا دن ہے؟ لوگ بولے یہ حرمت کا دن ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا اور یہ شہر کون سا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حرمت کا شہر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ مہینہ کون سا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حرمت کا مہینہ ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس تمہارا خون تمہارے مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن کی حرمت، اس شہر اور اس مہینہ کی حرمت ہے، اس کلمہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار دہرایا"[3]

اور اسی بخاری کی دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے:"یہاں"أَبْشَارَكُمْ" سے مراد یہ ہے کہ کسی کا چمڑا بھی کسی دوسرے انسان کے لیے جائز اور حلال نہیں ہے"[4]

دفعہ:۴

کسی کی آزادی سلب کرکے غلام یا لونڈی نہیں بنایا جائے گا۔غلامی اور انسانی تجارت کی ہر ممکنہ صورت ممنوع ہے۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کا جائزہ:اس دفعے میں غلامی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

غلامی کے حوالے سے مغربی دنیا اسلام پر اعتراض کرتی ہے کہ ہم غلامی کا خاتمہ چاہتے ہیں ،اور تم بھی اس بارے میں ہم سے متفق ہوں لیکن عملاََ مسلمان دنیا میں "غلامی" کا تصور دیتا ہے۔اور وہ اس طرح کہ آج بھی تم مسلمان اپنے اداروں میں قُرآن کی وہ آیات

---

[1]ابو عمارہ حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم ؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی علیہ السلام کے چچا ہیں۔ مکہ میں 556ء کو پیدا ہوئے۔ قریش کے شرفاء میں سے ہیں۔ جنگ بدر اور دیگر غزوات میں شرکت کی۔ آپ بہت شجاع تھے۔ جب ایمان لے آئے تو ابو جہل کے سامنے جاکر اپنے ایمان کا اظہار کیا ۔ آپ 3ھ/625ءکو جنگ احد میں شہید ہوئے۔(ابن عبدالبر،الاستیعاب ،ج1،ص109۔ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج2،ص121۔ الزرکلی، الاعلام، ج5،ص236)

[2]مسند احمد بن حنبل،ج2،ص175،رقم:6639

[3]بخاری،کتاب الحج،باب الخطبۃ فی ایام منی،رقم:1739

[4]بخاری،کتاب الفتن،باب قول النبی لاترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض،رقم:7078

اوراحادیث پڑھا رہے ہوں جس میں "غلامی" کا تصور موجود ہیں جیسے.والمحصنت من النساءالآیۃ[1]

" اسی طرح قُرآن میں ہے کہ:الا علی ازواجہم اوماملکت ایمانھم الآیۃ"[2]

"یعنی قرآن،حدیث اور فقہ میں تم لوگ(مسلمان)غلام بنانے والی ذہنیت کا درس اب بھی دیتے ہو۔اسی وجہ سے فقہ میں "مکاتب"،"مدبر "اور "ام ولدہ" جیسے عنوانات پڑھاتے ہوں۔

اس بات پر مغرب بھی متفق ہے کہ "عالمی منشور برائے انسانی حقوق" کے حوالے سے تو مسلمان ظاہراََغلامی کے خاتمے پر ہمارے ساتھ کھڑے ہیں لیکن ذہن کے اعتبار سے آج بھی مسلمان "غلامی" کے خاتمے کے لیے تیار نہیں ہیں۔سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں ہے کہ مسلمان عملاََ(جسے مغرب ظاہراََ کہتے ہیں)غلامی کا خاتمہ چاہتے ہیں ۔اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جہاں بھی اسلامی دنیا نے اپنے دفاع کے لیے جتنی بھی جنگیں کی ہیں کسی ایک میں بھی مسلمانوں نے کسی ایک فرد مخالف کو بھی غلام نہیں بنایا ہے۔کشمیر[3]،

فلسطین[4]،روسی [5]استعمار کے وقت افغانستان وغیرہ میں کب سے آزادی کی جنگیں لڑی جاتی ہیں لیکن کہیں بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔کہ کسی کو غلام یا لونڈی بنایا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اسلامی تعلیمات میں "غلامی"کا درس دیا جاتا ہے،سو اس کے لیے مختصراََ عرض ہے کہ:آپ(مغرب والے) اسلام کوقریب سے سمجھنے کی کوشش کریں۔آپ کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات انسانوں کو "غلام"بنانے کا درس دیتی ہیں اس وجہ سے اِن تعلیمات میں ترمیم کردو یا اس کو اسلام سے نکال دو۔چاہے یہ قرآن میں ہو ،احادیث میں ہو یا فقہی کتب کے ذخیرے میں ہو۔اور اگرنکال نہیں سکتے تو کم از کم اس پر ایمان لاناچھوڑ دیں یا ان کی پڑھائی چھوڑ دیں۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے یہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالی کے احکامات اور نبی علیہ السلام کے فرامین میں ترمیم کرنے یا اُسی ختم کرنے کا اختیار کسی بھی فرد،سوسائٹی یا اتھارٹی کے پاس موجود نہیں ۔چاہے کتنا بڑا مدرسہ ہو،دارالعلوم ہو،یونیورسٹی ہو کسی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے۔اور مغرب کا یہ اعتراض کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ان کے اباءواجداد نے آج سے پندرہ صدی پہلے یہی بات کہی تھی جیسا کہ قُرآن میں ہے:

---

[1] النساء24:4

[2] المؤمنون6:23

[3] کشمیرکاعلاقہ پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔تقسیم سے پہلے یہ ایک آزاد ریاست تھی۔جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی ۔کشمیر کے راجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا جس کو عوام نے رد کیا۔مقبوضہ کشمیر پر بھارت جبکہ آزاد جموں وکشمیر پر پاکستان کی حکمرانی ہے ۔مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعہ کی اصل جڑہے اب تک دونوں ملکوں کے درمیان اس پر تین جنگیں(1947ء،1965ء،اور1999ء) ہوئیں ہیں۔بھارت اس وقت کشمیر کے زیادہ حصے پر جبکہ پاکستان کم حصے اور چین 37،555 مربع کلومیٹر پر قابض ہیں۔(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

[4] فلسطین:اہل کتاب(یہود ،عیسائی)اور مسلمانوں کے نزدیک مقدس سرزمین ہے ۔یہ علاقہ مصر اور لبنان کے درمیان واقع ہے ۔یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے ۔آج کل اس کے زیادہ حصے پر اسرائیل کی ناجائز حکومت قائم ہے ۔فلسطین کا صدر مقام بیت المقدس ہے۔بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

[5] روس:1979ء سے پہلے یہ سویت یونین کہلاتا تھایہ ایک یورپی ملک ہے۔جس کا دارالحکومت ماسکو ہے۔قومی زبان روسی ہے۔طرز حکومت نیم صدارتی ہے۔2015ء میں آبادی 144192450 تھی۔1979ء میں ہمسائے ملک پر حملہ کرنےکے بعد کچھ ریاستیں اس کے تسلط سے آزاد ہوئیں۔جن میں قازقستان،ازبکستان،تاجکستان،ترکمانستان اور آذربائیجان شامل ہیں(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن
لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ (یا تو)
اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ یا اس کو بدل دو"

یہ اُن لوگوں کی بات تھی لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالی کے ارشاد کو جواب کے طور پر ارشاد فرمایا:

" کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دو"[1]

دیکھیے یہاں اللہ کے رسول کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالی کے احکامات میں ردوبدل لائیں۔تو دوسرا کون قرآنی تعلیمات میں تبدیلی کا مجاز ہو سکتا ہے؟۔معلوم ہوا کہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے ایسے سوال کرنے والوں کا بس یہی:قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی" جواب ہوگا۔قرآن نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ آگے فرمایا:

میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے"[2]

میں صرف وحی الہی کا پابند ہوں کیونکہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتا جس کی اللہ تعالی کی طرف سے اجازت نہ ہو کیونکہ:

" اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے
عذاب سے ڈرتا ہو"[3]

قیامت کے دن اس کی جواب دہی ہوگی۔

اب اُن کے اعتراض کی طرف آتے ہیں۔کہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک ہونے کے ناطے تم سب پر لازم ہے کہ اس کے منشور پر مِن وعَن عمل کریں۔اس وجہ سے اب کیوں یہ موضوع علمی طور پر آپ لوگ باقی رکھے ہوئے ہیں؟کفارات،استیلاد،مکاتبت اور تدبیر کے مسائل کیوں مسلمانوں کے نصاب میں داخل ہیں؟اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ غلامی اپنی اصلی حقیقت میں کیا ہے ؟اور اس حوالے سے اسلام کا مؤقف کیا ہے؟

نبی علیہ السلام نے جب نبوت کا اعلان کیا تو اُس وقت کسی بھی انسان کوغلام بنانے کے تین طریقے تھے۔

1۔کسی طاقت ور انسان نے کمزور کو پکڑکر زبردستی غلام بنالیا۔آج کل کی اصطلاح میں اسے "بردہ فروشی "کہا جاتا ہے۔صحابہ میں سیدنا زید بن حارثہ[4] اور سیدنا سلمان فارس رضی اللہ عنہما ایسے ہی طریقے سے غلام بنائے گئے تھے۔آج بھی دنیا کے بعض علاقوں میں کسی کو"اغوا"کرکے آگے بیچ دیا جاتا ہے۔

2۔کسی انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا،یا اُس کے ذمے کسی کا کوئی "تاوان" ہوتا تو اپنے اپنے عدالتی نظام کے تحت اُس شخص کو سزا کے طور پر غلام بنا دیا جاتا تھا۔اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی بندہ (قرض وغیرہ کی وجہ سے)مجبورہو کر اپنے آپ کوکسی کی غلامی میں دے دیتا ۔

3۔تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگ میں مخالف فریق کے آدمی گرفتار ہوتے اُن کے متعلق فاتح قوم کی خواہش کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ۔ یاتو کچھ رقم لے کر چھوڑ دیا جاتا یا اُسے قتل کیا جاتا

---

[1] یونس15:10
[2] یونس15:10
[3] یونس15:10
[4] آپ زید بن حارثہ بن شراحیلؓ الکلبی ہیں۔جلیل القدر صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔سابقون الاولون میں سے ہیں۔حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے ۔رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کیا ۔آپ نے نبی علیہ السلام سے فیض حاصل کیا جبکہ آپ سے اسامہ بن زیدؓ،عبداللہ بن عباسؓ اور براء بن عازبؓ نے فیض حاصل کیا۔8ھ/629ء میں وفات پائی۔(اسد الغابہ،ج3،ص443۔الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج2،ص598۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص161)۔

یا اسے اپنے جنگی قیدی سے تبادلہ کرکے اُن کے حوالے کیا جاتا اوریا اسے قید کر لیا جاتا
۔قید ہونے کی صورت میں چونکہ اُس زمانے میں اجتماعی قید خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس وجہ اُن قیدیوں کو مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔اور وہی لوگ پھر اُن سے اپنی خدمت لیتے تھے۔

پہلی دو صورتیں تو اسلام نے قطعاًَ بند کردیں۔بردہ فروشی اور کسی کو تاوان میں غلام بنانے کو حرام قرار دیا۔جیسا کہ نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین طرح کے لوگ ایسے ہوں گے جن کا قیامت کے دن میں مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے میرے نام پر عہد کیا اور وہ توڑ دیا، وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور وہ شخص جس نے کوئی مزدور اجرت پر رکھا، اس سے پوری طرح کام لیا، لیکن اس کی مزدوری نہیں دی"[1]

اس حدیث میں "بردہ فروشی" کی صریح ممانعت آئی ہے۔اوریہ کوئی آج کا حکم نہیں بلکہ آج سے پندرہ سوسال پہلے دیا گیا ہے جس پر مسلمان پندرہ سو سال پہلےسے عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس کے مقابلے میں غلامی کو ختم کرنے کے نا م نہاددعوے داروں کا یہ حال تھا کہ صرف ایک صدی پہلے تک اُن کے انسانوں کی منڈیاں لگتی تھیں۔بلکہ امریکہ[2] میں تو گزشتہ صدی میں یہ بحث عام تھا کہ غلامی جائز ہے یا ناجائز ؟امریکہ کے شمال میں اٹلانٹا کے میدان میں جنگ کے بعد جب جنرل رابرٹ ایڈورڈلی نے ہتھیا ر ڈالے ۔تواسی جنگ کے زمانے میں امریکہ کے دانشوروں نے غلامی کے جواز ہر دلائل دیتے ہوئے کتابیں لکھیں۔1964ء تک امریکہ میں افریقی نسل کے لوگوں کے لیے ووٹ دینے کاحق نہیں تھا پھر ایک طویل عدالتی جنگ کے نتیجے میں وہ اس حق کے مستحق ٹھہرے۔ تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ اسلام نے سب سے پہلے غلامی کے ختم ہونے کا حکم دیا ہے۔لہٰذا اس بارے میں مغرب کا پروپیگنڈہ حقائق کے منافی اور جھوٹ پر مبنی ہے۔

غلام بنانے کا جوتیسراطریقہ ہے اس کو اسلام نے بطور ایک آپشن باقی رکھنے کی اجازت دی ہے۔کہ اسلام نے کسی جنگ میں آئے ہوئے قیدی کوغلام بنانے کو ضروری قرار نہیں دیا بلکہ اس کو حالات اور افراد پر چھوڑا ہے کہ وہ:کسی جنگی قیدی کوغلام بنانا چاہتے ہو ،قتل کرنا چاہتے ہو ،قیدی کے تبادلے کی صورت میں دینا چاہتے ہو ،فدیہ لے کر اُسے چھوڑ دینا چاہتے ہو یا بالکل مفت میں چھوڑ دینا چاہتے ہو یہ سب طریقے وقت اور حالات کو دیکھ کر اختیار کئے جا سکتے ہیں ۔اور ان طریقوں کے بارے میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

---

[1] بخاری،کتاب البیوع،باب اثم من باع حرا،رقم"2227

[2] ریاستہائے متحدہ امریکہ United States of America :یہ ملک براعظم شمالی امریکہ میں واقع ہے۔امریکہ کے شمال میں کینیڈا،جنوب میں میکسیکو،مغرب میں بحرالکاہل اور مشرق میں بحر اوقیانوس واقع ہے۔52ریاستوں پر مشتمل ہے۔ دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی ہے۔کل رقبہ 37لاکھ مربع میل ہے۔روس کے زوال کے بعد دنیا میں امریکی اثرورسوخ بڑھی۔طرز حکمرانی آئینی جمہوری ہے۔اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کے مستقل رکن ہے۔
(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ
مال لے کر یہاں تک کہ (فریق مقابل) لڑائی (کے) ہتھیار رکھ
دے"[1]

اگربنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا زیادہ سے زیادہ "مباحات" کے دائرے میں آتا ہے۔اور مباح کے بارے میں حکم یہ ہے کہ چاہے اس پر عمل کرو،چاہے چھوڑ دو۔لہذا ہم بر ملا کہہ سکتے ہیں کہ غلامی کے خلاف جو بین الاقوامی معاہدہ طے پا گیا ہے اسلام بھی اس کی اجازت دیتا ہے(لیکن واضح رہے کہ غلامی کے سلسلے میں اسلام کاحکم بہرحال اپنی جگہ برقرار ہے ۔البتہ)عملاً موجودہ حالات کے پیشِ نظر جنگی قیدی سے "غلام"بنانے کے آپشن سے ہم دستبردار ہو سکتے ہیں لیکن اصولی طور پر اب بھی مسلمان اپنے موقف پر قائم ہیں کیونکہ قرآن وسنت کی تعلیمات اپنی جگہ پراب بھی قائم ہیں ،ہم اسلامی احکام سے نہیں بلکہ اُس کی تطبیق سے دست بردار ہوئے ہیں۔

پس مسلمان اپنے دین پر بھی قائم ہیں اور جہاں احکامِ منصوصہ متاثر نہیں ہوتیں وہاں بین الاقوامی معاہدات کو بھی قبول کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں مغرب کے جیلوں میں قید لوگوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے وہ اسلام میں قیدیوں کو دئیے گئے حقوق کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ان کی جیلوں کے حالات سے پوری دنیا واقف ہے۔اسلام جنگی قیدی کوایک آپشن کی صورت میں غلام بنانے کا قائل ضرور ہے جس کے نتیجے میں وہ کسی کے گھر میں کام کاج پر مقرر کیاجاتا ہے جواُس کے لیے مغرب کی جیلوں سے بہر حال ہزارہا درجہ بہتر ہے۔

---

[1]سورۃ محمد4:47

دفعہ:۵

کسی کو بھی ایسی سزا نہیں دی جائی گی جس میں اذیت ہو،اس کے ساتھ ساتھ مبنی بر ظلم اور تذلیل والا سزا نہیں دیا جائے گا

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کا تقابلی جائزہ:مطلب یہ کہ کسی بھی انسان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جائے گا جس میں اُس کو بدنی اذیت ہو،یاسزا سے اس کی تذلیل ہوتی ہو۔اسی طرح انسان کو بدنی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

اسلام عزت نفس کا درس دیتا ہے اور جہاں انسان کی عزت نفس پر کوئی حرف آتا ہو وہاں حکمت کے ذریعےاُس کےسدباب کے لیے ہدایات دیتاہے ۔سزا سے چونکہ انسانی تقدس متاثر ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام میں بنفسہ سزا کوئی اچھی چیز نہیں ہے بلکہ سزا کو سدِّذرائع کے طور پر استعمال کیا جاتاہے ۔پھراسلام میں کسی قابل جرم فعل کے ارتکاب پر جو سزائیں دی جاتی ہیں اُن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف)قصاص (ب)حدود (ج)تعزیر

قصاص کے بارے میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"اور ہم نے ان لوگوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے"[1]

ابن کثیر رحمہ اللہ سے منقول ہے:

> "یہودیوں کو اور سرزنش کی جا رہی ہے کہ ”ان کی کتاب میں صاف لفظوں میں جو حکم تھا یہ کھلم کھلا اس کا بھی خلاف کر رہے ہیں اور سرکشی اور بے پرواہی سے اسے بھی چھوڑ رہے ہیں“ ۔ نضری یہودیوں کو تو قرظی یہودیوں کے بدلے قتل کرتے ہیں لیکن قریظہ کے یہود کو بنو نضیر کے یہود کے عوض قتل نہیں کرتے بلکہ دیت لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے شادی شدہ زانی کی سنگساری کے حکم کو بدل دیا ہے اور صرف کالا منہ کر کے رسوا کر کے مار پیٹ کر چھوڑ دیتے ہیں۔اسی لیے وہاں تو انہیں اُن کے انکار کی وجہ سے کافر کہا یہاں ظالم اور مظلوم کے درمیان اُس حکم کے بارے میں جس کے بارے میں اللہ تعالی نےعدل اور برابری کا حکم فرمایا تھااُس میں نصاف نہ کرنے کی وجہ سے انہیں ظالم کہا۔کیونکہ انہوں نے اُس کی خلاف کی اور ایک دوسرے پر زیادتی کرتے رہے"[2]

---

[1] المائدہ45:5

[2] ابن کثیر۔ج10،ص121،120

ایک حدیث میں نبی علیہ السلام کا "العین" پڑھنا بھی مروی ہے۔ علماء کرام کا قول ہے کہ پچھلی شریعت چاہے ہمارے سامنے بطور تقرر بیان کی جائے اور منسوخ نہ ہو تو وہ ہمارے لیے بھی شریعت ہے۔ جیسے یہ احکام سب کے سب ہماری شریعت میں بھی اسی طرح ہیں"[1]

"حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے:یہ دیت اُن پر اور عام لوگوں پر ہے"[2]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

> "اس مسئلے میں تین مسلک ہیں ایک تو وہی جو بیان ہوا، ایک اس کے بالکل برعکس ایک یہ کہ صرف ابراہیمی شریعت جاری اور باقی ہے اور کوئی نہیں۔ اس آیت کے عموم سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ مرد عورت کے بدلے بھی قتل کیا جائے گا کیونکہ یہاں لفظ نفس ہے جو مرد عورت دونوں کو شامل ہے‘‘۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی ہے کہ مردکو عورت کے خون کے بدلے قتل کیا جائے گا [3]۔ اور حدیث میں ہے کہ مسلمانوں کے خون آپس میں مساوی ہیں "[4]،[5]

اسی طرح ایک قول یہ بھی ہے:

> بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ ’’مرد جب کسی عورت کو قتل کر دے تو اسے اس کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا بلکہ صرف دیت لی جائے گی‘‘۔ لیکن یہ قول جمہور کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تو فرماتے ہیں کہ ’’ذمی کافر کے قتل کے بدلے بھی مسلمان قتل کر دیا جائے گا اور غلام کے قتل کے بدلے آزاد بھی قتل کر دیا جائے گا‘‘۔ لیکن یہ مذہب جمہور کے خلاف ہے"[6]

"صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں مسلمان کوکافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا "[7]

اور اس بارے میں سلف سے بہت آثار اس بارے منقول ہیں کہ وہ "غلام "کا قصاص "آزاد" سے نہیں لیتے تھے اور آزاد غلام کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔ احادیث بھی اس بارے میں مروی ہیں لیکن صحت کے درجے تک نہیں پہنچیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تو فرماتے ہیں ’’اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے خلاف اجماع ہے‘‘۔ لیکن ان باتوں سے اس قول کا بطلان لازم نہیں آتا تاوقتیکہ آیت کے عموم کو خاص کرنے والی کوئی دلیل نہ ہو"[8]

قصاص کے حوالے سے صحیحین کی روایت ہے:

---

[1] ابن کثیر،ج3،ص121

[2] عبدالرحمان بن ابی حاتم،ابن ابی حاتم،تفسیر ابن اطی حاتم،ج4،ص1144،دار النشر:المکتبۃ العصریہ

[3] اس حدیث کو سنن دارمی (ج2،ص190،189)،حاکم (ج1،ص397،395)اوربیہقی (ج8،ص28)نے بھی نقل کیا ہے۔

[4] ابوداؤد،کتاب الجہاد،باب فی السریۃ ترد علی اھل العسکر،رقم:2753

[5] البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے ،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج6،ص251

[6] ابن کثیر،ج3،ص121

[7] بخاری،کتاب العلم ،باب کتابۃ العلم،رقم:111

[8] ابن کثیر ج3،ص121

.بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن

نضر کی پھوپھی ربیع نے ایک لونڈی کے دانت توڑ دیئے، اب لوگوں نے اس سے معافی چاہی لیکن وہ نہ مانی۔ نبی علیہ السلام کے پاس معاملہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ لینے کا حکم دے دیا، اس پر انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا اس عورت کے سامنے کے دانت توڑ دیئے جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :ہاں اے انس! اللہ کی کتاب میں قصاص کا حکم موجود ہے ۔ یہ سن کر فرمایا نہیں نہیں یا نبی علیہ السلام قسم ہے اس اللہ کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اس کے دانت ہرگز نہ توڑے جائیں گے، چنانچہ ہوا بھی یہی کہ لوگ راضی رضامند ہوگئے اور قصاص چھوڑ دیا بلکہ معاف کر دیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :بعض بندگان رب ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ پر کوئی قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ اسے پوری ہی کر دے "[1]

"اور ابوداؤد کی روایت میں ہے:

"سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ غریب لوگوں کے غلام نے مالدار لوگوں کے غلام کا کان کاٹ ڈالا۔تو وہ نبی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! ہم غریب لوگ ہیں پس نبی علیہ السلام نے اُن پر کچھ بھی لازم نہیں فرمایا" [2]،[3]

". اللهم إلا أن يقال: إن الجاني كان قبل البلوغ، فلا قصاص عليه، ولعله تحمل أرش ما نقص من غلام الأغنياء عن الفقراء، أو استعفاهم عنهاس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جا نی غلام نابالغ تھا اور نابالگ پر قصاص نہیں ہے"

دوسری روایت میں ہے کہ ’’پہلے انہوں نے نہ تو معافی دی نہ دیت لینی منظور کی‘‘۔ نسائی وغیرہ میں ہے، ایک غریب جماعت کے غلام نے کسی مالدار جماعت کے غلام کے کان کاٹ دیئے، ان لوگوں نے نبی علیہ السلام سے آکر عرض کیا کہ ہم لوگ فقیر مسکین ہیں، ہمارے پاس مال نہیں تو نبی علیہ السلام نے ان پر کوئی جرمانہ نہ رکھا ۔(ہو سکتا ہے کہ یہ غلام بالغ نہ ہو اور ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت اپنے پاس سے دے دی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے سفارش کرکے معاف کرا لیا ہو۔

---

[1] بخاری،کتاب الصلح،باب الصلح بالدیۃ،رقم:2703

[2] سنن ابوداؤد،کتاب الدیات،باب فی جنایۃ العبدیکون للفقراء،رقم:4592

[3] قال الالبانی:ھذا حدیث صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج10،ص90

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "جان جان کے بدلے ماری جائے گی، آنکھ پھوڑ دینے والے کی آنکھ پھوڑ دی جائے گی، ناک کاٹنے والے کا ناک کاٹ دیا جائے گا، دانت توڑنے والے کا دانت توڑ دیا جائے گا اور زخم کا بھی بدلہ لیا جائے گا"[1]

"اس میں آزاد مسلمان سب کے سب برابر ہیں۔ مرد عورت ایک ہی حکم میں۔ جبکہ یہ کام قصداً کئے گئے ہوں۔ اس میں غلام بھی آپس میں برابر ہیں، ان کے مرد بھی اور عورتیں بھی"[2]

اس تفصیل کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا حکم میں تشدد بھی ہے اور "انسانی تذلیل" بھی۔اسی طرح حدود کی سزاؤں میں "رجم" کی جو سزا ہے وہ تو ہے ہی تشدد اور تذلیل۔جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

> "زناکار عورت اورزناکار مردونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو شریعت کے حکم میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور چاہیئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو"[3]

چوری کی سزا میں بھی تشدد ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

> "اور چور مرد ہو یا عورت ،ان کے چوری کے سزا کے طور پر ان کے ہاتھکاٹڈالویہاللہ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہغالب حکمت والا ہے"[4]

اسی طرح تعزیر میں کوڑے لگانے کی سزا مقرر ہے،اُس میں بھی تشدد ہے۔
بدکاری کی سزا دیتے وقت میں یہ حکم بھی ہے:

" وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ"

جس میں خفیہ طریقے سے سزا دینے کے مقابلے میں برسر عام سزا دینے میں تذلیل بھی ہے۔مختصراَ یہ کہ سزاؤں کےحوالے سے اسلام میں کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جو" عالمی منشور برائے انسانی حقوق "کے مقابل نہ ہو۔تبھی تو دنیا اِن سزاؤں کے بارے عجیب وغریب الفاظ (جیسے وحشیانہ،غیر انسانی اور ظالمانہ وغیرہ) استعمال کرتی ہے ۔اصل میں اس منشور کا یہی دفعہ ہے جس کو بنیاد بنا کر دنیا قصاص وحدود کو مختلف نفرت انگیز نام دے کر اسلام میں حدود وقصاص کے سارے نظام کو یکسر ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اسلام اورمسلمان احکامِ الٰہیہ کے مقابلے میں نہ کسی معاہدے کے پابند ہیں اور نہ کسی دوسرے چیز کے۔اس کے علاوہ ہر معاملے میں اسلام عرف کو بھی اور انفرادی،قومی اور بین الاقوامی معاہدات کو تسلیم کرتا ہے۔"غلامی"کے بحث میں ذکر کیا گیا کہ تطبیق کے لحاظ سے مسلمان اس عالمی معاہدے پر عمل پیراہیں۔کیونکہ وہ نص قطعی نہیں ہے جس کو مسلمان کسی بھی صورت میں چھوڑ نہیں سکتے ۔لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ اسلام اور مسلمان احکامِ منصوصہ کے مقابلے میں کوئی بھی اور کسی بھی سطح کا معاہدہ،منشور یا عرف کا نہ ہی پابند ہے اور نہ ہی اُسے تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے عملاَ"عالمی منشور"کے اس دفعے کو قبول توکیا ہے

---

[1] طبری،ج10،ص360
[2] طبری،ج10،ص360
[3] النور2:24
[4] المائدہ38:5

لیکن اگر عقیدہ بھی قبول کریں تو پھر مسلمانوں کو اسلام کے پورے نظامِ تعزیرات سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

دفعہ: ۶

ہر کسی کی شخصیت تسلیم کرنا اُس کا قانونی حق ہے۔

<u>سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ:</u> اسلام میں یہی حق اپنی اصل روح کے ساتھ موجود ہے۔انسان کی زندگی کے تمام مراحل میں اسلام اُس کی شخصیت تسلیم کرتا ہے۔حالتِ حمل میں ہو،زچہ ہو،بچہ ہو،جوان ہو،بوڑھا ہو،مرد ہو یا عورت،شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔باپ ہو یابیٹا،تندرست ہو یا بیمار،حاکم ہو یا رعایا۔الغرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں اسلام انسان کی شخصیت تسلیم کرکے اُسے اپنے حقوق دیتاہے۔ذیل میں سیرت طیبہ کی روشنی میں انسان کے مختلف حالات میں اُس کی شخصیت تسلیم کرتے ہوئے حقوق ذکر کیے جاتے ہیں۔

<u>(1)جنین کی حیثیت سے مقام:</u> ہرمقام پر اسلام انسانی شخصیت کو تسلیم کرتا ہے جیسا کہ جنین(حمل) کی شخصیت تسلیم کرتے ہوئے اسلام کہتا ہے کہ:

> "ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ دو عورتیں تھیں، ایک نے دوسری کو پتھر دے مارا جس سے اس کے پیٹ کا حمل گر گیا۔ نبی علیہ السلامنے اس معاملہ میں ایک غلام یا باندی کا دیت میں دیئے جانے کا فیصلہ کیا"[1]

---

[1] بخاری کتاب الطب،باب الکهانة،رقم:5759،مسلم،کتاب القسامة،باب دیة الجنین ووجوب الدیة،رقم:4483

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ ابھی دنیا میں آیا ہی نہیں ہے اور اسلام نے اس کی حیثیت تسلیم کرکے اس کے تاوان میں "غلام"یا "باندی" کے دیئے جانے کا حکم فرمایا۔اسی طرح ہدایہ میں ہے:

"اور اگر ماں مار سے مر گئی پھر اس کے بعد بچہ زندہ پیدا ہوا پھر مر گیا۔تو اس پر ماں اور بچے دونوں کی دیت ہوگی۔کیونکہ در حقیقت وہ دو افراد کا قاتل ہے"[1]

(2)طفولیت :پیدائش کے فورا بعد کی حالت کے بارے میں ارشاد ہے:

"اورناداری کی ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا تمہیں اور اُنہیں ہم ہے روزی دیتے ہیں۔ بے شک ان کاقتل کرنا بڑا سخت گناہ ہے"[2]

اور ارشاد ہے:

" اورمفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مارڈالنا کرنا کیونکہ تمہیں اور انہیں ہم ہی روزی دیتے ہیں "[3]

قتل اولاد کی مذمت کرتے ہوئے اوراسے قابل مؤاخذہ شمار کرتے ہوئے اللہ تعالی کا فرمان ہے:

"اور جب لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہو پوچھا جائے گا کس گناہ کے بدلے تجھے قتل کیا گیا تھا"[4]

قُرآ ن نے قتلِ اولاد کے فعلِ شنیع کو انتہائی درجے کی بے وقوفی شمار کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" جن لوگوں نے اپنی اولاد کو بیوقوفی سے بے سمجھی سے قتل کیا اور اللہ پر اجھوٹ باندھ کر اس کی عطا کی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرایا وہ گھاٹے میں پڑ گئے وہ بےشبہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں"[5]

(3)شباب :نوجوانی کے زمانہ کے لیے پر اسلامی تعلیمات کچھ یوں ہیں۔ارشاد ہے:" اسلام نے شباب کی زندگی کی اہمیت اور اس کے بارے میں اصول بیان کئے ہیں۔ جوانوں میں صفاتِ جمیلہ کے پیدا کرنے کی اہمیت اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔جیسا کہ سیدنالقمان کے اپنے بیٹے کونصیحت سے معلوم ہوتا ہے :

" اور (اُس وقت کو یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ شرک تو بڑا (بھاری) ظلم ہے"[6]

اور اللہ تعالٰی نے سیدنا لقمان کی زبان سے فرمایا:

"(لقمان نے یہ بھی کہا کہ) بیٹا اگر کوئی عمل (بالفرض) رائی کے دانے کے برابر بھی (چھوٹا) ہو اور ہو بھی کسی پتھر کے

---

[1]محمد بن محمد،البابرتی، العنایہ شرح الہدایہ، کتاب الدیات،فصل فی الجنین

[2]الاسراء31:17

[3]الانعام151:6

[4]التکویر8:81

[5]الانعام140:6

[6]لقمان13:31

اندر یا آسمانوں میں (مخفی ہو) یا زمین میں۔ اللہ اس کو قیامت کے دن لاموجود کرے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ باریک بین (اور) خبردار ہے۔بیٹا نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کا امر اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔اور (ازراہ غرور) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا۔ کہ اللہ کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔اور اپنی چال میں اعتدال کئے رہنا اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا کیونکہ (اُونچی آواز گدھوں کی ہے اور کچھ شک نہیں کہ) سب آوازوں سے بُری آواز گدھوں کی ہے"[1]

صفاتِ جمیلہ پیدا کرنے کے حوالے سے قرآن مجید میں نوجوانوں کے لیے ایک بہترین اور بے مثل مثال بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ قُرآن کریم میں سورۃ یوسف میں ہے:

" تو جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اس نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا اور دروازے بند کرکے کہنے لگی (یوسف) جلدی آؤ۔ انہوں نے کہا کہ اللہ پناہ میں رکھے (وہ یعنی تمہارے میاں) تو میرے آقا ہیں انہوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے (میں ایسا ظلم نہیں کرسکتا) بےشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انہوں نے اس کا قصد کیا۔ اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے (تو جو ہوتا ہوتا) یوں اس لیے (کیا گیا) کہ ہم ان سے برائی اور بےحیائی کو روک دیں۔ بےشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے"[2]

نوجوانوں کی تربیت اوراصلاح کا انتظام:کسی بھی انسان کی صحیح اور بروقت تربیت اُس کے مستقبل کی زندگی پر انتہائی اثر انداز ہوتی ہے۔اسلام دور شباب میں نوجوان کی ہر لحاظ سے اصلاح چاہتا ہے۔اسلام سب سے پہلے عقیدے کے اصلاح چاہتا ہے ۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے:

" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا ’’سات آدمی ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عرش کے نیچے سایہ دے گا جبکہ اس کے عرش کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ عادل حاکم، نوجوان جس نے اللہ کی عبادت میں جوانی پائی، ایسا شخص جس نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، وہ شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہے، وہ آدمی جو اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں، وہ شخص جسے کسی بلند مرتبہ اور خوبصورت عورت نے اپنی طرف بلایا اور اس نے جواب دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور وہ شخص جس نے اتنا پوشیدہ صدقہ کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ دائیں

---

[1]لقمان 19/16:19

[2]یوسف 12: 24/23

سے کہ اور کیا صدقہ کیا ہے۔اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیااوررویا"[1]

" وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ "سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ عقیدے کی اصلاح سب سے اہم ترین عمل ہے۔ اسی طرح کسی مرتبے والی عورت کی طرف سے دعوت گناہ قبول نہ کرنا بھی "نوجوانوں"کے بارے آیا ہے یہ حکم عام ہے چاہے جوان ہو یا بوڑھا کسی بھی حالت میں بدکاری کا ارتکاب جرم ہوگا ۔لیکن نوجوانی میں اس فعل کے ارتکاب کا غالب گمان ہوتا ہے۔اس وجہ سے " شَابٌّ " کا لفظ آیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک دن نبی علیہ السلامکے ساتھ سواری پر پیچھے تھا، آپ نے فرمایا : ’’اے لڑکے! بیشک میں تمہیں چند اہم باتیں بتلا رہا ہوں: تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تو اللہ کے حقوق کا خیال رکھو اسے تم اپنے سامنے پاؤ گے، جب تم کوئی چیز مانگو تو صرف اللہ سے مانگو، جب تو مدد چاہو تو صرف اللہ سے مدد طلب کرو، اور یہ بات جان لو کہ اگر ساری امت بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، قلم اٹھا لیے گئے اور)تقدیر کے(صحیفے خشک ہو گئے ہیں"[2]،[3]

یہ حدیث تو نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ایک مکمل ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ:

(الف):حکم کے لحاظ سے توحدیث عام ہے لیکن روئے سخن نوجوانوں کی طرف ہے کیونکہ " یا غلام "کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(ب):" احفظ اللہ یحفظك "کے مختصر الفاظ گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔کیونکہ اس میں عبادات پر محافظت،اللہ کی اطاعت پر دوام اورگناہوں سے اجتناب وغیرہ سب کچھ آتا ہے۔

(ج):نوجوان میں عزت ،کرامت اور قوت نفس پیدا کرنی والے ذات سے تعلق جوڑنے کے لیے" إذا سألت فاسأل اللہ "فرمایا۔کیونکہ اللہ تعالی ہی تن تنہا وہ ذات ہے جوسب کچھ دے بھی سکتی ہے اور لے بھی سکتی ہے۔

(د):نوجوانوں میں تقدیر پر ایمان اور یقین رکھنے کی کوشش کرانا۔کہ ہرخیر اور شر اللہ ہی کے حکم سے ممکن ہوتا ہے اسی طرف نبی علیہ السلام کے اس ارشاد میں اشارہ ہے:

اور یہ بات جان لو کہ اگر ساری امت بھی جمع ہو کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمہیں اس سے زیادہ کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اور اگر وہ

---

[1]بخاری،کتاب الزکوۃ،باب الصدقۃ بالیمین،رقم:660،صحیح مسلم،کتاب الزکوۃ،باب فضل اخفاء الصدقۃ،رقم:2427

[2]ترمذی،کتاب،باب،رقم:2516

[3]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن الترمذی،ج6،ص16

تمہیں کچھ نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے"

(ہ)اخلاقی آداب سکھانا: اسلام انسانی اخلاقی صفت کو انتہائی اہمیت دیتا ہے ۔ اجتماعی کھانے کے ادب کے بارے میں ایک صحابی [1] رسول سے مروی ہے:

"میں بچہ تھا اور نبی علیہ السلامکی پرورش میں تھا اور)کھاتے وقت(میرا ہاتھ برتن میں چاروں طرف گھوما کرتا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹے! بسم اللہ پڑھ لیا کرو، داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور برتن میں وہاں سے کھایا کرو جو جگہ تجھ سے نزدیک ہو۔ چنانچہ اس کے بعد میں ہمیشہ اسی ہدایت کے مطابق کھاتا رہا" [2]

(و)بڑوں کا احترام سکھانا: اسلام صر ف چند اخلاقی اقدار کا نا م نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے ہدایات موجود ہیں ۔بات چیت اور گفتگو میں بھی اُن کا لحاظ رکھنا چاہئیے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے:

" عبداللہ بن سہل اور محیصہ بن مسعود بن زید رضی اللہ عنہما خیبر گئے۔ ان دنوں(خیبر کے یہودیوں سے مسلمانوں کی)صلح تھی۔ پھر دونوں حضرات(خیبر پہنچ کر اپنے اپنے کام کے لیے)جدا ہو گئے۔ اس کے بعد محیصہ رضی اللہ عنہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ خون میں لوٹ رہے ہیں۔ کسی نے ان کو قتل کر ڈالا، خیر محیصہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دفن کر دیا۔ پھر مدینہ آئے، اس کے بعد عبدالرحمٰن بن سہل(عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بھائی)اور مسعود کے دونوں صاحبزادے محیصہ اور حویصہ نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے، گفتگو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے شروع کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو تم لوگوں میں عمر میں بڑے ہوں وہ بات کریں۔ عبدالرحمٰن سب سے کم عمر تھے، وہ چپ ہو گئے۔ اور محیصہ اور حویصہ نے بات شروع کی۔ آپ نے دریافت کیا، کیا تم لوگ اس پر قسم کھا سکتے ہو، کہ جس شخص کو تم قاتل کہہ رہے ہو اس پر تمہارا حق ثابت ہو سکے۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم ایک ایسے معاملے میں کس طرح قسم کھا سکتے ہیں جس کو ہم نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر کیا یہود تمہارے دعوے سے اپنی برات اپنی طرف سے پچاس قسمیں کھا کر کے کر دیں؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ کفار کی قسموں کا ہم

---

[1] اُس صحابی کا اسم مبارک عمر بن ابی سلمۃ رضی اللہ عنہ تھے۔صحیح بخاری،کتاب الاطعمۃ،باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین،رقم:5376

[2] صحیح بخاری،کتاب الاطعمۃ،باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین،رقم:5376

کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے پاس سے ان کو دیت ادا کر دی"[1]

اس حدیث میں" كَبِّرْ كَبِّرْ "(جو عمر میں بڑے ہوں وہ بات کریں) سے مراد یہ ہے کہ جو عمر میں بڑا ہوتا ہے اُس کی موجودگی میں اُس کے احترام کی خاطر چھوٹے کو بات میں پہل نہیں کرنی چاہئیے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ:

"ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ (خواب میں)مسواک کر رہا ہوں تو میرے پاس دو آدمی آئے۔ ایک ان میں سے دوسرے سے بڑا تھا، تو میں نے چھوٹے کو مسواک دے دی پھر مجھ سے کہا گیا کہ بڑے کو دو۔ تب میں نے ان میں سے بڑے کو دی"[2]

(ز)جسمانی(بدنی) تربیت کرنا: اسلام نوجوانوں کے صحت مند ماحول کی حوصلہ آفزائی کرتا ہے۔جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا” :طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور پیارا ہے دونوں میں سے ہر ایک میں خیر ہے، ہر اس چیز کی حرص کرو جو تمہیں نفع دے، اور اللہ سے مدد طلب کرو، دل ہار کر نہ بیٹھ جاؤ، اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہو: کاش کہ میں نے ایسا ویسا کیا ہوتا تو ایسا ہوتا، بلکہ یہ کہو: جو اللہ نے مقدر کیا تھا اور جو اس نے چاہا کیا، اس لیے کہ ”اگر مگر“شیطان کے عمل کے لیے راستہ کھول دیتا ہے"[3]

امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ:

" والمراد بالقوة هنا عزيمة النفس والقريحة في أمور الآخرة "[4]

"لیکن حدیث میں لفظِ "قوۃ" عام ہے۔ہر اُس معنی کو شامل ہے جس میں یہ مفہوم آتا ہو۔

خود نبی علیہ السلام جسمانی صحت کے مقابلوں کی حوصلہ آفزائی فرماتے تھے بلکہ کبھی تو خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔سیدنا سلمۃ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"نبی علیہ السلامکا قبیلہ بنو اسلم کے چند لوگوں پر گزر ہوا جو تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسماعیل علیہ السلام کے بیٹو !تیر اندازی کرو کہ تمہارے بزرگ دادا اسماعیل علیہ السلام بھی تیرانداز تھے۔ ہاں ! تیر اندازی کرو، میں بنی فلاں(ابن الاکورع رضی اللہ عنہ)کی طرف ہوں۔ بیان کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فریق کے ساتھ ہو گئے تو (مقابلے میں حصہ لینے والے)دوسرے فریق

---

[1]صحیح بخاری،کتاب الجزیۃ والموادعۃ،باب الموادعۃ والمصالحۃ مع المشرکین بالمال وغیرہ،واثم من لم یف بالعهد،رقم:3173،

[2]صحیح بخاری،کتاب الوضوء،باب دفع السواک الی الاکبر،رقم:246،صحیح مسلم،کتاب الرؤیا،باب رؤی النبی ،رقم:6071

[3]صحیح مسلم،کتاب،باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز،رقم:6945

[4]شرح النووی علی المسلم،ج16،ص215

نے ہاتھ روک لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات پیش آئی، تم لوگوں نے تیر اندازی بند کیوں کر دی؟ دوسرے فریق نے عرض کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فریق کے ساتھ ہو گئے تو بھلا ہم کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس پر نبی علیہ السلامنے فرمایا اچھا تیر اندازی جاری رکھو میں تم سب کے ساتھ ہوں"[1]

(ح)نکاح کرانا: پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ جوانی میں بلوغت اور اس کے بعد کا زمانہ انتہائی حساس ہوتا ہےکیونکہ انسان میں جنسی خواہشات پیدا ہو جاتی ہیں۔جس کی وہ تکمیل چاہتا ہے ۔اسلام اِس انسانی ضرورت کو پوراکرنے کا مناسب طریقہ بتلاتا ہے۔اور اُس کے ساتھ ساتھ مسلمان کواپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیتا ہے اللہ تعالی کا ارشا دہے:

"اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں سے یا (کنیزوں سے) جو ان کی مِلک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں۔ جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرجانے والے ہیں۔ اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے) نکل جانے والے ہیں"[2]

ارشاد ربانی ہے:"اور زنا کے بھی پاس نہ جانا کہ وہ بےحیائی اور بری راہ ہے۔[3]

اور اگر کسی کے نکاح کرنے کی طاقت نہ ہو تو اُ س کا علاج بھی تجویز فرماتا ہے جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم نبی علیہ السلامکے زمانہ میں نوجوان تھے اور ہمیں کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ نبی علیہ السلامنے ہم سے فرمایا کہ نوجوانوں کی جماعت! تم میں جسے بھی نکاح کرنے کے لیے مالی طاقت ہو اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ نظر کو نیچی رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا عمل ہے اور جو کوئی نکاح کی بوجہ غربت طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کی خواہشات نفسانی کو توڑ دے گا"[4]

(ط)حکمت سے تربیت: اس حوالے سے ایک نوجوان صحابی رضی اللہ کا واقعہ حدیث میں آتا ہے جسے مسند احمد میں ذکر کیاگیا ہے:

" ایک دفعہ ایک نوجوان نبی علیہ السلام کے پاس آیا۔اور کہنے لگا کہ اےاللہ کو رسول:مجھے زنا کی اجازت دیجئیے۔پاس بیٹھے لوگ اُسے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے۔"چُپ رہ، چُپ"آپ نے فرمایا اسے مجھے قریب آنے دو۔وہ آپ

---

[1] صحیح بخاری،کتاب الجهاد السیر،باب التحریض علی الرمی،رقم:2899

[2] المؤمنو ن23 : 7/5

[3] الاسراء17:32

[4] بخاری،کتاب النکاح،باب من لم یستطع الباءة فلیصم:رقم5066،صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه ووجد مؤنة،رقم3464

کے قریب آکر بیٹھ گیا۔آپ نے(اسے سمجھانے کی غرض سے)فرمایا:کیا تو یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسا فعل تمہاری والدہ کے ساتھ کرے۔اُس نے کہا میں آپ پر قربان ہوجاؤ اللہ کی قسم کبھی بھی نہیں۔کوئی بھی اپنی ماں کے ساتھ غیر مرد کا یہ فعل نہیں چاہتا۔پھر آپ نے اُس سے اُس کی بیٹی،بہن،پھوپھی اور خالہ کے بارے میں اس قسم کے سوالات کیے اُس نے بھی پہلے جیسے جوابات دئیے۔راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس پر اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر دعا فرمائی:اے اللہ اِس کے گناہ معاف فرمائے،دل صاف کردے اوراس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما۔پھر اِس کے بعد اُس نوجوان نے کبھی بھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا"[1]،[2]

(ی)نوجوانوں میں اعتماد پیدا کرنا:نوجوانی میں انسانی طاقت بھر پور ہوا کرتی ہے نوجوانوں میں ہر کام کو پورا کرنے کے لیے مطلوبہ طاقت بھی موجود ہوتی ہے ۔اُن پر اعتماد کرتے ہوئے اُن کو بڑے بڑے اور اہم امور حوالے کئے گئے ہیں۔سیرت طیبہ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔مثلاً:

جنگ خیبر کے موقع پر نبی علیہ السلام نےجنگی جھنڈا تیس سال کے ایک نوجوان کے ہاتھ میں دیا تھا اور اللہ تعالی نے اُن کے ہاتھ پر فتح عنایت فرمائی تھی۔صحیحین کی روایت ہے کہ:

" غزوہ خیبر میں نبی علیہ السلامنے فرمایا تھا کہ کل میں جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول بھی اسے عزیز رکھتے ہیں۔ راوی نے بیان کیا کہ وہ رات سب کی اس فکر میں گزر گئی کہ دیکھیں ' نبی علیہ السلامجھنڈا کسے عطا فرماتے ہیں۔ صبح ہوئی تو سب خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور اس امید کے ساتھ کہ عَلم انہیں کو ملے لیکن نبی علیہ السلامنے دریافت فرمایا کہ علی بن ابی طالب [3]کہاں ہیں؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! وہ تو آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ انہیں بلا لاؤ۔ جب وہ لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تھوک ان کی آنکھوں میں لگایا اور ان کے لیے دعا کی۔ اس دعا کی برکت سے ان کی آنکھیں اتنی اچھی ہو گئیں جیسے پہلے ان میں کوئی بیماری ہی نہیں تھی۔ علی رضی اللہ عنہ نے عَلم سنبھال کر عرض کیا: یا رسول اللہ!

---

[1]مسند احمد،باقی مسند االانصار،حدیث ابو امامہ الاباہلی،صدی بن عجلان،رقم:22265

[2]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ،ج1،ص712

[3]علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی۔رسول اللہ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔چھوٹوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے۔اسلام قبول کرنے کے بعد تیرہ سال مکہ میں بسر ہوئے،پھر رسول اللہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کیا۔آپ چوتھے خلیفہ ہے آپ نے 4سال 9 ماہ خلافت کیا ،وفات کے آپ کی عمر 63 سال تھی۔(ابن سعد، الطبقاتالکبری،ج3 ،ص 38۔الاستیعابفیمعرفةالأصحاب،ج،1 ص 383)

میں ان سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک وہ ہمارے ہی جیسے نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں ہی چلتے رہو ' ان کے میدان میں اتر کر پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو اور بتاؤ کہ اللہ کا ان پر کیا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تمہارے ذریعہ ایک شخص کو بھی ہدایت مل جائے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"[1]

اسی طرح دوسرے موقع پر آپ نےکبارصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قیادت ایک بیس سالہ نوجوان کو مرحمت فرمائی تھی۔بلکہ ایک قول کے مطابق اُس کی عمر اٹھارہ سال تھی[2]۔

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بنایا لیکن ان کی سرداری پر لوگوں نے اعتراض کیا ۔ نبی علیہ السلامنے اس پر فرمایا کہ اگر آج تم ان کی امارت کو مطعون قرار دیتے ہو تو تم نے اس سے پہلے اس کے والد (زید رضی اللہ عنہ)کی امارت کو بھی مطعون قرار دیا تھا اور اللہ کی قسم! وہ امارت کے لیے سزاوار تھے اور وہ مجھے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے اور یہ(اسامہ رضی اللہ عنہ)ان کے بعد سب سے زیادہ مجھے عزیز ہے"[3]

بلکہ اس سے دویا تین سال پہلے بھی نبی علیہ السلام نے آپ رضی اللہ عنہ کو ایک سریّے میں ایک قبیلے کےپاس بھیجا تھا۔خود اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے سنا ' انہوں نے بیان کیا کہ ہمیں نبی علیہ السلامنے قبیلہ حرقہ کی طرف بھیجا۔ ہم نے صبح کے وقت ان پر حملہ کیا اور انہیں شکست دی ' پھر میں اور ایک اور انصاری صحابی اس قبیلہ کے ایک شخص)مرداس بن عمر نامی(سے بھڑ گئے۔ جب ہم نے اس پر غلبہ پا لیا تو وہ لا الہٰ الا اللہ کہنے لگا۔ انصاری تو فوراً ہی رک گیا لیکن میں نے اسے اپنے برچھے سے قتل کر دیا۔ جب ہم لوٹے تو نبی علیہ السلامکو بھی اس کی خبر ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اسامہ کیا اس کے لا الہٰ الا اللہ کہنے کے باوجود تم نے اسے قتل کر دیا؟ میں نے عرض کیا کہ وہ قتل سے بچنا چاہتا تھا (اس نے یہ کلمہ دل سے نہیں پڑھا تھا)۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باربار یہی فرماتے رہے(کیا تم نے اس کے لا الہٰ الا اللہ کہنے پر بھی اسے قتل کر دیا)کہ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں آج سے پہلے اسلام نہ لاتا"[4]

---

[1] بخاری کتاب الجہاد والسیر،باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الناس الی الاسلام والنبوۃ،رقم:2942،مسلم،کتاب فضائل الصحابہ،باب من فضائل علی بن ابی طالب،رقم:6376

[2] الاصابہ،ج1ص49

[3] بخاری،کتاب الاحکام،باب من لم یکترث بطعن من لایعلم فی الامراء حدیثا،رقم:3730،مسلم،کتاب الفضائل،بابفضائل زید بن حارثۃ واسامۃ بن زید،رقم:6417

[4] بخاری،کتاب المغازی،باب بعث النبی اسامہ الی الحرقات من جھینۃ ،رقم:4269

نوجوانوں کو ذمہ داری تفویض کرنے کی ایک مثال اس حدیث میں بھی ہے سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نبی علیہ السلامکے ہمراہ سات غزووں میں شریک رہا ہوں اور نو ایسے لشکروں میں شریک ہوا ہوں جو آپ نے روانہ کئے تھے۔(مگر آپ خود ان میں نہیں گئے)کبھی ہم پر ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر ہوئے اور کسی فوج کے امیر اسامہ رضی اللہ عنہ ہوئے "[1]

(5)**بحیثیت والدین اُن کا مقام:**والدین چونکہ اولاد کے لیے زندگی،جوانی،خوشی،آرام وراحت تک قربان کرتے ہیں اسی وجہ سے اسلام نے اُن کے بارے میں حسن سلوک کی ایسی ہدایات دی ہے جس کی نظیر نہ پہلے تھی اور نہ آئندہ کےلیے کوئی پیش کر سکتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور اُن سے بات ادب کے ساتھ کرنا"[2]

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائی کھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اورآخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے میں نے تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی کہ تم کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ۔اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہا نہ مانناہاں دنیا کے کاموں میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اس کے رستے پرچلناپھر تم کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے تو جو کام تم کر تے رہے ہو سب سے تم کو آگاہ کر دوں گا"[3]

کافر اور مشرک باپ کے ساتھ دنیاوی لین دین میں ادب واحترام کا معاملہ رکھنا چاہئیے اسی کی طرف اللہ تعالی کے قول میں اشارہ ہے:

"اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو۔ بےشک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سےکہا کہ اباآپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھے اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ابّا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرےساتھ ہو جائے میں آپ کو سیدھی راہ پر لے چلوں گا ابّا شیطان کی پرستش نہ کیجیئے۔ بےشک شیطان

---

[1]بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی اسامہ الی الحرقات من جھینۃ،رقم:4270،4271

[2]الاسراء23:17

[3]لقمان1415:31

اللہ کا نافرمان ہے۔اب مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو اللہ کا عذاب آپکڑے تو آپ شیطان کی ساتھی ہو جائیں"[1]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد محترم نے آپ کی دعوت نہیں مانی لیکن پھر بھی آپ نے اُن کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے فرمایا:

" ابراہیم(علیہ السلام)نے سلام علیکم کہا اور کہا کہ میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش مانگوں گابے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے"[2]

اور ارشاد ہے:" اور (مجھے) اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بنایا ہے) اور سرکش وبدبخت نہیں بنایا۔[3]

احادیث میں بھی ہدایات ہیں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

" ایک شخص نے نبی علیہ السلامسے پوچھا: کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا اور والدین کے ساتھ نیک معاملہ کرنا، پھر اللہ کے راستے میں جہاد کرنا"[4]

صرف یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے موقع پر تو نبی علیہ السلام نے ایک صحابی کو جہاد پر جانے سے اس لیے روک دیا تاکہ وہ والدہ کی خدمت کر سکے:

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا ”کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟“انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”پھر انہیں میں جہاد کرو۔(یعنی ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو)"[5]

والدین کی نافرمانی کو "اکبر الکبائر"کہا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ نبی علیہ السلاماس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی)سب سے بڑے گناہ ہیں(آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی۔ نبی علیہ السلاماسی بات

---

[1] مریم:19 :41تا44

[2] مریم19: 47

[3] نفس مصدر آیت32

[4] بخاری،کتاب التوحید،باب وسمی النبی الصلاۃ عملا وقال:لاصلاۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب،رقم:7534،مسلم،کتاب الایمان،باب بیان کون الایمان باللہ تعالی افضل الاعمال،رقم:266

[5] بخاری،کتاب الجہاد والسیر،باب الجہاد باذن الابوین،رقم:3004،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانہما احق بہ،رقم:6668

کو مسلسل اٹکہراتے رہے کہ میں سوچنے لگا کہ نبی علیہ السلامخاموش نہیں ہوں گے "[1]

اورصحیحین کی روایت پہلی گزر چکی ہے کہ:

"مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں (اور باپ)کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،(واجب حقوق کی(ادائیگی نہ کرنا اور)دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر)دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو حرام قرار دیا ہے"[2]

والدین کے بہت سارے حقوق میں ایک اہم حق اُن کا نان نفقہ ہے جو اولاد کے ذمے واجب ہوتی ہے۔امام ابو داؤد رحمہ اللہ کی روایت میں ہے:

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور والد بھی ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت بھی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کا ہے (یعنی ان کی خبرگیری کرنا تجھ پر لازم ہے)تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"[3]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے معالم السنن شرح ابو داؤد میں ہے کہ:

"اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ بچہ اگر باصلاحیت ہو تو والدین کا نفقہ بچے پر واجب ہے۔البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ کن والدین کا نفقہ بچوں پر واجب ہے؟امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صرف فقیر اور اپاہج والدین کا نفقہ بچے پر واجب ہے۔پس اگر والد مال دار ہو اور صحیح سالم ہو اپاہج نہ ہو تو اس کا نفقہ بچے پر واجب نہیں ہے۔جب کہ دیگر تمام فقہاء فرماتے ہیں کہ والدین کا نفقہ بچے پر واجب ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کے علاوہ میرے علم میں کوئی فقیہ ایسا نہیں ہے جس نے اپاہج کی شرط لگائی ہو"[4]

شریعت اس بارے میں کمزوری اور غفلت بالکل برداشت نہیں کر تی۔حدیث میں آتا ہے کہ:

---

[1]بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدینمنالکبائر،رقم:5976،مسلم،کتابالإیمان،بابببیانالکبائروأکبرھا،رقم:269

[2]بخاری،نفس مصدر،رقم:5975،مسلم نفس مصدر رقم:4580

[3]سنن ابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم:3532

[4]احمد بن محمد،الخطابی،معالم السنن،ج3،ص165،المطبعۃ العلمیۃ،حلب،1351ھ

نبی علیہ السلام نے فرمایا: "آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے
یہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کردے جن کے اخراجات
کی ذمہ داری اس کے اوپر ہو "[1]

بڑھاپے میں والدین کی خدمت کرنے میں کوتاہی کرنا تباہی کا موجب ہے اور نبی علیہ السلام کی بددعا کا استحقاق ہے۔صحیح مسلم کے روایت میں آتا ہے:

" اس شخص کی ناک خاک آلود ہواس شخص کی ناک خاک آلود ہواس شخص کی ناک خاک آلود ہو۔پوچھا گیا یا رسول اللہ کس کی؟ فرمایا جس شخص نے اپنےوالدین میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور اُن کی اتنی خدمت نہ کی کہ جس کے بدلے میں وہ جنت میں جائے"[2]

والدین اگر تمہارے کسی ذاتی کام کے بارے ناپسندیدگی ظاہر کر دیں تو بھی اُن کے دل رکھنے کی خاطر اُن کی بات ماننی چاہئیے۔چاہے وہ کسی کو بیوی چھوڑنے کا کیوں نہ کہیں، ترمذی کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی، مجھے اس سے محبت تھی، اور میرے والد اسے ناپسند کرتے تھے۔ میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں، لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر میں نے اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا" :عبداللہ ! تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو"[3] ،[4]

والدین کی خوشی کے خاطر اُن کے رشتہ دار اور دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک بھی والدین کے حقوق میں سے ہیں۔جیسا کہ:سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ کی روایت میں ہے:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ کی طرف جاتے ہوئےراستے میں ایک دیہاتی ملے۔عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اُس کو سلام کیا اور اس کواپنی سواری پربٹھایا،اپنے سر سے عمامہ اتار کر اُسے دیا۔اُن کے رفقاء میں سے ابن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے یہ دیہاتی لوگ تو بہت کم چیز پر بھی خوش ہوتے ہیں(آپ نے اسے اتنی اہمیت کیوں دی؟) اس پر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کے والد کے میرے والد سے تعلقات تھے اور میں نے نبی علیہ السلامکو فرماتے ہوئے سنا : "سب سے بہتر سلوک اور سب سے اچھا برتاؤ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے"[5]

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب الزکوۃ،باب فی صلۃ الرحم:رقم:1694

[2]مسلم،کتاب البر والصلۃ،باب رغم انف من ادرک ابویہ او احدھما عندالکبر فلم یدخل الجنۃ ،رقم:6674

[3]ترمذی،کتاب الطلاق،باب الرجل یسئالہ ابوہ ان یطلق زوجتہ،رقم:1189

[4]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج1،ص189

[5]صحیح مسلم،کتاب البروالصلۃ والادب،باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوہما،رقم:6677

(6)عورت (ماں،بیٹی،بیوی ،بہن وغیرہ) کامقام: عورتوں کے بارے میں سیرتِ طیبہ نے مسلمانوں پر جتنے حقوق لازم کئے ہیں اسلام سے پہلے کسی بھی مذہب نے لازم نہیں کئے۔اسلام کی نظر میں مرد اور عورت بحیثیت انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں۔

یونانی عورت ذات کو"رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ"((یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں) کہا کرتے تھے۔اہل روم اسے شیطان کے آلہ کار کہتے تھے۔ ہندی تہذیب میں عورت لکڑی کی مانند تھی جو صرف شوہر کی قبر پرجلنے کے لیے استعمال ہو۔زمانۂ جاہلیت میں بعض قبائل میں تو لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفناتے تھے[1]۔

آج کی ترقی کے دعوے دار تہذیبوں نے آزادی کے نام پر عورت کے حقوق چھین لئے ہیں۔آزادی کے نام پر عورت سے حقِ نفقہ چھین کر میدان عمل میں دھکیلایا گیا ۔

اسلام آنے سے عورت ظلم کے اندھیروں ،قہروجبر کے ماحول،انسانیت سے گرے ہوئے ماحول اور پستی کی زندگی سے نکل کرسکھ کی زندگی جینے کی قابل ہوئی۔اسے مرد جیسے حقوق ملے الغرض تاریخ میں کہیں بھی عورت کو ایسے حقوق نہیں ملے تھے جو اُنہیں اسلام نے دئے۔ذیل میں چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(1)حقِ میراث: چاہے یہ عورت ماں کی صورت میں ہو،بیٹی یا بیوی کی صورت میں ہو بلکہ بعض دفعہ توبہن اور پھوپھی بھی وارث بن سکتی ہے۔

عورتوں کی میراث کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشادہے:

> "اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا ۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے ، اگر اس (میت) کی اولاد ہو ، اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے ، ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے ۔ یہ حصے اس وصیت (کی تکمیل) کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد ، تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہچانے میں زیادہ قریب ہے ، یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والاہے"[2]

(2)حدود اور سزاؤں میں مساوات:اسلام عورت اورمرد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ دونوں کو کسی غیر اسلامی فعل کے ارتکاب کے نتیجے میں ایک ہی قسم کی سزاتجویز کرتا ہے۔قُرآن کریم کا ارشاد ہے:

---

[1]الشیخ عطیة،صقر،موسوعة الاسرة تحت رعایة الاسلام،ج2ص343تا349
[2]النساء 11:4

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست (اور) صاحب حکمت ہے"[1]

اوردوسری جگہ ارشاد ہے:

"زناکار عورت و مرد،دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اللہکے حکم میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہونی چاہئیے"[2]

(3)خلقت میں مساوات:اللہ جل شانہ نے بحیثیت انسان مرد عورت کی تخلیق ایک ہی قسم کی فرمائی ہے۔دونوں میں کوئی تفریق نہیں فرمائی ۔اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا ۔ اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیئے۔ اور اللہ سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت بر آری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[3]

اور ارشاد ہے:

"لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بےشک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے"[4]

(4)زندگی کے تمام مراحل میں عورت کے حقوق کی حفاظت کی قانون سازی کرنا:

اللہ جل شانہ نے عورت سے متعلقہ تمام حقوق کے بارے میں ارشادات فرمائے ہیں جو عورت کو زندگی اور اُس کی حفاظت کی ذمہ داری فراہم کرتے ہیں۔حالتِ حمل سے لے کروفات اور کفن دفن تک زندگی کے ہر شعبے میں اسلام ہدایات فراہم کرتا ہے۔حق نکاح میں اُ ن کی مرضی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔اوراولاد کو یہاں تک پابند کیا گیا ہے کہ اگر جنت چاہتے ہو تو یہ تمہیں ماں کے قدموں یعنی اُن کی خدمت میں ملے گی۔

مسلمان عورت اللہ کے راستے میں مرد کے شانہ بشانہ رہ کر خدمات سرانجام دیتی آ رہی ہے،علم کا میدان ہو یا جہاد کا،تیمارداری ہویامجاہدین کی زخم پٹی کرانی ہو ،ہر مرحلے میں اُنہوں نے قربانی دی ہیں۔ام المؤمنین سیدہ عایشہ رضی اللہ عنہا علم کے باب میں یکتائے روزگار تھیں۔بہت ساری روایات اُ ن سے منقول ہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن سے مسائل پوچھتے تھے۔

---

[1] النساء38:5
[2] النور2:24
[3] النساء1:5
[4] الحجرات13:49

(5)شرعی احکام پر مساوی اجر وثواب ملنا: بلوغت کے بعد جب انسان احکام کا مکلف بن جاتا ہے۔تو جب وہ کوئی حکم بجا لاتا ہے چاہے مرد ہو یا عورت،اُسے ایک جیسا اجر وثواب ملے گا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"جومسلمان مرد یا عورت کوئی نیک کام کرےگا ہم اُسے دنیا کی پاک زندگی دیں گے اور آخرت میں بہت ہی اچھا بدلہ دیں گے"[1]

اور ارشاد ہے:

"نیک مومن مرد یا عورت جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی"[2]

اب ہم مرحلہ وار عورت کے پیدائش سے لے کر آخر تک کےحقوق وتکریمات سیرتِ نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

پہلامرحلہ : لڑکی کے قتل کے ارتکاب کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ۔ صحیحین کی روایت ہے کہ:

" مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں (اور باپ)کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، (واجب حقوق کی)ادائیگی نہ کرنا اور)دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر(دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے"[3]

اس کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ماں کی نافرمانی حرام اورباتفاق علماء کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔بہت سارے احادیث سے اس کا کبیرہ ہونا ثابت ہے۔اسی طرح والد کی نافرمانی بھی کبیرہ گناہ ہے۔یہاں صرف ماں کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ والدہ کی نافرمانی والد کے نافرمانی سےزیادہ گناہ ہے۔اسی وجہ سے نبی علیہ السلام نے جب ایک سائل نے سوال کیا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کو ن ہے؟ فرمایا،ماں۔تین دفعہ ماں فرمایا اور چوتھے دفعہ فرمایا:باپ۔اور اسی وجہ سے بھی یہاں صرف ماں کاتذکرہ ہے کہ والد کے مقابلہ میں والدہ کی نافرمانی زیادہ ہوتی ہے۔

" جہاں تک" وَأْدَ الْبَنَاتِ "کا تعلق ہے تو اس سے مطلب ہے:اُن کو زندہ درگور کرنا،تاکہ وہ مٹی تلے مر جائیں۔یہ ہلاک کرنے ولاے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔کیونکہ یہ بے گناہ قتل کے ساتح ساتھ رشتہ داری قطع کرنا ہے۔صرف بیٹیوں کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔[4]

جب کہ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا قول ہے: لڑکیوں کو زند ہ درگو ر کرنے کے دو طریقے تھے۔پہلا یہ کہ جب عورت وضع حمل کے قریب ہوجاتی تو اُسے کہا جاتا کہ ایک گڑھے کے قریب جاؤ۔اگر لڑکا پید اہوجاتا تو اُسے واپس اور اگر لڑکی پیدو ہوجاتی

---

[1] النحل97:16

[2] النساء 124:5

[3] بخاری،کتاب فی الاستقراض، باب ماینھی عن اضاعۃ المال، رقم:2408،مسلم،کتاب الاقضیۃ،باب النھی عن کثرۃ المسائل من غیر حاجۃ۔رقم:4580

[4] شرح النووی علی صحیح مسلم،باب النھی عن کثرۃ السؤال،ج6ص145

تو اسے اس گڑھے میں ڈال دیتی تھی۔پہلے فریق کے ہاں یہ قول زیادہ راجح ہے ۔دوسرا یہ کہ لڑکی جب کچھ بڑی ہوجاتی تو اُس کے ماں کو کہا جاتا کہ اسے تیار کرلو تا کہ میں اسے رشتہ داروں کے ہاں لے چلو۔اسی بہانے اُسے صحراء میں لے جاکر کسی کنویں کے قریب لے جاتا اور اسے کہاجاتا کہ کنویں میں دیکھو اسی وقت اسے کنویں دھکیل دیا جاتا اور پتھر وغیرہ سے ڈھانپ دیاجاتا۔[1]

پیدائش پر خوشی منانے (عقیقہ کرنے)کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ترمذی کی روایت ہے کہ:

"ام کرز [2]رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ انہوں نے نبی علیہ السلامسے عقیقہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا :
"لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے گی، وہ جانور نر یا ہو مادہ اس میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں"[3]"[4]

اسلام نے تو عورت کے لیے نام بھی بامعنی رکھنے کا حکم دیا ہے ایک حدیث میں ہے کہ:

"سیدنا عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے"عاصیہ(گناہگا عورت)"نام تبدیل کرکے "جمیلہ(خوبصورت عورت)"رکھ دیا تھا"[5]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

" سیدہ زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ میرا نام"برّہ" تھا تو نبی علیہ السلام نے میرا نام زینب رکھ دیا۔ اور فرماتی ہے کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نام(بھی)"برہ" تھا اُن کا نام بھی زینب رکھ دیا"[6]

لڑکی کو جہنم سے بچاؤ کاذریعہ بتایا گیا ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ:

"عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنی دو بچیوں کو لیے مانگتی ہوئی آئی۔ میرے پاس ایک کھجور کے سوا اس وقت اور کچھ نہ تھا میں نے وہی دے دی۔ وہ ایک کھجور اس نے اپنی دونوں بچیوں میں تقسیم کر دی اور خود نہیں کھائی۔ پھر وہ اٹھی اور چلی گئی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلامتشریف لائے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حال بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ان بچیوں کی وجہ سے خود کو معمولی سی بھی تکلیف میں

---

[1]فتح الباری،ج10،ص407

[2]ام کرز صحابیہ جلیلہ ہےخزاعی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔حدیبیہ کے دن اسلام لائیں جب رسول اللہ ﷺاونٹ کا گوشت تقسیم فرما رہے تھے۔عقیقہ کی حدیث آن سے مروی ہے۔احمد بن علی،ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ج8،ص286رقم:12219، دار جیل، بیروت ، 1412

[3]سنن ترمذی،کتاب الاضاحی،باب الاذان فی اذن المولود،رقم:1516

[4]قال الشيخ الألباني : صحيح ،صحیح وضعیفسنن ترمذی،ج4،ص16

[5]مسلم،کتاب الآداب،باب استحباب تغییر الاسم القبیح،رقم5727

[6]مسلم،کتاب الآداب،باب استحباب تغییر الاسم القبیح،رقم5732

جائیں گی"[1]

صحیحین کی روایت میں ہے کہ:

"نبی علیہ السلامامامہ بنت زینب بنت نبی علیہ السلامکو)بعض اوقات(نماز پڑھتے وقت اٹھائے ہوتے تھے۔ ابوالعاص بن ربیعہ بن عبدشمس کی حدیث میں ہے کہ سجدہ میں جاتے تو اتار دیتے اور جب قیام فرماتے تو اٹھا لیتے"[2]

اسی طرح بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا ''جس کسی کے پاس بھی کوئی باندی ہو اور وہ اسے پورے حسن و خوبی کے ساتھ ادب سکھائے، پھر آزاد کر کے اس سے شادی کر لے تو اسے دوگنا ثواب ملتا ہے اور جو غلام اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے بھی تو اسے بھی دوگنا ثواب ملتا ہے"[3]

دوسرامرحلہ (بلوغت):بلوغت کے بعد عموما نکاح کا مرحلہ آتا ہے،نکاح میں اسلام نے لڑکی کی مرضی ضروری قرار دی ہے۔ ولی ہونے کے واسطے اگر چہ ایک گونہ اس کا حق بنتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" ولی کے اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا"[4]،[5]

تیسرا مرحلہ(بحیثیت بیوی):

بیوی چونکہ جیون ساتھی ہوتی ہے اس وجہ سے "بیوی" کے متعلق اسلامی احکامات مبنی بر حقیقت اور دائمی ہیں جیسا کہ درجہ ذیل ہیں:

1۔نرمی کا سلوک:اسلام دین فطرت ہے اور فطری طور عورت کمزور پیدا کی گئی ہے اس وجہ سے سیرت میں بیوی کے ساتھ انتہائی نرمی کے سلوک کاحکم ہےحدیث میں آتا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا:عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں بھی سب سے زیادہ ٹیڑھا اس کے اوپر کا حصہ ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ ڈالو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی باقی رہ جائے گی اس لیے میں تمہیں عورتوں کے بارے میں اچھے سلوک کی وصیت کرتا ہوں"[6]

---

[1]بخاری،کتاب الزکاۃ،باب اتقواالنار ولو بشق تمرۃ والقلیل من الصدقۃ،رقم:1418،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب فضل الاحسان الی البنات،رقم:6862

[2]بخاری،کتاب الصلوٰۃ،باب اذاحمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ،رقم:516،مسلم،کتاب الساجد،باب جوازحمل الصبیان فی الصلوٰۃ،رقم:1240

[3]بخاری،کتاب العتق،باب العبد اذا احسن عبادۃ ربہ ونصح سیدہ،رقم2547

[4]سنن ابوداؤد،کتاب النکاح،باب لانکاح الا بولی،رقم:2087

[5]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج5،ص85

[6]بخاری،کتاب أحادیث الأنبیاء.باب خلق آدم صلوات اللہ علیہ وذریتہ،رقم:3331،مسلم،کتاب الرضاع،باب وصیۃ النساء۔رقم:3719

" فاستوصوا بالنساء " کی تفصیل میں علماء کہتے ہیں۔

"یہاں" بالنساء خیرا "میں اس بات کی طرف اشارہ ہےکہ عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں اعتدال سے کام لینا چاہئیےـنہ تو اُن کے ساتھ اتنی سختی کی جائے کہ ٹوٹ(بگڑ)جائے اور نہ ہی کھلا چھوٹ دیا جائے کہ مزید بگڑ جائے۔اسی طرف مصنف نے اپنے مابعد کے عبارت" باب قوا أنفسكم وأهليكم نارا "میں اشارہ کیا ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ نہ تو اُن کو مکمل چوٹ دینی چاہئیے کہ (مزید) گناہوں کاارتکاب کرنے لگیناور فرائض وواجبات چوڑبیٹھیں ۔بلکہ مباحات کے سلسلے میں چشم پوشی اختیار کرنا ہے۔[1]

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"حدیث میں استحباب کے درجے میں یہ بات ہے کہ اس سے تالیف قلب حاصل ہوتا ہے۔اور اس میں عورتوں کے تربیت کاذکر ہے کہ اُن میں موجود خامیوں کے باوجود اُن کو معاف کیا جائیں۔کیونکہ جو شخص اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے گا (یہ تب ممکن ہے جب) اُن کی بشری کمزوریوں سے چشم پوشی اختیار کی جائے۔ انسان(مرد) اُن کے تعاون سے مستغنی نہیں ہو سکتا کیونکہ مرد اپنے معاش میں اُن سے مدد لیتا ہے۔اور اُن سے مدد لینا تب ممکن ہے جب اُن کی مشری کمزور یوں سے چشم پوشی اختیارکی جائے"[2][3]

اور ارشاد فرمایا ہے کہ:""سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں اور جب تم میں سے کوئی مر جائے تو اسے خیر باد کہہ دو، یعنی اس کی برائیوں کو یاد نہ کرو۔[4]،[5]

اسی طرح ایک سفر کا واقعہ ہے کہ :

"انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامایک سفر میں تھے اور آپ کے ساتھ آپ کا ایک حبشی غلام تھا۔ ان کا نام انجشہ [6]تھا وہ حدی پڑھ رہا تھا (جس کی وجہ سے سواری تیز چلنے لگی)۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا "افسوس »ویحك«اے انجشہ! شیشوں (عورتوں)کے ساتھ آہستہ آہستہ چل"[7]

عورتوں کے نان نفقے کے حقوق مرد پرلازم ہیں کیونکہ:

" مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے کہ اللہ نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ

---

[1] ابن حجر،فتح الباری،ج9،ص254

[2] ابن حجر،فتح الباری،ج9،ص254

[3] یہ حدیث صحیح ہے ۔الالبانی،صحیح و ضعیف سنن ترمذی،ج8،ص395

[4] سنن تر مذی،کتاب المناقب،باب فضل ازواج النبی ﷺ،رقم:3895

[5] البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج8،ص395

[6] سیدنا انجشہ آپﷺ کے کالے غلام صحابی تھے۔کے عورتوں کے ساربان تھے۔بہترین حدی خواں تھے۔الاستیعاب140/1

[7] بخاری،کتاب الادب،باب ما جآء فی الرجل ویلک،رقم:6161،مسلم،کتاب الفضائل،باب فی رحمۃ النبی ﷺ للنسآء وامر السواق مطایاھن بالرفق بھن، رقم:6180

کرتے ہیں۔تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرماں بردار ہوتی ہیں اور اُن کی پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں مال و آبرو کی خبرداری کرتی ہیں اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سر کشی اوربد خوئی کرنے لگی ہے تو پہلے ان کو زبانی سمجھاؤ،اگر نہ سمجھیں تو پھر اُن کے ساتھ سونا ترک کر دواگر اس پربھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو۔پھر اگر تمہارا کہنا مان لیں تو پھر اُن کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔بے شک اللہ بہت اونچاہے بڑا ہے"۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :

"اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد " الرِّجالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّساءِ " مبتدا خبر ہے۔یعنی مرد عورتوں ہتاکے نان نفقے اور اُن سے تکالیف دور کرنے کا ذمہ دار/قوام ہوتا ہے۔علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد" وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ " سے یہ معنی اخذ کیا ہے کہ جب شوہر بیوی کے نان نفقے سے عاجز ہو جائے تو پھر وہ قوام کے صفت پر باقی نہیں ر ہتا اور جب وہ اس صفت پر باقی نہیں رہا تو بیوی کو فسخ نکاح /عقد کااختیار ہوگا کیونکہ جس مقصد کے لیے نکاح ہواتھا وہ فوت ہوچکا۔اسی طرح اس میں یہ بھی واضح دلیل ہے کہ نان نفقے فراہم نہ کرسکنے کی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیارحاصل ہوتا ہے۔یہی مذہب امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی صورت میں بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اور اگر قرض دار غریب ہو تو (اسے) مالداری (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)"[2]

نفقہ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے":

" میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول! ہمارے اوپر ہماری بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہ جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب پہنو یا کماؤ تو اسے بھی پہناؤ، چہرے پر نہ مارو، برا بھلا نہ کہو، اور گھر کے علاوہ اس سے جدائی اختیار نہ کرو"[3]

عورت کے ساتھ مدارات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے :

"باب الْمُدَارَاةِ مَعَ النِّسَاءِ"

اور اس میں احادیث بھی لائے ہیں جیساکہ :

---

[1] النساء34:4

[2] محمد بن احمد،القرطبی،الجامٔ لاحکام القرآن،ج5،ص169،168،دار الکتب المصیہ،القاہرہ،1384ھ

[3] سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی حق المراۃ علی زوجھا،رقم:2144

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے اور اگر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہو گے تو اس کی ٹیڑھ کے ساتھ ہی فائدہ حاصل کرو گے"[1]

اسلام میں عورت کو مارنے سے منع فرمایا گیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح نہ مارے کہ پھر دوسرے دن اس سے ہمبستر ہو گا"[2]

عورت سے متعلق انسانی ضروریات کی رعایت رکھنا بھی اسلام ہی سکھاتا ہے۔ارشاد نبوی ہے:

"عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بیان کیا، انہوں نے بیان کیا کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عبداللہ! کیا میری یہ اطلاع صحیح ہے کہ تم)روزانہ(دن میں روزے رکھتے ہو اور رات بھر عبادت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہ! نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزے بھی رکھو اور بغیر روزے بھی رہو۔ رات میں عبادت بھی کرو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے"[3]

سنت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام نےعورت کی راحت اور تنشیط کے مواقع فراہم کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

"ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلامکو دیکھا کہ آپ مجھے اپنی چادر سے آڑ کئے ہوئے تھے، اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی کہ وہ مسجد میں کھیل رہے تھے، یہاں تک کہ میں خود ہی اکتا گئی، تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ ایک کم سن لڑکی کھیل کود (دیکھنے)کی کتنی حریص ہوتی ہے"[4]

اسی طرح عورت اگر اپنی مرضی سے چاہے توگھر وغیرہ کاکام کر سکتی ہے اُسے مجبو رنہیں کیا جاسکتا۔ سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے:

"اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ زبیر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے شادی کی تو ان کے پاس ایک اونٹ اور ان کے گھوڑے کے سوا روئے زمین پر کوئی مال، کوئی غلام، کوئی چیز نہیں تھی۔ میں ہی ان کا گھوڑا چراتی، پانی پلاتی، ان کا ڈول سیتی اور آٹا گوندھتی۔ میں اچھی طرح روٹی

---

[1]بخاری،کتاب النکاح،باب المداراۃ مع النساء،رقم"5184

[2]بخاری،کتاب النکاح،بب مایکرہ من ضرب النساء، رقم:5204

[3]بخاری،کتاب النکاح،باب لزوجک علیک حق،رقم:5199،مسلم،کتاب الصیام،باب النھی عن صوم الدھررقم:2795

[4]مسلم،کتاب صلوۃ العیدین،باب الرخصۃ فی اللعب الذی لامعصیۃ فیہ فی ایام العید،رقم:2101

نہیں پکا سکتی تھی۔ انصار کی کچھ لڑکیاں میری روٹی پکا جاتی تھیں۔ یہ بڑی سچی اور باوفا عورتیں تھیں۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی وہ زمین جو نبی علیہ السلامنے انہیں دی تھی، اس سے میں اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں گھر لایا کرتی تھی۔ یہ زمین میرے گھر سے دو میل دور تھی۔ ایک روز میں آ رہی تھی اور گٹھلیاں میرے سر پر تھیں کہ راستے میں نبی علیہ السلامسے ملاقات ہو گئی۔ نبی علیہ السلامکے ساتھ قبیلہ انصار کے کئی آدمی تھے۔ نبی علیہ السلامنے مجھے بلایا پھر)اپنے اونٹ کو بٹھانے کے لیے(کہا اخ اخ۔ نبی علیہ السلامچاہتے تھے کہ مجھے اپنی سواری پر اپنے پیچھے سوار کر لیں لیکن مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم آئی اور زبیر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا بھی خیال آیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ بڑے ہی باغیرت تھے۔ نبی علیہ السلامبھی سمجھ گئے کہ میں شرم محسوس کر رہی ہوں۔ اس لیے آپ آگے بڑھ گئے۔ پھر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور ان سے واقعہ کا ذکر کیا کہ نبی علیہ السلامسے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ میرے سر پر گٹھلیاں تھیں اور نبی علیہ السلامکے ساتھ آپ کے چند صحابہ بھی تھے۔ نبی علیہ السلامنے اپنا اونٹ مجھے بٹھانے کے لیے بٹھایا لیکن مجھے اس سے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا بھی خیال آیا۔ اس پر زبیر نے کہا کہ اللہ کی قسم! مجھ کو تو اس سے بڑا رنج ہوا کہ تو گٹھلیاں لانے کے لیے نکلے اگر تو نبی علیہ السلامکے ساتھ سوار ہو جاتی تو اتنی غیرت کی بات نہ تھی)کیونکہ اسماء رضی اللہ عنہا آپ کی سالی اور بھاوج دونوں ہوتی تھیں(اس کے بعد میرے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام میرے پاس بھیج دیا وہ گھوڑے کا سب کام کرنے لگا اور میں بےفکر ہو گئی گویا والد ماجد ابوبکر رضی اللہ عنہ نے)غلام بھیج کر(مجھ کو آزاد کر دیا"[1]

چھوتامرحلہ(ماں) جہاں اللہ تعالٰی نے اپنی عبادت کرنے کا حکم فرمایا ہے وہی والدین کے ساتھ نیک سلوک کا بھی ارشاد فرمایا ہےجیسا کہ سورة النساء اور اسراء میں ارشاد ہے:

"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسانکرو "[2]

اور ارشاد ہے:

"اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اوروالدین کے ساتھاچھا سلوک کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ

---

[1] بخاری،کتاب النکاح ،باب الغیرة،رقم:5224

[2] النساء36:5

جائیں تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے
بات ادب کے ساتھ کرنا"[1]

ماں کی خدمات ناقابل فراموش ہوتی ہیں،ماں کی ان تکالیف سہنے کے خاطر اسلام نے اُن کے ساتھ بار بار احسان کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" اور ہم نے انسان کو جسے اُس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اُٹھائے رکھتی ہے (پھر اس کو دودھ پلاتی ہے) اور (آخرکار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے (اپنے نیز) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی ہے کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی (کہ تم کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے"[2]

احادیث مبارکہ میں بھی والدین کے ساتھ عموماًاور والدہ کے ساتھ خصوصاً نیک برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے ۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"ابوہریرہرضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ تمہاری ماں ہے۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ ہے"[3]

تشریح میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ، علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ماں کے لیے باپ کے مقابلے میں تین چھوتائی حسن سلوک کرنا چاہئیے کیونکہ ماں حمل،ولادت اور رضاعت کی تکالیف برداشت کرتی ہے۔باپ تربیت میں ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔اسی طرف اللہ جل شانہ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے:"اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اورآخرکار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے " یہاں وصیت میں دونوں(ماں باپ)کو ایک درجے میں ذکر فرمایا اور ماں کو اِن تین کاموں(حمل،وضع حمل اور رضاعت) میں خاص طور پر (الگ)ذکر فرمایا"[4]

---

[1] الاسراء23:17

[2] لقمان14:31

[3] بخاری،کتاب الادب،باب من احق الناس بحسن الصحبۃ،رقم:5971،مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب بر الوالدین وانهما احق بہ،رقم:6664

[4] فتح الباری،ج10،ص402

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :اس سے مراد یہ ہے کہ ماں بچے کے حسن سلوک کی زیادہ حق دار ہے اور (ماں باپ کے درمیان حقوق کی)مزاحمت کی وقت باپ کے مقابلے میں ماں حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے"[1]

اور امام عیاض [2]رحمہ اللہ کے قول کے مطابق: "جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حسن سلوک میں ماں کامقام باپ سے زیادہ ہے"[3]

سنت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام والدین کی نافرمانی کو "گناہ کبیرہ" سے تعبیر کرتی ہے بلکہ اُسے "اکبر الکبائر"قرار دیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا: کیا میں تمہیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور بتائیے یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ نبی علیہ السلاماس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے اب آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی)سب سے بڑے گناہ ہیں(آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی۔ نبی علیہ السلاماسے مسلسل دہراتے رہے اور میں نے سوچا کہ نبی علیہ السلامخاموش نہیں ہوں گے "[4]

اسی حدیث سے ماں کی تقدس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں)اور باپ(کی نافرمانی لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا،)واجب حقوق کی(ادائیگی نہ کرنا اور)دوسروں کا مال ناجائز طریقہ پر(دبا لینا حرام قرار دیا ہے۔ اور فضول بکواس کرنے اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے"[5]

تمہاری کمائی میں والدین کا حصہ ہے روایت میں آتا ہے کہ:

" ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے پاس مال ہے اور والد بھی ہیں اور میرے والد کو میرے مال کی ضرورت ہے ،تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا” :تم اور تمہارا مال تمہارے والد ہی کا ہے)یعنی ان کی خبرگیری تجھ پر لازم ہے(تمہاری اولاد تمہاری پاکیزہ کمائی ہے تو تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ"[6]

---

[1]فتح الباری،ج10،ص402

[2]ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو بن موسیٰ بن عیاض ہیں۔ اپنے دور میں علم حدیث،نحو،لغت اور ادب کے بڑے امام تھے۔سبتہ کے قاضی رہے ہیں۔ 544ھ/1149ء کو مراکش میں آپ کو زہر دے کر قتل کر دئےگئے۔(تذکرۃ الحفاظ،ج4،ص304۔الزرکلی،الاعلام،ج10،ص374)۔

[3]فتح الباری۔ج10،ص402

[4]بخاری،کتابالأدب،بابعقوقالوالدینمنالکبائر ،رقم:5976،مسلم،کتابالإیمان،بابببیانالکبائروأکبرھا،رقم:269

[5]بخاریکتابالأدب،بابعقوقالوالدینمنالکبائر ،رقم:5975،مسلم،کتابالإیمان،بابببیانالکبائروأکبرھا، رقم:4580

[6]سنن ابو داؤد،کتاب الاجارۃ،باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ،رقم3532

ایک حدیث میں تو صراحۃً ماں کے نفقے کا حکم آیا ہے۔ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

" ہم مدینہ آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ نبی علیہ السلاممنبر پر کھڑے خطبہ دے رہے ہیں آپ فرما رہے ہیں: دینے والے کا ہاتھ اوپر والا ہے، اور پہلے انہیں دو جن کی کفالت و نگہداشت کی ذمہ داری تم پر ہو: پہلے اپنی ماں کو، پھر اپنے باپ کو، پھر اپنی بہن کو، پھر اپنے بھائی کو، پھر اپنے قریبی کو، پھر اس کے بعد کے قریبی کو"[2]"[3]

ماں کی خدمت جہاد سے مقدم ہے جیسا کہ نسائی کی روایت ہے ایک صحابی آیا اور آپ سے کہنے لگاکہ:

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میں جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اور آپ کے پاس آپ سے مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے)ان سے(پوچھا: کیا تمہاری ماں موجود ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، آپ نے فرمایا" :انہیں کی خدمت میں لگے رہو، کیونکہ جنت ان کے دونوں قدموں کے نیچے ہے"[4]"[5]

عورت کی شخصیت کو اسلام نے تسلیم کرکے اُسے سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی عالمہ کا مقام دے دیا۔کہ صحابہ اور تابعین جیسے جلیل القدر حضرات اُن سے دینی مسائل پوچھنے آتے تھے[6]۔ میدان جہاد میں بھی اپنے ہی مرضی سے مسلمان عورت کسی سے پیچھے نہیں رہی ہے۔ سیدہ ام عمارہ[7] رضی اللہ عنہا وغیرہ کی مثالیں مثالیں موجود ہیں۔جوغزوہ احد ،حدیبیہ،خیبر اور جنگ یمامہ میں شریک ہوئیں حتّی کہ جنگ یمامہ میں اُن کے ہاتھ مبارک بھی شہید ہوئے[8]۔عورت کی شخصیت کو تسلیم کرنے سے ہی عورتوں کی تربیت کی وجہ سے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے مثلاً: امام شافعی رحمہ اللہ:[9] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:[10](تفصیل باب دوم میں گذر چکی)

<u>(6)شوہر کا مقام:</u> عورت کے لیے شوہر کی نافرمانی کرنے کو بہت بڑا گناہ قراردیاگیا ہے حدیث میں آتا ہے :

---

[1]یہ صحابی سیدنا طارق المحاربی رضی اللہ عنہ تھے۔" سنن نسائی،کتاب الزکوۃ،باب ایتھما الید العلیا،رقم:2532"

[2]سنن نسائی،کتاب الزکوۃ،باب ایتھما الید العلیا،رقم:2532

[3]یہ حدیث صحیح ہے ،صحیح وضعیف سنن نسائی،ج6،ص176

[4]سنن نسائی،کتاب الجهاد،باب الرخصۃ فی التخلف لمن لہ والدۃ،رقم:3104

[5]البانی کے نزدیک یہحدیث صحیح ہے۔"صحیح وضعیف سنن نسائی۔ج7،ص176

[6]الاصابہ،ج8،ص17،18

[7]نسیبہ بنت کعب،انصاریہ،بنو نجا ر سے تعلق رکھنی والی صحابیہ ہےبیعت عقبہ ثانیہ میں اسلام لائیں۔الاصابہ،ج8،ص180

[8]نفس مصدر

[9]محمد بن احمد،الذہبی،سیراعلام النبلاء،ج10،ص6

[10]سیراعلام النبلاء ،ج11،ص179

عمرو بن حارث بن مصطلق کہتے ہیں ،کہا جاتا تھا کہ قیامت کے روز سب سے سخت عذاب دو طرح کے لوگوں کو ہو گا: ایک اس عورت کو جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرے، دوسرے اس امام کو جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں"[1]

بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزے نہیں رکھ سکتی۔جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر(نفلی)روزہ رکھے اور عورت کسی کو اس کے گھر میں اس کی مرضی کے بغیر آنے کی اجازت نہ دے اور عورت جو کچھ بھی اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی صریح اجازت کے بغیر خرچ کر دے تو اسے بھی اس کا آدھا ثواب ملے گا"[2]

شوہر کی اطاعت کریں ۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :جب آدمی اپنی بیوی کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بلائے تو اسے فوراً آنا چاہیئے اگرچہ وہ تنور پر ہو"[3]،[4]

(7)بحیثیت حاکم اُن کامقام: اللہ تعالی نے مرد کو قویٰ کے حولے سے مضبوط پیدا فرمایا ہے اس وجہ سے مرد انتظامی امور میں عورت کے لیے ایک قسم کاحاکم ہوتا ہے۔ اورحاکموں کے بارے میں سنت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام میں احکام اور ہدایات موجود ہیں۔قُرآن کریم میں ارشاد ہے:

" مومنو ! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے"[5]

اور طبری میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ:

" سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا جس کا امیر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بنایا اس لشکر میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے یہ لشکر جس قوم کی طرف جانا چاہتا تھا چلا، رات کے وقت اس کی بستی کے پاس پہنچ کر پڑاؤ کیا ان لوگوں کو اپنے جاسوسوں سے پتہ چل گیا اور چھپ چھپ کر سب راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف ایک شخص رہ گیا اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا انہوں نے اس کا سب اسباب جلا دیا یہ شخص رات کے اندھیرے میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آیا اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا کہ اے ابوالیقظان میں اسلام قبول کر چکا ہوں اور گواہی دے طکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس

---

[1]سنن ترمذی،ابواب الصلوۃ،باب فیمن ام قوما وھم لہ کارھون،رقم:359

[2]بخاری،کتاب النکاح،باب لا تاذن المراۃ فی بیت زوجھا لاحد الا باذنہ، رقم:5195

[3]سنن ترمذی،کتاب الرضاع،باب حق الزوج علی المرءۃ،رقم:1160

[4] قال الشیخ الالبانی :صحیح،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج3،ص160

[5]النساء4:59

کے رسول ہیں میری ساری قوم تمہارا آنا سن کر بھاگ گئی ہے صرف میں باقی رہ گیا ہوں تو کیا کل میرا یہ اسلام مجھے نفع دے گا؟ اگر نفع نہ دے تو میں بھی بھاگ جاؤں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا یقیناً یہ اسلام تمہیں نفع دے گا تم نہ بھاگو بلکہ ٹھہرے رہو۔ صبح کے وقت جب سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے لشکر کشی کی تو سوائے اس شخص کے وہاں کسی کو نہ پایا اسے اس کے مال سمیت گرفتار کر لیا گیا جب سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا اسے چھوڑ دیجئیے یہ اسلام لا چکا ہے اور میری پناہ میں ہے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم کون ہو جو کسی کو پناہ دے سکو؟ اس پر دونوں بزرگوں میں کچھ تیز کلامی ہو گئی اور قصہ بڑھا یہاں تک کہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی پناہ کو جائز قرار دیا اور فرمایا آئندہ امیر کی طرف سے پناہ نہ دینا پھر دونوں میں کچھ تیز کلامی ہونے لگی اس پر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے حضور سے کہا اس ناک کٹے غلام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کہتے؟ دیکھئے تو یہ مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا'' :خالد، عمار کو برا نہ کہو، عمار کو گالیاں دینے والے کو اللہ گالیاں دے گا، عمار سے دشمنی کرنے والے سے اللہ دشمنی رکھے گا، عمار پر جو لعنت بھیجے گا اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو گی''۔ اب تو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو لینے کے دینے پڑھ گئے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ غصہ میں چل دیئے، آپ دوڑ کر ان کے پاس گئے، دامن تھام لیا معذرت کی اور اپنی تقصیر معاف کرائی تب تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ راضی نہ ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی"[1]

حاکموں کی اطاعت: ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جائز کاموں میں حاکموں کی اطاعت کریں اور بیوی کے لیے اُس کا شوہر بھی (انتظامی امور میں) ایک قسم کا حاکم ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیحن کی روایت میں آتا ہے کہ:

"نبی علیہ السلام نے ایک لشکر بھیجا جس کی سرداری ایک انصاری رضی اللہ عنہ کو دی ایک مرتبہ وہ لوگوں پر سخت غصہ ہو گئے اور فرمانے لگے کیا تمہیں نبی علیہ السلام نے میری فرمانبرداری کا حکم نہیں دیا؟ سب نے کہا ہاں بیشک دیا ہے، فرمانے لگے اچھا لکڑیاں جمع کرو پھر آگ منگوا کر لکڑیاں جلائیں پھر حکم دیا کہ تم اس آگ میں کود پڑو۔ ایک نوجوان نے کہا لوگو سنو آگ سے بچنے کے لیے ہی تو ہم نے دامن رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لی ہے تم جلدی نہ کرو

---

[1] طبری، ج7، ص178، رقم:9929

جب تک کہ نبی علیہ السلام سے ملاقات نہ ہو جائے پھر اگر
آپ بھی یہی فرمائیں تو بے جھجھک اس آگ میں کود پڑھنا
چنانچہ یہ لوگ واپس نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر
ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا آپ نے فرمایا" :اگر تم اس آگ
میں کود پڑھتے تو ہمیشہ آگ ہی میں جلتے رہتے۔ سنو
فرمانبرداری صرف معروف میں ہے"[1]

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

" مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے جی چاہے یا طبیعت رو کے لیکن اس وقت تک کہ (اللہ تعالیٰ اور رسول کی)نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے "[2]

اور ارشاد ہے کہ:

" سیدنا عبادہ بن صامترضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم سے نبی علیہ السلام نے بیعت لی کہ کام کے اہل سے اس کام کو نہ چھینیں۔ لیکن جب تم ان کا کھلا کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی واضح الٰہی دلیل بھی ہو "[3]

امیر کی اطاعت کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہئیے کہ امیر کس قبیلے،رنگ اور نسل سے تعلق رکھتا ہےجیسا کہ نبی علیہ السلام کے اس فرمان مبارک میں ہے:

" سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام امیر بنایا گیا ہو چاہے کہ اس کا سر کشمکش جیسا ہو"[4]

دفعہ:۷

تمام لوگ قانون کی نظر میں برابر ،امان اور بچاؤ کے حقدار ہیں۔

<u>سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ:</u>اسلام میں خطبہ حجۃ الوداع کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔جوکہ اسلام کا عالمی منشورکہاجاتا ہے۔ویسے تو نبی علیہ السلام کی پوری زندگی مساوات کی عملی تصویر تھی اس کے علاوہ" مساوات" کی اہمیت کے پیش نظراُس خطبہ میں نبی علیہ السلام نے دیگر اہم امور کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں بھی ارشادات فرمائے۔ارشاد ہے:

"سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:ایام
تشریق کے دوران نبی علیہ السلام نے ہمیں آخری خطبہ دے کر
فرمایا:اے لوگو!بے شک تمہارا رب ایک ہے،تمہارا باپ ایک
ہے۔خبردار کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی
پر،کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پرکوئی
فضیلت نہیں ہے،مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔بے شک اللہ تعالی
کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ
تعالی سے زیادہ ڈرتےہو"[5]

---

[1]بخاری،کتابالجہاد والسیر،باب سریۃ عبداللہ بن حذافہ السہمی،رقم:4340
[2]بخاری،کتاب الجہاد والسیر،باب السمع والطاعۃ للامام،رقم:2955
[3]بخاری،کتاب الفتن،باب قول النبی سترون بعدی امورا تنکرونھا،رقم:7056
[4]بخاری،کتاب الفتن ،باب امامۃ العبد والمولیٰ،رقم:693
[5] احمد بن حسین،البیہقی،شعب الایمان-ج7،ص132،رقم:4774،مکتبۃ الرشد للنشر والتوزیع-الریاض،1423ھ

اور بخاری کی روایت ہے جس میں تمام انسانوں کی جان،مال اور عزت وآبرو کو یکساں طورپر مساوی قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"آپ□ نے فرمایا تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔(راوی)محمدرحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ□ نے (یہ بھی فرمایا)کہ تمہاری عزت(بھی ایک دوسرے پر حرام ہے)۔جس طرح کی حرمت تمہاری آج کی دن (عرفہ)،اس شہر(مکہ مکرمہ) اور اس ماہ(ذو الحجہ) کی ہے"[1]

اور مسند احمد کی روایت ہے:

"سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:تمہاری فضیلت تمہارے گورے یاکالے رنگ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ تمہاری پرہیزگاری کی وجہ سے ہے"[2]،[3]

مسند احمد کی دوسری روایت میں ہے:

"سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:مجھے پانچ ایسی صفات دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دئے گئے ہیں اور یہ بات میں بطور فخر نہیں کہہ رہا۔مجھے ہر گورے اور کالے کی طرف بھیجا گیا ہے ۔پس جو بھی گورا یا کالا ایمان لائے وہ اس میں داخل شمار ہوگا۔اور میرے لیے پوری زمین مسجد بنایا گیا ہے"[4]

---

[1] بخاری،کتاب المغازی ،باب حجۃ الوداع،رقم:4406

[2]مسند احمد،مسند الانصار،حدیث المشائخ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ،ج5ص158،رقم:21445

[3]البانی کے نزدیک یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔صحیح الترغیب والترہیب،ج3،ص79

[4]مسند احمد،مسند الانصار ،ج1،ص250،رقم:2256

دفعہ:۸

اپنے حقوق کے سلسلے میں ہر شخص قانونی چارہ جوئی کا حقدار ہے۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ:سیرت طیبہ ہر انسان کی حیثیت تسلیم کرتی ہے چاہے حقوق ہو یا فرائض ہر دو حالتوں میں اسلام انسان کو تحفظ فراہم کرنے کی یقین دہانی کراتا ہے۔اس سلسلے میں اسلام اپنا ایک الگ عدالتی نظام رکھتا ہے ،لیکن جہاں تک عالمی منشور کے دفعات کا تعلق ہے تو چونکہ اس میں بعض دفعات احکام الٰہیہ سے متصادم ہیں اس وجہ سے جب سیرتِ طیبہ کے حوالے سے بات کی جائے گی تو یہ بات مدنظر رہے گی کہ تمام دفعات میں بیان شدہ حقوق میں اسلام کو فلاں فلاں دفعہ پر اعتراض ہے،اس وجہ سے اسلام چونکہ تمام دفعات کو بالکلیہ درست نہیں کہتا لہٰذا ہر حالت میں(یعنی تمام دفعات میں)قانونی چارہ جوئی کے ذریعے وہ حقوق حاصل کرنے کے لیے اسلامی عدالت کا دروازہ نہیں کٹھکٹایاجا سکتا۔

البتہ اس کے علاوہ تمام حقوق کے لیے وہ عدالت جا سکتا ہے اور قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔سیرت طیبہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔وقت کے نبی کی حیثیت "عدالت" کی ہوتی ہے۔اُس کے پاس مقدمات آتے ہیں وہ مدعی اور مدعا علیہ کے "دعوی" اور دلائل سُن کر فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔درجہ ذیل روایات سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی۔

(1)۔ایک دفعہ سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا نبی علیہ السلام کے پاس آئی اور اپنے خاوند کی شکایت کرنے لگی۔چپکے چپکے سے نبی علیہ السلام سے شکایت عرض کررہی تھی۔لیکن اللہ تعالی تو انسان کے شہہ رگ سے بھی قریب ہے۔خولہ رضی اللہ کی شکایت سن لی اور ظہار کا حکم آیا:

> " (اے پیغمبر) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث جدال کرتی اور اللہ سے شکایت (رنج وملال) کرتی تھی۔ اللہ نے اس کی التجا سن لی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ سنتا دیکھتا ہے"[1]

"اورسیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اللہ تعالیٰ کی ذات حمد و ثناء کے لائق ہے جس کے سننے نے تمام آوازوں کو گھیر رکھا ہے، یہ شکایت کرنے والی خاتون آ کر نبی علیہ السلام سے اس طرح چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں کہ باوجود اسی گھر میں موجود ہونے

---

[1] المجادلۃ1:58

سے میں مطلق نہ سن سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس پوشیدہ آواز کو بھی سن لیا اور یہ آیت اتری"[1]،[2]

اوربخاری کی روایت ہے:

روایت میں آپ کا یہ فرمان اس طرح منقول ہے کہ: بابرکت ہے وہ اللہ جو ہر اونچی نیچی آواز کو سنتا ہے۔[3]

اور ابن ابی حاتم نے یہ روایت نقل کی ہے:

"سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اللہ تعالیٰ کی ذات حمد و ثناء کے لائق ہے جس کے سننے نے تمام آوازوں کو گھیر رکھا ہے،یہ شکایت کرنے والی سیدہ خولہ بنت ثعلبہ[4] رضی اللہ عنہا جب نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اس طرح سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ کوئی لفظ تو کان تک پہنچ جاتا تھا ورنہ اکثر باتیں باوجود اسی گھر میں موجود ہونے کے میرے کانوں تک نہیں پہنچتی تھیں۔ اپنے میاں کی شکایت کرتے ہوئے فرمایا کہ یا رسول اللہ! میری جوانی تو ان کے ساتھ کٹی، بچے ان سے ہوئے، اب جبکہ میں بڑھیا ہو گئی، بچے پیدا کرنے کے قابل نہ رہی، تو میرے میاں نے مجھ سے ظہار کر لیا، اے اللہ میں تیرے سامنے اپنے اس دکھڑے کا رونا روتی ہوں، ابھی یہ بی بی صاحبہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام یہ آیت لے کر اترے"[5]،[6]

"اور ان کے خاوند کا نام سیدنا اوس بن صامت رضی اللہ عنہ تھا[7]۔

انہیں بھی کچھ جنون سا ہو جاتا تھا اس حالت میں اپنی بیوی صاحبہ سے ظہار کر لیتے پھر جب اچھے ہو جاتے تو گویا کچھ کہا ہی نہ تھا، یہ بی بی صاحبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھنے اور اللہ کے سامنے اپنی التجا بیان کرنے کو آئیں تھیں جس پر یہ آیت اتری۔ سیدہ خولہ رضی اللہ عنہا خود اپنا واقعہ سناتی ہے:

> "سیدہ خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم میرے اور میرے خاوند اوس بن صامت رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس سورۃ المجادلہ کی شروع کی چار آیتیں اتری ہیں، میں ان کے گھر میں تھی، یہ بوڑھے اور بڑی عمر کے تھے اور کچھ اخلاق کے بھی اچھے نہ تھے، ایک دن باتوں ہی باتوں میں میں نے ان کی کسی بات کے خلاف کہا اور انہیں کچھ جواب دیا، جس پر وہ بڑے غضب ناک ہوئے اور غصے میں فرمانے لگے، تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے پھر گھر سے چلے گئے اور قومی مجلس میں کچھ دیر بیٹھے رہے

---

[1] مسنداحمد،ج6،ص46،رقم:24696

[2] یہ حدیث صحیح ہے۔الالبانی،صحیح وضعیف سنن النسائی،ج8،ص32

[3] بخاری،کتاب التوحید،باب وکان اللہ سمیعابصیرا،رقم:7385

[4] خولہ بنت ثعلبہ بن اصرم رجی اللہ عنہاسیدنا اوس بن صامت رضی اللہ کے نکاح میں تھے۔ظہار کے معاملے میں آپ کے پاس آئیں جس کے بارے میں سورۃ مجادلہ کے آیات نازل ہوئیں۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اُن کے بہت احترام کرتے تھے۔الاستیعاب 1830/4

[5] سنن ابو داؤد،کتاب الطلاق،باب فی الظہار،رقم:2221

[6] ھذا حدیث صحیح۔الالبانی،صحیح وضعیف ابن ماجہ،ج5،ص63

[7] طبری،ج23،ص221

پھر واپس آئے اور مجھ سے خاص بات چیت کرنی چاہی، میں نے کہا: اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں خولہ کی جان ہے تمہارے اس کہنے کے بعد اب یہ بات ناممکن ہے یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہمارے بارے میں نہ ہو، لیکن وہ نہ مانے اور زبردستی کرنے لگے مگر چونکہ کمزور اور ضعیف تھے میں ان پر غالب آ گئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، میں اپنی پڑوسن کے ہاں گئی اور اس سے کپڑا مانگ کر اوڑھ کر نبی علیہ السلام کے پاس پہنچی، اس واقعہ کو بیان کیا اور بھی اپنی مصیبتیں اور تکلیفیں بیان کرنی شروع کر دیں، آپ یہی فرماتے جاتے تھے خولہ! اپنے خاوند کے بارے میں اللہ سے ڈرو، وہ بوڑھے بڑے ہیں، ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نبی علیہ السلام پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وحی اتر چکی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ''اے خولہ! تیرے اور تیرے خاوند کے بارے میں قرآن کریم کی آیتیں نازل ہوئی ہیں''، پھر آپ نے آیات سنادی۔اور فرمایا'' :جاؤ اپنے میاں سے کہو کہ ایک غلام آزاد کریں''، میں نے کہا: یا رسول اللہ ! ان کے پاس غلام کہاں؟ وہ تو بہت مسکین شخص ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' :اچھا تو دو مہینے کے لگاتار روزے رکھ لیں''، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ! وہ تو بڑی عمر کے بوڑھے ناتواں کمزور ہیں انہیں دو ماہ کے روزوں کی بھی طاقت نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ''پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق)تقریباً چار من پختہ (کھجوریں دے دیں''، میں نے کہا: یا رسول اللہ'' ! اس مسکین کے پاس یہ بھی نہیں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' :اچھا آدھا وسق کھجوریں میں اپنے پاس سے انہیں دیدوں گا ''میں نے کہا: بہتر آدھا وسق میں دیدوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' :یہ تم نے بہت اچھا کیا اور خوب کام کیا، جاؤ یہ ادا کر دو اور اپنے خاوند کے ساتھ جو تمہارے چچا کے لڑکے ہیں محبت، پیار، خیر خواہی اور فرمانبرداری سے گزارا کرو"[1]،[2]

(2)۔اپنا مقدمہ عدالت لے جاکر حق مانگنے کی ایک اور مثال سیدہ ہند رضی اللہ کا واقعہ ہے جیسا کہ روایات میں آتا ہے:" صحیحین میں حدیث ہے :

[1] مسند احمد بن حنبل، ج6،ص410،رقم:27360

[2] یہ حدیث حسن ہے،الالبانی،التعلیقات الحسان علی صحیح ابن حبان،ج6،ص328

عائشہ رضی اللہ عنہافرماتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ہندہ رضی اللہ عنہا نے نبی علیہ السلام سے کہا کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ تو کیا اگر میں ان کے مال سے چھپا کر کچھ لے لیا کروں تو کوئی حرج ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے لیے اور اپنے بیٹوں کے لیے نیک نیتی کے ساتھ اتنا لے سکتی ہو جو تم سب کے لیے کافی ہو جایا کرے"[1]

(3)۔ایک مدعی کے لیے سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کے الگ الگ فیصلے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنے حق کے لیے بالا عدالت سے رجوع کرکے قانونی چارہ جوئی کی اجازت ہے ۔

(4)۔ایک اور مثال"حدیثِ عسیلہ "ہے:

" عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی نبی علیہ السلامکی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا :یا رسول اللہ! رفاعہ نے مجھے طلاق دے دی تھی اور طلاق بھی بائن، پھر میں نے اس کے بعد عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا لیکن ان کے پاس تو کپڑے کے پلو جیسا ہے)یعنی وہ نامرد ہیں(۔ نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ غالباً تم رفاعہ کے پاس دوبارہ جانا چاہتی ہو لیکن ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم اپنے موجودہ شوہر کا مزا نہ چکھ لو اور وہ تمہارا مزہ نہ چکھ لے"[2]

(5)۔احادیث میں ایک واقعہ بھی اس قسم سے متعلق ہے ۔جیساکہ بخاری کی روایت ہے کہ :

"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے کہا بنی سہم کا ایک شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ سفر کو نکلا ' وہ ایسے ملک میں جا کر مر گیا جہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہ دونوں شخص اس کا متروکہ مال لے کر مدینہ واپس آئے۔ اس کے اسباب میں چاندی کا ایک گلاس گم تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو قسم کھانے کا حکم فرمایا)انہوں نے قسم کھا لی(پھر ایسا ہوا کہ وہ گلاس مکہ میں ملا، انہوں نے کہا ہم نے یہ گلاس تمیم اور عدی سے خریدا ہے۔ اس وقت میت کے دو عزیز)عمرو بن العاص اور مطلب کھڑے ہوئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ یہ ہماری گواہی تمیم اور عدی کی گواہی سے زیادہ معتبر ہے ' یہ گلاس میت ہی کا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ "آخر آیت تک"[3]

---

[1]بخاری،کتاب البیوع،باب من اجری الامصار علی مایتعارفون بینہم جی البیوع والاجارۃ والمکیال والمیزان،رقم:2211،مسلم،کتاب الاقضیۃ،باب قضیۃ ہند،رقم:4574

[2]بخاری،کتاب الطلاق،باب من اجازطلاق الثلاث،رقم:5260

[3]بخاری،کتاب الوصایا ۔باب قول اللہ تعالی یاایھاالذین امنوا شہادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت،رقم:2780

دفعہ:۹

قانون سے بالاتر محض حکمران طبقے کے مرضی پر کسی کو ملک بدر،نظربند یا گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ: انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے۔اُس کی آزادی پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ اسلام برداشت کر سکتا ہے اور نہ ہی دیگر مذاہب۔دنیا میں رہتے ہوئے انتظامی امور چلانے کے لیے مختلف افراد کو مختلف ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں۔حاکم اوررعایا کا تصور اسی وجہ سے ہے ورنہ کسی انسان پر اپنی مرضی مسلط کرنی کی اجازت نہیں ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ حاکم اگر مساوات کے اصولوں پر حکومت چلا رہا ہو تونہ صرف اُس کی اطاعت ضروری ہے بلکہ اُس کے ساتھ ہر ممکن تعاون بھی ضروری ہے۔ایسے حاکموں کی عزت،تکریم اور وقار کا خیال رکھنے کی تاکیدکی گئی ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی حاکم رعایا کو اپنے غلام تصور کرتے ہوں۔اُن کےحقوق اُنہیں نہیں دیتے اور رعایا کو "محکوم"سمجھ کر اپنے ذاتی غیر منصفانہ فیصلے اُن پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور رعایا کو جب چاہیں گرفتار ،نظربند یا جلاوطن کرنے کی کوشش کرتے ہوں تو اس بات کی اجازت نہ اسلام دیتا ہے اور نہ ہی عالمی منشور۔

اسلام دشمن کے ساتھ سلوک کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ سزا وجزا دیتے وقت حاکم اپنی مرضی سے کسی کو زیادتی کا نشانہ نہ بنائے۔جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

" اے ایمان والوں ! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے"[1]

حاکم ایسا نہیں ہونا چاہئیے کہ وہ لوگوں کوخود سے دور کرنے پر مجبور کریں بلکہ حاکم کو رعایا کے ساتھ ایسی نرمی کا برتاؤ رکھنا چاہئیے کہ جس سے لوگ اُس کے ساتھ رہنا پسند کریں۔اس بارے نبی علیہ السلام کی دعا بھی منقول ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

> " نبی علیہ السلام نے فرمایا:اے اللہ! جو کوئی میری امت کا حاکم بنا،اور لوگو پر سختی کرتا رہا،تو تو بھی اس کے ساتھ سختی کامعاملہ رکھ،اور جو کوئی میری امت کا حاکم بنا اور لوگو کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا رہا ،توتو بھی اُس کے ساتھ نرمی کا معامل فرما"[2]

حاکم کو رعایا کے لیے پناہ گاہ ہونا چاہئیے کہ لوگ اُس کی سرپرستی میں چین وسکون کی زندگی بسر کر سکیں نہ یہ کہ وہ رعایا کی آزادی کو سلب کرکےاُسے پابند سلاسل کریں،مسلم شریف کی روایت ہے:

---

[1] المائدہ8:5

[2] مسلم،کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر،رقم:4826

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:حاکم تو ڈھال کی طرح ہوتا ہے جس کے سایے میں لوگ لڑتے ہیں اور اُس کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔پس اگر حاکم نے لوگوکو اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا اورعدل کیا تو اُس کے لیے اجر ہے اور اگر اِس کے خلاف کیا تو یہ اُس کے لیے وبال ہوگا"[1]

دفعہ: ۱۰

ہرشہری کا حق ہے کہ کھلی عدالت میں اُس کے خلاف دائر شدہ مقدمے کی سماعت کی جائے۔

<u>سیرت طیبہ کی روشنی میں درجہ بالادفعے کاتقابلی جائزہ:</u>اس سلسلے میں خود نبی علیہ السلام کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی مانندہے۔انسانوں کے حقوق وفرائض کے تعین کے بعد اگر کسی بھی طریقے سےاِن حقوق وفرائض میں کوئی(فرد،حکومت یا کسی بھی طریقے سے قانونی یاغیر قانونی) مداخلت کرتا ہے تو اس بارے میں مقدمہ عدالت جائے گا۔پھر عدالت اُن حقوق کا تعین کر یگی کہ مدعی کے کیا حقوق ہیں اوروہ کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں؟ اسی طرح اگر کسی فرد وغیرہ پر کوئی جرم عائد کیا گیا تو اُ س کے بارے

[1]مسلم،کتاب الامارۃ،باب فی الامام اذا امر بتقوی اللہ وعدل کان لہ اجر،رقم:4878

میں جو بھی سماعت یا فیصلہ کیا جائے تا وہ ایک کھلا مقام ہوتا یعنی دوسرے شہریوں کی موجودگی میں اُس کے بارے میں کارروائی ہوگی۔

احادیث میں بہت سارے واقعات اس حوالے سے موجود ہیں۔مثلاً زنا ایک جرم ہے جس کی سزا(شادی شدہ کے لیے)رجم اور(غیرشادی شدہ کے لیے)کوڑے ہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ مخصوص طریقے سے زانی کے خلاف گواہی دیں یا خود اس فعل کے مرتکب چار دفعہ اپنے خلاف گواہی دے۔

(1)۔جیسا کہ سیدنا ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ احادیث کی کتب میں موجود ہے

اس سے صاف معلوم ہوا کہ "مدعی" کا چار دفعہ اپنے خلاف میں گواہی دینے کے بعد ایک کھلی عدالت میں اُسے سزا سنوائی گئی اور پھرسب کے سامنے کھلی عدالت میں اُس پر عملدرآمد کرایا گیا۔

(2)۔سیدنا عمررضی اللہ عنہ کے دورِخلافت میں اُن کے اپنے بیٹے کے خلاف کھل عدالت قائم کرکے مقدمہ سنایا گیا۔ جیسا کہ روایت میں ہے کہ:""

(3)۔ ایک عورت کی چوری کے موقع پر جب آپ کو سفارش کی گئی تو آپ نے منظور نہیں فرمائی اور کھلی عدالت میں اس کی سماعت فرماتے ہوئے فیصلہ صادر فرمایا، جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

> "سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مخزومی عورت کا معاملہ جس نے چوری کی تھی، قریش کے لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامسے اس معاملہ میں کون بات کر سکتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا، جو نبی علیہ السلامکو بہت پیارے ہیں اور کوئی آپ سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتا؟ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلامسے بات کی تو نبی علیہ السلامنے فرمایا ’’کیا تم اللہ کی حدوں میں سفارش کرنے آئے ہو۔‘‘پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا ’’اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنتمحمد نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد)صلی اللہ علیہ وسلم (اس کا ہاتھ ضرور کاٹ ڈالتے۔ اس کے بعد نبی علیہ السلامنے اس عورت کے لیے حکم دیا اور ان کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر اس عورت نے صدق دل سے توبہ کر لی اور شادی بھی کر لی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ بعد میں وہ میرے یہاں آتی تھیں۔ ان کو اور کوئی ضرورت ہوتی تو میں نبی علیہ السلامکے سامنے پیش کر دیتی"[1]

[1]بخاری،کتاب الحدود،باب کراهیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان،رقم:6788،4304،مسلم،کتاب الحدود،باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنهی عن الشفاعۃ،رقم:4506

فصلِ سوم

"عالمی منشور برائے انسانی حقو ق "دفعہ 11تا دفعہ 20کا سیرت نبویہ علی

صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ

عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء کادفعہ نمبر11:

(۱)جرم ثابت ہونے سے پہلے ملزم کو بے گنا ہ تصور کیا جائے گا۔اس کے ساتھ ساتھ اُسے صفائی کا پوراموقع دیا جائے گا۔

(۲)کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فرگذاشت کی بنا پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری[1] جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا،کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا۔

اصولی طور پریہ دونوں دفعات معقول ہیں لیکن دوسرے دفعے کے اس جملے سے اسلامی تعلیمات مطابقت نہیں رکھتیں۔کہ قومی یا بین الاقوامی قانون جس فعل کو تعزیری سزا سمجھتا ہو،وہ قابل گرفت ہو اور جو فعل اس قانون کی رو سے جرم تصور نہیں ہوگا ،اُس پر کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔

کہ آج کے بین الاقوامی قوانین عوام کی مرضی کے مطابق بنتے ہیں چاہے وہ کسی بھی مذہبی تعلیمات سے ہم آہنگ ہوں یا نہ ہوں بلکہ صریح مخالف بھی ہوں،تب بھی چونکہ عوام کی اکثریت اُسے چاہتی ہے اس وجہ سے عوامی رائے کے احترام میں وہ قانون بن جائے گا۔مثلا بعض مغربی ممالک میں عوام "شراب" پینا پلانا چاہتی ہے،اُن کی اس رائے کا احترام کرتے ہوئے اُن کو"شراب پینے پلانے"کی غیر مشروط اجازت دی جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات اور عملاً سیرتِ طیبہ میں ہے کہ انسان کو(چاہے عام انسان ہو یا حکمران)خاص طور پراللہ تعالی کا خلیفہ بناکر دنیا میں بھیجا گیاہے۔اس وجہ سے وہ جو بھی کام کرے گا اللہ تعالی کے منشاء کے مطابق کرے گا۔حکمران ہو کر جب وہ کوئی قانون بنائے گا تو اس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پرہوگی ۔خواہشاتِ نفسانیہ،ذاتی مفاد،رعایا کے ہر جائز ناجائز مطالبے کو ماننا اور الٰہی احکام کی بجائے انسانی ذہنوں کی اختراع سے بنے ہوئے قوانین کو لاگو کرنا یا لاگو کرنے کی کوشش کرنا اُس کے لیے کبھی بھی جائز نہیں ہو گا ۔آج دنیا میں اس عوامی رائے کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے جس پر عوامی رائے کی اکثریت ہو

---

[1]وہ سزائیں جنہیں کتاب وسنت نے متعین تو نہیں کیا ہے مگر جن برے کاموں کی یہ سزائیں ہیں ان کو جرائم کی فہرست میں داخل کیا ہے اور سزا کے تعین کا مسئلہ حاکم یا حکومت کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ موقع ومحل اور ضرورت کے مطابق سزا خود متعین کریں گویا اس قسم کی سزاؤں میں حکومت کو قانون سازی کا حق بھی حاصل ہے مگر اس دائرہ کے اندر رہ کر جو شریعت نے متعین کر رکھا ہے اس طرح کی سزا شریعت میں " تعزیر" کہلاتی ہے۔محمد بن فراموز،منلاخسرو،دررالحکام شرح غررالاحکام،ج5،ص349،س م نامعلوم

حکمران چاروناچار اس پر عمل کرنے اور کرانے کے پابند ہوں گے۔اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ۔مثلا مغرب میں بعض ملکوں میں ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہےکیونکہ عوامی رائے اس کے حق میں ہے۔اس کے مقابلے میں جہاں عوامی رائے اورانسانی رائے اللہ تعالی کےاحکامات کے خلاف ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک کا مفہوم ہے:

"لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق "

جیسا کہ روایات میں آتا ہے:

" مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے جی چاہے یا طبیعت رو کے لیکن اس وقت تک کہ (اللہ تعالیٰ اور رسول کی)نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے "[1]

اس وجہ سے جہاں قوانین اسلامی احکام کے خلاف ہو بحیثیتِ مسلمان وہ قابل قبول نہیں ہوں گے۔ اور جہاں ایسی صورتِ حال نہ ہو تو اسلام اس کے بارے میں کسی کو منع نہیں کرتا۔

دفعہ:۱۲

ہر شخص کو پرائیویسی کا مکمل حق ہے۔

[1] بخاری،کتاب الجہاد والسیر،باب السمع والطاعۃ للامام،رقم:2955

اس دفعہ سے اصولی طور پر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ہر انسان کو اپنی "پرائیویسی"کا حق حاصل ہے جس میں اس کی انفرادی زندگی،عائلی زندگی اور معاشرتی زندگی سب شامل ہیں۔سیرتِ طیبہ میں اس حوالے سے واضح ہدایات موجود ہیں۔مثلاً کسی کی اجازت کے بغیر اُس کے گھر،کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے ۔جیسا کہ سورۃ نور میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"مومنو ! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں سے اجازت لئے اور ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (اور ہم) یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تم یاد رکھو"[1]

ابن کثیر میں اس آیت کے تحت یہ تفسیر درج ہے:

"یہاںشرعی ادب بیان ہو رہا ہے کہ ’’کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت مانگو، جب اجازت ملے، جاؤ پہلے سلام کرو، اگر پہلی دفعہ کی اجازت طلبی پر جواب نہ ملے تو پھر اجازت مانگو۔ تین مرتبہ اجازت چاہو اگر پھر بھی اجازت نہ ملے تو لوٹ جاؤ"[2]

کیونکہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ:

"سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ تین دفعہ اجازت مانگی، جب کوئی نہ بولا تو آپ رضی اللہ عنہ واپس لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا! دیکھو عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ آنا چاہتے ہیں، انہیں بلا لو لوگ گئے، دیکھا تو وہ چلے گئے ہیں۔ واپس آ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خبر دی۔ بلانے پرسیدنا عمر رضی اللہ عنہا نے پوچھا آپ رضی اللہ عنہ واپس کیوں چلے گئے تھے؟ جواب دیا کہ نبی علیہ السلامکا حکم ہے کہ تین دفعہ اجازت چاہنے کے بعد بھی اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جاؤ"[3]

دوسری روایت میں خود نبی علیہ السلام کی تشریف لے جانے کا واقعہ ہے کہ:

"سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی علیہ السلامنے سعد بن عبادہ[4](رضی اللہ عنہ)کے گھر تشریف لے جاکر " السلام علیك ورحمة الله "ارشاد فرماکر داخلے کی اجازت مانگی۔اندر سے سعد رضی اللہ عنہ جواب دیا لیکن آہستگی کے وجہ سے آپ سن نہ سکے۔جب تین دفعہ ارشاد

---

[1]النور27:24

[2]النور27:24

[3]بخاری،کتاب البیوع، باب الخروج فی التجارۃ وقول اللہ تعالیٰ:{فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ }،رقم:2062

[4]سعد بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ ہے آپ کی کنیت ابوثابت ہے،عقبہ کے دن سعدؓ 70 لوگوں کے ساتھ شریک ہوئے،آپ بدر میں شریک نہیں ہوئےلیکن اس کے بعد اُحد اور خندق میں شرکت کی۔آپ 60 سال کی عمر 20ھ کو عمرؓ کے دورِ خلافت میں وفات پاگئے۔(الطبقات الکبری،ج7،ص 280۔الاصابۃ ،ج7 ،ص 47)

فرمائے اور سعد نے آہستہ آواز سے جواب بھی دے دیا لیکن آپ ﷺ سن نہ سکے تو واپس ہونے لگے۔سعد رضی اللہ عنہ اُن کے پیچھے گئے اور کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو میں نے آپ کے ہر سلام کا (آہستہ آواز سے)جواب دیا تھا اور آپ سن نہ سکے اور یہ اس لیے کہ آپ باربار میر ے لیے رحمت کی دعا فرمائے تاکہ مجھے برکت حاصل ہو۔پھر آپ ﷺ کو گھر لے گئے "[1]،[2]

اور کسی کی "پرائیویسی" میں بے جا مداخلت کو جرم قرار دے دیا جیسا کہ ارشاد ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر کوئی شخص تمہاری اجازت کے بغیر تمہیں)جب کہ تم گھر کے اندر ہو(جھانک کر دیکھے اور تم اسے کنکری مار دو جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے"[3]

اور پرائیویسی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کو (گھر کے اندر وغیرہ میں)چپکے چپکے دیکھنا بھی داخل ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ:

ایک شخص نبی علیہ السلامکے پاس آیا،)عثمان کی روایت میں ہے کہ وہ سعد بن ابی وقاص تھے(تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر اجازت طلب کرنے کے لیے رکے اور دروازے پر یا دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہیں اس طرح کھڑا ہونا چاہیئے یا اس طرح؟)یعنی دروازہ سے ہٹ کر(کیونکہ اجازت کا مقصود نظر ہی کی اجازت ہے"[4]،[5]

دفعہ:۱۳

(۱)ہرشخص کو ریاست کے اندر رہائش اورنقل وحرکت کا مکمل حق ہے۔

(۲)ملک سے باہر جانے اور پھر آنے کا بھی ہر کسی کو حق ہے۔

اصولی طور یہ دفعہ بھی اسلامی تعلیمات سے تضاد نہیں رکھتا یعنی اسلام بھی ہر شہری کو ملک کے اندر اور باہررہنے یاآنے جانے کاحق دیتا ہے۔کیونکہ جہاں کوئی رہتا ہو تو خوشحال زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے نقل وحمل پر کوئی پابندی نہ ہو تاکہ وہ ضروریاتِ زندگی بآسانی حاصل کر سکے۔اسی طرح کسی بھی جائز غرض کے حصول کے لیے وہ ملک سے باہر چلا جائے یا واپس آجائے تو اُسے آنے جانے کا مکمل حق ملنا چاہئیے۔

---

[1]مسند احمد،کتاب مسندالمکثرین من الصحابہ،باب مسند انس بن مالک رضی اللہ عنہ،ج3،ص138،رقم:12429

[2]قال البانی:ھذاحدیث صحیح،مشکاۃ المصابیح،ج2،ص465

[3]بخاری،کتاب الدیات،باب من اطلع في بيت قوم ففقووا عينه فلا دية له ،رقم:6902

[4]ابوداؤد،کتاب الادب،باب فی الاستیذان رقم:5176

[5]البانی کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج11،ص174

دفعہ:۱۴

(۱)ہرشخص کو ایذا رسانی سے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے،اور پناہ مل جائے تواس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے

(۲)یہ حق عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لئےاستعمال میں نہیں لایا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف ہیں۔

پناہ گزینی کی حالت میں بھی اسلام"انسان" کی اُسی حیثیت کے قائل ہے جس حیثیت میں وہ اپنے ملک میں رہتا ہے یعنی انسان بہر حال انسان ہوتا ہے اُس کی تکریم کے بارے میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

"اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"[1]

انسان کا دوسرے ملک میں جا کرپناہ لینا کسی انتہائی مجبوری کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔اِیسے حالات میں انسان کے لیے عزت وتکریم کا مسئلہ اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔لیکن جیساکہ دفعے کی دوسر ی شق میں ہے،کہ یہ پناہ گزینی کسی عدالتی کارروائی سے بچنے کے لیے نہ ہو تب یہ پناہ گزین انسان اس حق کا مستحق ہوتا ہے ورنہ نہیں۔مطلب یہ ہے کہ کسی نے اپنے ملک میں کوئی ایسا غیرقانونی کام کیا جس کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے،اُسی سزا سے بچنے کے لیے وہ بھاگ کر کہیں پناہ لیتا ہے ایسے حالات میں اس بھگوڑے انسان کے کچھ بھی حقوق نہیں ہوتے۔کیونکہ اقوام متحدہ کے قوانین میں یہ بھی ہے کہ کوئی

---

[1] الاسراء70:17

بھی انسان اقوام متحدہ کے بیان کردہ قوانین کی خلاف ورزی کے ارتکاب کی صورت میں تمام حقوق سے محروم ہوجاتا ہے۔

دفعہ: ۱۵

(۱)ہرشخص کو قومیت کا حق ہے۔

(۲)کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

سیرت طیبہ کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کے لیے"قوم" یا قومیت کسی بھی فضیلت کا معیار نہیں ہے۔یہ تو صرف ایک تعارفی نشان ہے جس کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ جل شا نہ کا ارشاد میں ہے:

"لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بےشک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے"[1]

اس کی تفسیر میں ابن کثیررحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ ''اس نے تمام انسانوں کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے'' یعنی آدم علیہ السلام ہی سے ان کی بیوی صاحبہ حواء علیہا السلام کو پیدا کیا تھا اور پھر ان دونوں سے نسل انسانی پھیلی۔ »شعوب «قبائل سے عام ہے مثال کے طور پر عرب تو »شعوب «میں داخل ہے پھر قریش غیر قریش پھر ان کی تقسیم میں یہ سب قبائل داخل ہے۔ بعض کہتے ہیں »شعوب «سے مراد عجمی لوگ اور قبائل سے مراد عرب جماعتیں۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کو »اسباط «کہا گیا ہے مقصد اس آیت مبارکہ کا یہ ہے کہ آدم علیہ السلام جو مٹی سے پیدا ہوئے تھے ان کی طرف سے نسبت میں تو کل جہان کے آدمی ہم مرتبہ ہیں اب جو کچھ فضیلت جس کسی کو حاصل ہو

---

[1] الحجرات13:49

کی وہ امر دینی، اطاعت اللہ اور اتباع نبوی کی وجہ سے ہو
گی۔ یہی راز ہے جو اس آیت کو غیبت کی ممانعت اور ایک
دوسرے کی توہین و تذلیل سے روکنے کے بعد وارد کی کہ
سب لوگ اپنی پیدائشی نسبت کے لحاظ سے بالکل یکساں ہیں،
کنبے قبیلے برادریاں اور جماعتیں صرف پہچان کے لیے ہیں
تاکہ جتھا بندی اور ہمدردی قائم رہے۔ فلاں بن فلاں قبیلے والا
کہا جا سکے اور اس طرح ایک دوسرے کی پہچان آسان ہو
جائے ورنہ بشریت کے اعتبار سے سب قومیں یکساں ہیں۔
سفیان ثوری رحمہ اللہ[1] فرماتے ہیں قبیلہ حمیر اپنے حلیفوں کی
طرف منسوب ہوتا تھا اور حجازی عرب اپنے قبیلوں کی طرف
اپنی نسبت کرتے تھے۔{ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ } اللہ تمہیں جانتا ہے
اور تمہارے کاموں سے بھی خبردار ہے، ہدایت کے لائق جو
ہیں انہیں راہ راست دکھاتا ہے اور جو اس لائق نہیں وہ بے راہ
ہو رہے ہیں۔ رحم اور عذاب اس کی مشیت پر موقوف ہیں،
فضیلت اس کے ہاتھ ہے جسے چاہے جس پر چاہے بزرگی
عطا فرمائے یہ تمام امور اس کے علم اور اس کی خبر پر مبنی
ہیں"[2]

قومیت کے حوالے سے احادیث مبارکہ میں بھی ہدایات آئی ہیں جیسا کہ ترمذی کی ایک روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلام فرماتے ہیں" :نسب کا علم حاصل کرو تاکہ
صلہ رحمی کر سکو صلہ رحمی سے لوگ تم سے محبت
کرنے لگیں گے تمہارے مال اور تمہاری زندگی میں اللہ برکت
دے گا "۔پھر فرمایا "حسب نسب اللہ کے ہاں نہیں چلتا وہاں تو
فضیلت، تقویٰ اور پرہیزگاری سے ملتی ہے"[3]،[4]

اور بخاری کی روایت ہے کہ:

"نبی علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ بزرگ
کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :جو سب سے
زیادہ پرہیزگار ہو"۔ لوگوں نے کہا: ہم یہ عام بات نہیں پوچھتے۔
فرمایا" :پھر سب سے زیادہ بزرگ یوسف علیہ السلام ہیں جو

---

[1]سفیان بن سعید بن مسروقؒ الثوری ہیں۔صحاح ستہ کے رااوی ہیں۔ کبار تبع تابعین میں سے ہیں۔ ثقہ حافظ،فقیہ،عابد اور امام ہیں۔ شیوخ میں سے بکیر بن عطاءؒ،ربیع بن انسؒ اور ابراہیم بن عقبہؒ جب کہ تلامذہ میں ابراہیم بن سعدؒ،ابان بن تغلبؒ اورامیہ بن خالدؒ شامل ہیں۔ 161ھ/778ء میں وفات پائی۔(الذہبی، سیر اعلام النبلاء،ج13،ص263۔الزرکلی،الاعلام،ج6،ص276)۔

[2]ابن کثیر،ج7،ص388،387،386،385

[3]ترمذی،کتاب البر والصلۃ،باب تعلم النسب،رقم:1979

[4]یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج4،ص479

خود نبی تھے نبی دادے تھے دادا بھی نبی تھے پردادا تو خلیل
اللہ علیہ السلام تھے"، انہوں نے کہا: ہم یہ بھی نہیں پوچھتے۔
فرمایا" :پھر عرب کے بارے میں پوچھتے ہو؟ سنو! ان کے جو
لوگ جاہلیت کے زمانے میں ممتاز تھے وہی اب اسلام میں بھی
پسندیدہ ہیں جب کہ وہ علم دین کی سمجھ حاصل کر لیں"[1]

اسی طرح مسلم کی روایت ہے کہ:

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے
فرمایا: اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ
تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے"[2]

اس آیت کریمہ اور احادیث شریفہ سے استدلال کر کے علماء نے فرمایا ہے کہ نکاح میں قومیت اور حسب نسب کی شرط نہیں، سوائے دین کے اور کوئی شرط معتبر نہیں"

اس سے معلوم ہوا کہ قومیت کسی بھی فضیلت کا معیار نہیں ہے بلکہ یہ تو جان پہچان اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔قومیت عام ہے چاہے نسل کی بنیاد پر ہو،رنگ کی بنیاد پر ہو،زبان کی بنیاد پر ہو یا وطن کی بنیاد پر ہو سب میں یہ بات موجود ہے کہ یہ محض ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے دنیاوی امور میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

دفعہ:۱۶

(۱)بالغ مرد عورت کو نکاح،طلاق کا یکساں حق ہے جس میں مذہب،قومیت یا نسل رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

---

[1] بخاری،کتاب التفسیر،باب لقد كان في يوسف وإخوته آيات للسائلين ،رقم:4689

[2]مسلم،کتاب البر والصلۃ والادب،باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ،رقم:6708

. (۲)نکاح مرد وعورت کی مکمل اور آزاد رضامندی سے ہو گا۔

(۳)خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اورریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حق دار ہے۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں اس دفعے کے مندرجات کا تقابلی جائزہ:

اس دفعے کے تینوں مندرجات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تینوں "خاندانی نظام" سے متعلق ہیں۔اسلام کا اپنا ایک خاندانی نظام ہے۔اُس نظام میں خاندان کے مختلف افراد کے مختلف حقوق وفرائض ہیں۔کہیں پر آزادی اور کہیں پر کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔خاندانی نظام سے متعلق قوانین کو"عائلی قوانین"کہا جاتا ہے۔کسی ملک کے قانون کا تعلق تین قسم کے امور سے ہوتا ہے۔فوجداری،دیوانی اور عائلی۔اول الذکر قوانین جھگڑوں لڑائیوں سے متعلق ہیں۔ثانی الذکرعوام کے آپس کے امور میں شکایات سننے اور اُس پر فیصلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ آخری وہ ہے جس میں خاندان کے افراد سے متعلق امور زیرِ بحث آتے ہیں۔

اس خاندانی نظام کے لیے انگریزی میں "Personal Law"اور"Public Law" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔جس کو عربی میں "القوانین الشخصیہ"جبکہ اردو میں اُسے شخصی قوانین اور عائلی قوانین کہاجاتا ہے۔ان عائلی قوانین میں نکاح ،طلاق،کفالت، حضانت، ولایت اور کفاءت زیربحث آتے ہیں۔پرسنل لاء پر تقریبا تمام لوگ یکساں طور پر عمل پیرا ہیں۔ہمارے ملک میں اوپر ذکرشدہ امور(وراثت،حضانت،طلاق اور بچوں کے کفالت وغیرہ)کے اپنے قوانین موجود ہیں۔پاکستان میں بھی علماء کرام نے جو 22نکات پیش کئے تھے اس میں بھی پرسنل لاء کے حوالے سے حقوق موجود تھے۔اسلام میں خاندانی نظام کے حوالے سے جو قوانین اور اصول موجود ہیں یعنی وراثت،طلاق،حضانت،کفالت،نکاح،کفالت اور کفاءت وغیرہ سے متعلق جو اصول ہیں ،اُن سب پر اسی عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے اسی دفعہ نمبر16 ہی کی وجہ سے دنیا کو اعتراض ہے۔کیونکہ اُن کے نزدیک اس دفعے کی وجہ سے درجہ ذیل حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

(الف)۔جب انسان(چاہے مرد ہو یا عورت)بالغ ہو جائے تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کے ساتھ بھی چاہے نکاح کر سکتا ہے،گھر بسا سکتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی نسل ،قوم یا مذہب سے ہو۔اسی طرح جب ایک دفعہ نکاح ہو گیا،گھر بس گیا تو اب یہ میاں بیوی اپنے نکاح کو برقرار رکھنے،ختم کرنے یا اپنی ازداوجی زندگی کے متعلق دیگر امور میں یکساں حقوق کے حامل ہیں۔

(ب)۔نکاح میاں بیوی کی مکمل آزادی اور باہمی رضامندی سے ہوگا۔

(ج)۔معاشرے کا بنیادی جزء "خاندان "ہے۔ریاست اور معاشرے دونوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت کریں۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جب ہم اس دفعے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ نکاح صرف بالغ انسان کا منعقد متصور ہوگا۔اور نابالغ (لڑکے ،لڑکی) کے نکا ح کی اجازت نہیں دی جائیگی۔یعنی اسلام میں صغیر اور صغیرہ کے نکاح کے بارے میں جوہدایات اور احکامات موجود ہیں وہ سب کے سب اس دفعے کی وجہ سے معطل سمجھے جائیں گے۔نیز ہمارے فقہی ذخیرے میں جتنے احکام اِن(صغیروصغیرہ)سے متعلق ہیں تمام کے تمام یکسر ناقابل عمل ہوجائینگے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دفعے کی اس شق سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر بالغ مرد وعورت آپس میں نکاح کر سکتے ہیں ۔اس نکاح میں مذہب،قومیت یا نسل رکاوٹ نہیں بن

سکتا ۔کوئی ایسائی عورت یورپین مرد سے شادی کر سکتی ہے۔افریقہ کے صحراؤں میں بسنے والا مرد امریکی عورت کو اپنے نکاح میں لاسکتا ہے۔کالا گورے سے اور گورا کالے سے نکاح کر سکتے ہیں۔یہودی مردکسی ہندو عورت سے،مسلمان عورت کسی عیسائی مرد سے نکاح کرسکتے ہیں۔کوئی سکھ مسلمان عورت سے اسی طرح کوئی دہری کسی یہودی سے نکاح کر سکتا ہے۔خلاصہ یہ کہ نکاح کے حوالے سے مرد اورعورت کے درمیان مذہب رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

جہاں تک نسل اور قومیت کی بات ہے اس حوالے سےاسلام نکاح کے سلسلے میں مرد عورت کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا،کوئی بھی امریکی مسلمان ایک پاکستانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اسی طرح کوئی روسی مسلمان عورت کسی مسلمان چینی مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔افریقہ کے کالے رنگ والے مسلمان یورپ کی گوری مسلمان عورت سے نکاح کر سکتے ہیں۔لیکن ایک غیر مسلم کسی مسلمان سے نکاح نہیں کر سکتا مذہب کے حوالے سے اسلام مرد اور عورت کے درمیان فرق کا قائل ہے ۔کوئی بھی مسلمان کسی بھی غیر کتابی غیر مسلم سے نکاح /شادی نہیں کر سکتا۔اس بارے میں قُرآن میں اللہ تعالی کا واضح ارشا دہے۔

غیر مسلم کے ساتھ نکاح کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے ۔جہاں تک مسلمان عورت کی بات ہے وہ تو کسی بھی صورت میں غیر مسلم کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی لیکن مسلمان مرد کسی ایسی یہودی عیسائی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اپنے اصلی دین پر عمل پیرا ہو۔جیسا کہ تفسیر طبری میں ہے:"

> " یعنی اس اوپر والے میں آیت میں نکاح کی جو ممانعت آئی ہے وہ مشرکین عورتوں سے ہے ،اہلِ کتاب(یہودی،عیسائی) سے نہیں ہے کیونکہ سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنی نے ایک اہل کتاب عورت سے نکاح کیا تھا"[1]

بہر حال مسلمان کا نکاح غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا یہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے جو آج کی دنیا کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس پر بڑے بڑے تنازعات ہوتے رہتے ہیں۔ہمارے ہاں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن پوری دنیا میں یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ مسلمان کسی معاشرے میں ایڈ جسٹ نہیں ہو سکتے خاص کر بھارت [2]میں یہ مسئلہ سنگین صورت حال اختیار کرچکا ہے۔یورپی ممالک میں تو یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ وہاں تو کسی بھی مذہب کا پیروکار کسی دوسرے مذہب کے پیروکار سے نکاح کر لیتے ہیں ۔نیز قانونی تحفظ بھی اُن کو حاصل ہے لیکن بھارت میں یہ مسئلہ اس وجہ سے سنگین ہے کہ وہاں کے دوسرے مذاہب کےلوگ مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا میں ہر مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نکاح کر تے ہیں تم مسلمان کیوں دوسرے مذاہب والوں سے نکاح نہیں کرتے ۔تم لوگوں نے پوری دنیا سے اپنے آپ کو الگ کیوں رکھا ہے؟نیز یہ اعتراض بھی

---

[1] طبری،ج4،ص364

[2] ہندوستان یابھارت: براعظم ایشیاکے جنوبی حصے میں واقع ایک ملک ہے جس کا صدر مقام نئی دہل ہے ۔یہ ملک آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔مختلف زبانوں والے اس ملک کے مشرق میں بنگلہ دیش،میانمار،شمال میں بھوٹان۔چین اور نیپال،جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں بحیرہ ہند اور مغرب میں پاکستان واقع ہے۔چار مشہور مذاہب جن میں ہندومت ،بدھ مت، جین مت اور سکھ مت نے اسی ملک میں جنم لیااس علاقے پر آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت 18 ویں صدی میں شروع ہوئی جبکہ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد یہاں برطانیہ کی براہ راست حکومت قائم ہوئی بھارت 1947 میں آزاد ہو- بھارت ایک وفاقی جمہوریہ ہے جو پارلیمانی نظام کے تحت 29 ریاستوں اور 7 وفاقی علاقوں پر مشتمل ہے۔بھارت ایک کثیر السانی ،مذہبی ،ثقافتی اور نسلی معاشرہ ہے۔

کرتے ہیں کہ تم معاشرے میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ کسی کے ساتھ رشتہ کرتے ہو اور نہ ہی کسی کو رشتہ دیتے ہو ۔وہاں تو بات اُن کی سپریم کورٹ تک پہنچی ہے لیکن وہاں کے مسلمان اس کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔

عالمی منشور کے اس دفعہ کاچونکہ اسلامی تعلیمات سے ٹکراؤ ہے اس وجہ سے مسلمان عقیدے کے طور پر اس کو قبول نہیں کر سکتے۔کیونکہ قبول کرنے کی صورت میں نص قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے اور قرآن وحدیث کے صریح احکام متاثر ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر نکاح کے مسئلے میں مرد وعورت کو یکساں حقوق کی شق کو دیکھا جائے کہ جس طرح مرد طلاق کا مالک ہے عورت کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئیے یعنی نکاح فسخ کرنے کے سلسلے میں مرد وعورت برابر ہیں۔اس مسئلے کو بھی اگر تسلیم کر لیا جائے تو اسلام میں"ولایت" کا جو حق ہے ختم ہوجاتا ہے۔کیونکہ اسلام میں کسی نابالغ لڑکے اور لڑکی پر اُس کے باپ یا دادا کو "ولایت" کا حق ہوتا ہے جس کی رو سے وہ لڑکی پر نکاح کے سلسلے میں "جبر " کر سکتے ہیں ۔اور اگر نابالغ لڑکی یا لرکے نے اُن کی مرضی کے خلاف نکاح کیا ہو تو باپ دادا اپناحق ولایت استعمال کرکے اُن کا کیا ہوا نکاح ختم کر سکتے ہیں ۔احناف کا درست موقف یہ ہے کہ نکاح میں "رضا" شرط ہے بالغہ عورت کی رضامندی بھی ہوگی اور "ولایت"اور "کفو" کا احترام کرتے ہوئے باپ دادا کی رضامندی کو بھی معتبر مانا جائے گا[1]۔

معلوم ہوا کہ اس دفعے کو قبول کرنے کی صورت میں مسلمانوں کےہاں کفاءت اور ولایت کے جو احکامات ہیں سب کے سب معطل ہو جائینگے۔

نکاح کے بعد مرد وعورت پر میاں بیوی کی حیثیت سے حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ:

> "مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے کہ اللہ نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ فرمان بردار ہوتی ہیں اور اُن کی پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں مال و آبرو کی خبرداری کرتی ہیں اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سر کشی اوربد خوئی کرنے لگی ہے تو پہلے ان کو زبانی سمجھاؤ،اگر نہ سمجھیں تو پھر اُن کے ساتھ سونا ترک کر دواگر اس پربھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو۔پھر اگر تمہارا کہنا مان لیں تو پھر اُن کو ایذا دینے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔بے شک اللہ بہت اونچاہے بڑا ہے"[2]

اس آیت میں مرد کی فوقیت اُس کے انتظامی امور کے حوالے سے ہے جس میں سب سے پہلے معاشرے کی بنیادی اکائی"خاندان"آتا ہے عام طور پر "حکومت" بھی اسی ضمن میں آتی ہے لیکن اولین مصداق "خاندان" ہے۔اور ظاہر ہے خاندان "گھر" ہی سے شروع ہوتا ہے جس میں میاں بیوی دو بنیادی اجزاء ہیں۔اس لحاظ سے گھر کا نگران "مرد" ہوا جیسا کہ اللہ جل شانہ کاارشاد ہے کہ:" وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ[3]" ہاں مردوں کو عورتوں پر فضلیت ہے "۔ اس بنیاد پر

---

[1] سید محمد انور شاہ کاشمیری،فیض الباری،مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ،ط نامعلوم

[2] النساء34:4

[3] البقرۃ228:2

گھر کے امور چلانے کا نگران مرد ہے۔اگر قرآنی ارشادات پر غور کیا جائے تو اس فضیلت کی دو وجوہات نظر آتی ہیں۔

1-پہلی وجہ یہ ہے کہ مردوں کوعورتوں پر حاکمیت ایک فضیلت ہے یعنی کسی خاص حکمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے کسی پر فضیلت دےدے اورظاہری وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ مرد کو اللہ تعالی نےعقل اور جسم کے اعتبار سے عورت کے مقابلے میں مضبوط پیدا فرمایا ہے اور یہی صفت عورتونمیں مرد جیسے نہیں ہیں۔کیونکہ "مرد" میں فعالیت جبکہ عورت میں "انفعالیت "ہوتی ہے۔

2-دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد گھر کا نگران ہوتا ہے وہ عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے،مہر ادا کرتا ہے ۔گھر کی دیگر ضروریات پوری کرتا ہے ۔نیز نان نفقے کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ اسلام ہر لحاظ سے ایک کامل نظام پیش کرتا ہے۔مرد کمانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور عورت اُس کو درست طریقے پر خرچ کرنے کی ذمہ دارہوتی ہے۔ اس وجہ سے جہاں اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کیا جاتا وہاں یہ بات نہیں ہے یعنی مغرب میں مرد وعورت دونوں کماتے ہیں اور ہر ایک اپنے لیے کماتا ہے ۔وہاں عورت کمائی کے سلسلے میں گھر سے باہر نکلتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں "خاندانی نظام"سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔اسلام نے ایک طرف اگر مرد کو گھر کا حکمران بنایا تو دوسری طرف عورت کو گھر کا منتظم ٹھہرا کر ذمہ داریوں کا تعیّن کر دیا۔کہ مرد باہر سے کما کر لائے گا اور عورت شوہر کو اعتماد میں لے کر اس کی حیثیت کے مطابق گھر کا انتظام چلائی گی اور اس کی اولاد پر خرچ کرے گی ۔نبی علیہ السلام کا ارشادمبارک ہے :

"عورت اپنے شوہر کی نگران ہے اور اس سے اِس کے بارے میں پوچھا جائے گا"[1]

مرد کو عورت پر برتری کیوں حاصل ہے؟ اس کے لیے اگر ہم دنیا کے ہرچھوٹے بڑے نظام کو دیکھیں تو وہاں کوئی نہ کوئی شخصیت ایسی ضرور ہوتی ہے جس کی رائے کوحتمی سمجھا جاتا ہے بالفاظ دیگر ایک ایسی اتھارٹی ضرور ہوتی ہے جو اُس نظام میں "فائنل حیثیت" رکھتا ہو ۔مثلا کسی ملک کو لیں کہ اس میں بیک وقت دو صدور نہیں ہو سکتے جو یکساں حقوق کے مالک ہو کسی کمپنی کے دو ایسے منیجر نہیں ہو سکتے جو اختیارات میں یکساں ہو ورنہ پھر وہ ملک چل سکتا ہے اور نہ ہی وہ کمپنی۔فطرت کے اصول یہی ہیں ۔اللہ کے پیدا کردہ سسٹم میں خلل کیوں نہیں ہے ؟کب سے یہ نظام درست طریقے سے چل رہا ہے؟ اس لیے کہ اس کا چلانے والا "ایک"ہے۔اس میں تبدیلی لانے والی ذات یکتا ہے اگر اس سسٹم کے چلانے والے ایک سے زیادہ ہوتے توزمین وآسماں کا یہ نظام درہم برہم ہو جاتا خود اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

" اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین وآسمان درہم برہم ہوجاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں اللہ مالک عرش ان سے پاک ہے"[2]

مطلب یہ ہے کہ اگرایک فائنل اتھارٹی نہ ہوتی تو یہ سب کے سب تباہ وبرباد ہوجاتے۔جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

---

[1] بخاری،کتابفی الاستقراض،باب العبد راع فی مال سیدہ ولایعل الا باذنہ،رقم2409،صحیح مسلم،کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر والحث علیہ،رقم4828

[2] الانبیاء22:21

ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا
اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا۔ یہ لوگ جو کچھ اللہ کے بارے
میں بیان کرتے ہیں اللہ اس سے پاک ہے"[1]

پھر تو دنیا کی طرح ہر وقت اقتدار کے جھگڑے ہوتے رہتے۔تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی نظام اُس وقت صحیح چل سکتا ہے جب اُس میں ایک فائنل اتھارٹی ہو۔اب "گھر"کو دیکھا جائے تو یہ بھی ایک چھوٹی سی کائنات ہے ۔اس کا نظام اس وقت ٹھیک ہوگا جب اس میں ایک فائنل اتھارٹی ہو اور ظاہر ہے کہ وہ "مرد"ہی ہو سکتا ہے۔اور اگر مرد وعورت دونوں کو یکساں طور قدرت حاصل ہو جائے اوردونوں کے اختیارات برابر ہوں تو پھر فیملی سسٹم کا نام ونشان نہیں رہے گا جیسا کہ مغرب میں ہے جہاں خالہ،پھوپھی اور چچا کے رشتے تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اولاد اور والدین کے رشتے بھی تقریباًختم ہو گئے ہیں ۔والدین جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اُن کا ٹھکانہ"Old Home" ہوتا ہے میاں بیوی کو یکساں حقوق حاصل ہونے کے نتیجے میں شادی کے قوانین ایسے سخت بنائے گئے ہیں کہ ہر کوئی اُس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔چنانچہ مغرب میں جب تک مرد و عورت کے درمیان ہم آہنگی رہتی ہے وہ بغیرنکاح کے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔جب دل بھر جائے تو پھر نئے ساتھی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔بچے پیدا کرنا اُن کی ترجیحات میں شامل نہیں ،اور اگر کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوجائے تو چونکہ عورت کو روز کمائی کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا پڑتا ہے تو اس وجہ سے وہ بچے کی نگہداشت کے لیے تیار نہیں ہوتی مجبوراً وہ ایسی صورتِ حال میں "بچے" کو کسی کئیر سنٹر میں داخل کراتی ہے جس کے پاس کبھی کبھارجانا ہو تا ہے۔اب ظاہر ہے کہ اِن حالات میں "خاندان" کیسے قائم رہ سکتا ہے؟صرف جسمانی حد تک میاں بیوی ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور بس۔بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت اس حوالے سے صرف اپنے شوہرتک محدود ہو بلکہ جہاں بھی اُسے کوئی ملے وہاں وہ اپنی خواہش پوری کر سکتی ہے۔اس کے مقابلے میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ:

"أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ"[2]"اس طرح کہ مال خرچ
کرکے اُن(عورتوں)سے نکاح کر لو بشرطیکہ نکاح سے
مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ کہ شہوت پرستی"

اسلامی تعلیمات کے مطابق کسی عورت کو اُس وقت تک ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں جب تک اُس کے ساتھ باقاعدہ نکاح کرکے مہراور نان نفقہ کی شوہر نے ذمہ داری قبول نہ کی ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُس کا مقصدگھر آباد کرنا ہو،صرف شہوت پرستی مقصود نہ ہواور" Girl Friend" بنانے کے بجائے "خاندان"بنانے پر نظر ہو اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی ارشاد ہے:

"غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ اخدان"[3]"(وہ عورتیں ایسی)نہ ہو کہ کھلم
کھلا بدکاری کریں اور نہ درپردہ دوستی کرنا چاہیں"

اسلامی تعلیمات کی رو سے ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کے نکاح میں یہ ضروری ہوتا ہےکہ مرد عورت کو ایک باوقار طریقے سے بحیثیت "بیوی" قبول کرے اسی طرح اُ س عورت اور اُس کے بچوں کے نان ونفقے کی ذمہ داری اپنے سر لے ۔اس کے بعد اپنی جنسی تسکین کی طرف آئے۔پھر ان سار ے مراحل میں یہ سب کچھ"پرائیویسی" سمجھ کر

[1] المؤمنون91:23
[2] النساء24:4
[3] النساء25:4

خفیہ رکھا جائے۔ریکارڈ پر نہیں آنے چاہییے۔اسی حوالے سے اسلام میں "عورت" کے پاس جانے اور اُس کے ساتھ کچھ کرنے کی کوشش میں ساری ذمہ داری بھی قبول کرنی ہوگی،او اگر ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن عورت کے پاس جاتا ہے تو پھر سزا ملے گی۔یہ سزا کوڑے بھی ہو سکتے ہیں اور "رجم"بھی۔جیسا کہ اسلام میں "حد زنا" کااپنا ایک الگ اور مستقل قانون موجود ہے۔

مغرب میں عورت کو گھرسے باہر نکال لیا گیا اس کو کمائی میں شریک تو کر لیا گیا لیکن عورت کے ذمےجو کام تھے اُن میں کسی نے اُن کے ساتھ کوئی بھی تعاون نہیں کیا،کہ چلو ایک بچہ تم جنو ایک میں جنتا ہوں،یا ایک بچے کو تم دودھ پلاتے ہو ایک کو میں پلاتا ہوں۔مطلب یہ کہ حقوق کے نام پر اُنہوں نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے باہر نکالا لیکن اُن کے فرائض متعین نہ کرتے ہوئے عورتوں پر دوہرا ظلم کیا۔کیونکہ یہ حقوق میں اشتراک ہے یا فرائض میں؟اور "آزادی" کے خوش نما لفظ کے پیچھے اُن کے حقوق غصب کئے پھر بھی عورت خوش ہے کہ مجھے مردوں جیسےمساوی حقوق مل رہے ہیں حالانکہ حقوق کے بجائے اُن کے فرائض میں اضافہ ہوا۔صبح سے شام تک وہ ایک مشین کی حیثیت سےکام کرتی ہے شام کو واپس آکر کیسے وہ ایسے ماحول میں رہنا پسند کرے گی جس میں میاں،بچوں اور خاندان کے دوسرے افراد کی خدمت کر سکے۔

دفعہ نمبر 16 کی آخری شق یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں میاں بیوی دونوں یکساں حقوق کے حامل ہوں گے۔اگر مرد طلاق دے سکتا ہے تو عورت بھی ازخود شوہر سے علحیدگی اختیار کر سکتی ہے۔اسلام نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان پُرامن طریقے سے رہنا ممکن نہ ہو توایک باوقار طریقے سے اس بندھن کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے جس کا اختیار صرف "مرد" کودیاگیا ہے۔عورت کے لیے بھی ناگزیر حالات میں فسخ نکاح کے مطالبے کا حق حاصل ہے جس کو شریعت میں "خلع" کہتے ہیں اور شریعت میں اس کے لیے باقاعدہ طریقۂ کار متعین ہے۔ پھر بھی اگر شوہر کی طرف سے ظلم ہواور طلاق بھی نہیں دیتا توعدالت سے رجوع کرکے بھی اس مسئلےکو حل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

> " اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو" [1]

پھر اگر "بیوی"حق پر ہو تو شوہر کے مرضی کے بغیر بھی نکاح ختم کیا جاسکتا ہے۔معلوم ہوا کہ دونوں کو یہ حق حاصل ہے فرق صرف یہ ہے کہ مرد کو براہ راست جبکہ عورت کو بالواسطہ یہ حق حاصل ہے ۔اور پہلے وضاحت کی گئی ہے کہ ہر نظام میں ایک فائنل اتھارٹی ہونی چاہئیے اس وجہ سے مرد وہ "فائنل اتھارٹی" ہے۔اقوام متحدہ کے رکن ہونے کے ناطے ہم پربھی اُن کے قوانین ماننا لازم ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلام ہمیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ "طلاق"کے سلسلے میں عورت کو بھی مرد جیسے اختیارات تفویض کئے جائیں ۔اس و جہ سے جب ایک دور میں عائلی قوانین بنائے گئے تو اُس وقت نکاح کے فارم میں ایک خانہ بنایا گیا تھا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ:کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کردیا ہے؟اس طریقے سے عورت طلاق کی مالک تو ہوجائے گی لیکن حقیقت یہ ہے نکاح کے وقت میں کوئی یہ بات شوہر سے پوچھتا بھی نہیں ہے اور نکاح خوان وغیرہ اپنے طرف سے "ہاں"لکھ دیتے ہیں ۔

---

[1] النساء35:4

بہرحال اقوام متحدہ کے قانون کی رو سے مرد اورعورت میں مساوات ہونی چاہیے اور اگر کہیں اس کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جائے تو اسے جنس کی بنیاد پر "امتیازی سلوک"شمار کیا جاتا ہے۔جنس کی بنیاد پرامتیاز کاتو اسلام بہر حال قائل ہے کہ مرد امامت کراسکتا ہے عورت نہیں،گواہی میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی،مرد گھرسے باہر نکلتے وقت کسی سے اجازت لینے کا پابند نہیں ہے لیکن عورت پوچھے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتی اسی طرح ایک خاص حکمت اور مصلحت کے تحت میراث میں مرد کاحصہ عورت سے زیادہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ

اس کے برعکس مذہب کی بنیادپر اس طریقے سے اسلام امتیاز کا قائل نہیں ہے کہ مرد کے لیے الگ قانون ہو اورعورت کے لیے الگ،مرد کی عبادت کاثواب زیادہ ہو اور عورت کا کم۔جب کہ عالمی منشور میں یہ بات ہے کہ جنس اور مذہب دونوں کی بنیاد پر "امتیاز" نہیں ہونا چاہئیے۔اگر ملک کاصدر/وزیراعظم مرد بن سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں بن سکتی؟ہمارے ملک کے قانون کے مطابق کوئی عورت صدر نہیں بن سکتی،اسی طرح کسی مسلمان معاشرے میں غیر مسلم اپنے دین کی تبلیغ نہیں کر سکتا۔دنیا جو "امتیازی سلوک"ختم کرنے کا نعرہ لگاتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں بھی دنیا میں مذہب کے حوالے مرد وعورت میں کوئی فرق روا رکھا جاتا ہو اس کو ختم کیا جائے۔

اس سلسلے میں مسلمان ممالک کا عمل ملاجلا چلا آرہاہے۔یورپی یونین میں شمولیت کی خاطر ترکی نے تواپنا سب کچھ قربان کردیا،دین،شریعت سب کچھ چھوڑا کہ تم جو کہتے ہو ہم مانتے ہیں بس ہمیں یورپی یونین میں شامل کرو دوسراطرزعمل افغانستان میں بہت تھوڑے دنوں کے لیے برسر اقتدارآنےوالے"ملا عمر" کی حکومت کا تھا کہ تم جو کچھ کہتے ہو ہم بالکل نہیں مانتے جو کرناہے کرلو۔جس کاان کو نتیجہ بھی بھگتناپڑا۔تیسرا طرز عمل وہ ہے جو دنیا کے باقی سارے مسلم ممالک کا ہے۔

دفعہ:۱۷

(۱)ہرانسان کوجائداد بنانے کا حق ہے۔

(۲)اور اُسے زبردستی اپنی جائداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

سیرت طیبہ میں کسی بھی انسان کو جائز طریقے سے جائداد بنانےکا حق ہے۔حلال حرام کی تمیز کرتے ہوئے اس بارے میں کوئی تحدید نہیں ہے بلکہ جتنا بھی کوئی انسان اکیلے میں یا کسی کے ساتھ شریک ہو کرجائداد بنا سکتا ہے۔ پھر چونکہ وہ جائداد اُس کا قانونی اور شرعی حق ہے اس وجہ سے کسی بھی فرد،معاشرے یا حکومت کو اُس کی جائداد میں غیرقانونی تصرف کرنے کا اختیارنہیں اور نہ ہی اس سے کوئی زبردستی لے سکتا ہے۔

دفعے کی دوسری شق کے حوالے سے صرف اتنی بات کہی جاسکتی ہے
کہ"زبردستی" کی تعریف کیا ہے کیونکہ جہاں عالمی منشور ار اقوام متحدہ ایسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے وہاں وہ کسی بھی مذہب کے بنیادی اصولوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اس وجہ سے اُس منشور کی بہت ساری اصطلاحات اسلام کے بنیادی اصول وضوابط کے خلاف ہیں۔یہاں بھی اگر "زبردستی"کا لفظ اُسی اصول پر استعمال ہو ا ہے تو پھر اسلام کے اس دفعے کی اس شق پر اعتراض کاحق ہے کہ "کسی غیر شرعی اور حرام کاروبار (شراب ،خنزیرکی خرید وفروخت اور بدکاری) کے ذریعے بنائی گئی جائدادکو اُس کا حق تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اُسے ایسے ذرائع سے جائداد بنانے کا کسی بھی طریقے سے اجازت نہیں دی جائے گی۔اور یہی بات اُس منشور کے خلاف ہے جس میں ہر انسان اِن جیسے حوالوں سے"آزاد"ہوتا ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب سورہ البقرۃ کی آخری آیات نازل ہوئیں،نبی علیہ السلام باہر تشریف لائے اور فرمایا شراب کی خرید وفروخت حرام کی گئی"[1]

دوسری جگہ صراحت کے ساتھ ارشاد ہے:

"جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہ انہوں نے نبی علیہ السلامسے سنا، فتح مکہ کے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آپ کا قیام ابھی مکہ ہی میں تھا کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور اور بتوں کا بیچنا حرام قرار دے دیا ہے۔ اس پر پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! مردار کی چربی کے متعلق کیا حکم ہے؟ اسے ہم کشتیوں پر ملتے ہیں۔ کھالوں پر اس سے تیل کا کام لیتے ہیں اور لوگ اس سے اپنے چراغ بھی جلاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں وہ حرام ہے۔ اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ یہودیوں کو برباد کرے اللہ تعالیٰ نے جب چربی ان پر حرام کی تو ان لوگوں نے پگھلا کر اسے بیچا اور اس کی قیمت کھائی"[2]

اور جب ہم مغرب کی طرف دیکھتے ہیں تو وہاں اس قسم کی کوئی ایسی پابندیاں نہیں ہیں جو کسی فرد کو شراب،خنزیراور بتوں کی خرید وفروخت سے منع کریں، اس وجہ سے یہاں اگر "آزادی"سے اس قسم کی آزادی مراد ہے تو اسلام اس کی کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دے سکتا۔

اس کے علاوہ جائداد بنانے کے جتنے بھی جائز طریقے ہیں سب کے سب سے انسان استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔

دفعہ:۱۸

ہرشخص کو فکر،مذہب اور ضمیر کی آزادی کا حق ہے"۔

دفعہ:۱۹

ہر شخص کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہے۔

(ملاحظہ): دفعہ نمبر 18 اور دفعہ نمبر 19 میں چونکہ بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس لیے سیرت طیبہ سے تقابل کرتے وقت ہم دونوں کو ملا کر تقابلی جائزہ پیش کریں گے۔

ان دونوں دفعات کاخلاصہ ہم "آزادئ رائے "اور "آزادئی مذہب " کے الفاظ سے کر سکتے ہیں۔مغرب کا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اِن دونوں دفعات کی وجہ سے ایک مستقل تنازعہ چلا آرہاہے۔مغرب اس بات کا قائل ہے کہ ہر انسان ہر قسم کی رائے رکھ سکتا ہے اور اس کااظہار بھی کر سکتا ہے جبکہ اسلام اس حوالے سے حدود وقیود کا قائل ہے۔اُن کے

---

[1] بخاری،کتاب البیوع، باب تحریم التجارۃ فی الخمر:وقال جابر رضی اللہ عنہ،حرم النبی □بیع الخمر،رقم:2226
[2] بخاری،کتاب البیوع، باب بیع المیتۃ والأصنام.رقم:2236

نزدیک کسی مسلمان ملک سمیت دنیا بھر میں اگر کوئی شخص قرآن کریم یا نبی علیہ السلام کے خلاف کوئی رائے رکھتا ہو تو یہ اُس کے بنیادی حقوق میں سے ہیں۔لہٰذا اس کو اجازت ملنی چاہئیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص نبی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کا مرتکب بنتا ہے تو یہ کوئی خاص بات نہیں (نعوذباللہ)اس کو اپنی رائے کا اظہارکرنا چاہئیے ۔اس کے مقابلے میں اسلام کسی بھی مذہب،اُس مذہب کے شعائر اور مقدس شخصیات کی گستاخی قابلِ سزا جرم تصور کرکے اُسے سزا دینے کا قائل ہے جو مغرب کی نظر میں انسان کی آزادئی رائے کے استحقاق کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ یا نبی علیہ السلام کے خلاف کوئی رائے قائم کی اور پھر اس کی تبلیغ بھی کرنے لگے تو کسی کو بھی اُسے روکنے کاحق حاصل نہیں ہے۔کیونکہ آزادئی رائے کامطلب ہی یہی ہے کہ کو ئی بھی شخص کسی بھی قسم کی رائے،فکر یاخیالات قائم کرسکتا ہے اور پھر اُن کودوسروں تک پہنچانے کاحق بھی رکھتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو اس کی اصل اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب پہلے سے ہی "مذہب" کو الوداع کہہ چکی ہے۔اُن کے قوانین،معاشرے اور حکومتوں میں مذہب کا کوئی بھی کردار نہیں ۔ہاں اگر کوئی ذاتی طور پر کسی مذہب سے متعلق ہے تو یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کوئی مداخلت نہیں کی جاسکتی۔اور یہی بات"ذاتی معاملہ"مذہب کے حوالے سے تمام امور پر حاوی ہے کہ اگر وہ کوئی مذہب چھوڑ کر دوسرا اختیا ر کرناچاہتا ہو کسی مذہب یا اس کی مقدس شخصیات کے متعلق کچھ بھی کہنا چاہتا ہو تو یہ اس کاحق ہے۔کسی کو بھی اس میں مداخلت کرنے کاحق نہیں ہے نہ فرد کو نہ حکومت کو اور نہ ہی ریاست کو۔اور اگر کسی نے بھی اس میں مداخلت کی کوشش کی تو یہ" عالمی منشور برائے انسانی حقوق" کے دفعے"آزادی مذہب" کے خلاف ہوگا۔اور یہ فرد کے" حقِ آزادئی مذہب" میں مداخلت شمار ہوگی جو ایک قابل گرفت جرم ہے۔تبھی تو دنیامسلمانوں کو اس دفعے کی وجہ سے فرد کی آزادئی مذہب میں مداخلت کے مرتکب شمار کرتی ہے۔مغرب نے آزادئی مذہب کی جو حدود بیان کی ہیں اُس کی وجہ سے خاص کر پاکستان میں "قادیانیوں"[1] کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے

---

[1]قادیانی تفرقہ (قادیان) علاقےکی طرف منسوبہ ےجوہندوستان کےضلع پنجاب کےعلاقوں میں سےایک علاقہ ہے،اسک ابانی غلام احمدقادیانی نامی ایک شخص تھا،جوفارسیوں یامغلوں میں سےایک فردتھا،کہاجاتاہےکہ اسکےآباءواجدادکاتعلق سمرقندسےتھا،وہ 1839میں قادیان گاؤں میں پیداہوا،اورایک ایسےخاندان میں پرورش پایاجوغداراورسامراجیت کاایجنٹ تھا. چنانچہ اس کاباپ غلام مرتضی انگریزی حکومت سےبہت مضبوط وابستگی
رکھتاتھااوراسکیکچہریمینایکمنصبکامالکتھا. 1851
میناسکاوالدانگریزونکیحمایتمینشمولیتاختیارکرلیاتھااوراپنیہیعواماوراپنےہیمذہبکےخلافاٹھکھڑاہواتھابرطانویسامراجکیمددکےلئےپچاسفوجیاورپچاسگھوڑےفراہمکیاتھا. غلاماحمدکچھاردو،
عربیکتابونکیتعلیمحاصلکرنےکےبعداورقانونمینکچھلکھنےپڑھنےکےبعد "سیالکوٹ،"
شہرکےدفترمیننوکریکرنےلگاتھا،پھرچندحصونپرمشتملاپنیکتاب "براہیناحمدیہ" کوشائعکرنےلگا . اسنےاپنامجرمانہمشن 1877 سےشروعکیا. 1885 میناسنےاپنےمہدیہونےکادعوٰیکیااورمسیحموعوداورمجددہونےکااعلانکیااورکہنےلگا :
"مینمسیحہوں،اورمینکلیماللہ (اللہسےباتکرنےوالا) ہوں،اورساتھہیمینمحمداوراحمدبھیہوں "
اسیوجہسےوہسارےنبیونسےبہترہونےکابھیدعویکرتاتھا .غلاماحمدکالاہورکےشہرمیں 26 مئی، ۱۹۰۸
میناننتقالہوگیا،اورقادیانکےگاؤںمینسپردخاکہوا .درحقیقتقادیانیاپنےدعوونمیناورگمراہکرنےمینچالبازاورمکارتھا؛جباسنےقادیانیتکیداغبیلڈالیاوراسبڑےگناہکاذمہاٹھایاتوکھلےعاماسلامسےدشمنیکااعلاننہینکیااورصافطورپرمذہباسلامسےبغاوتنہینکیابلکہتجدیدوترقیکےدعوےکالبادہاوڑھکرمنظرعامآیاپھرمہدویتکےدعوےکیطرفمنتقلہوا
.اسکےبعدیہدعویکرنےلگاکہاسکیطرفوحینازلہوتیہےلیکناسطورپرنہینکہایکآزاداورمستقلنبیہوبلکہایکتابعنبیکےطورپرجیسےحضرتموسیکےلیےحضرتہارونتھےپھراپنےذاتیمقاصدکےحصولکےلئےقرآنپاککیآیتونمینمنحرفاوربیکارمطلبنکالناشروعکیا
،اسکےبعدسامراجیوناورسامراجیتکےساتھبڑھچڑھکرتعاونکیااوراپنامجرمانہفتویجاریکیاکہجہادختمہوچکاہےاوراسکاحکممنسوخہوگیاہے،لہٰذابھارتکےبرطانویقابضینکےخلافمسلمانونکاہتھیاراٹھاناجائزنہینہےکیونکہوہ (انگریز)
زمینمیناللہکےجانشیناورخلیفہہیں. .اسکےبعداسکابیٹااوراسکاجانشین - محمود –

آیاوہبھیاپنےباپکےدعوونکوفروغدینےلگااوراسکیآبیاریکرنےلگا،اوراسکےبعداپنےباپکےلگائےہوئےکفرکےمشنکوآگےبڑھا نےلگا،وہلکھتاہے : "
ہمغیرقادیانیکوکافرسمجھتےہیں،کیونکہقرآنہمیںبتاتاہےکہجورسولونمیںسےکسیایکرسولکابھیانکارکرتاہےتووہکافرہوجاتاہےلہٰذاجوبھیغلاماحمدکےرسولہونےکاانکارکرتاہےوہاللہکاانکارکرتاہے۔قادیانیتکیکتابیںیہدعویکرتیہےکہاللہتعالیٰنےغلاماحمدکیط رفوحیاتاریاوراسمیںاسےکہاگیا:
(الذيیحبنيويطيعنيوجبعليهأنيتبعكويؤمنبك،وإلالايكونمحبًّالي،بلهوعدولي،وإنأرادمُنكِرُوكألاّيَقبَلُوا هذا،بلكَذَّبُوكوآذَوك،فنجزيهمجزاءً سيئًا،وأعتدنالهؤلاءالكفارجهنمسجنًالهم)
"جوبھیمجھےچاہتاہےاورمیریاطاعتکرتاہےاسپرضروریہےکہتیریپیرویکرےاورتجھپرایمانلائے،ورنہمیراچاہنےوالانہہوگابلکہوہمیرادشمنہوگااوراگرتمہارےمنکرینأسکوقبولنہکرینبلکہتمہیںجھٹلائیںاورتمہیںاذیتدیںتوہمانہیںبرابدلہدینگےاورہمنےانکافرونکےلئےجہنمکوقیدخانہبناکرتیّاررکھاہے
."قادیانیتکےباطلعقائدمیںیہبھیشاملہےکہسلسلہنبوتہمارےآقاحضرتمحمدصلیاللہعلیہوسلمپرختمنہیںہوابلکہقادیانیتکاتوکہناہےکہ
"نعتقدأناللهلايزاليرسلالأنبياءلإصلاحهذهالأمةوهدايتهاعلىحسبالضرورة" (
ہمارا توعقیدہیہہےکہحسبضرورتاسامتکیہدایتاوراسکےسدھارکےلئےاللہتعالیٰمسلسلانبیاءکوبھیجتارہتاہے .(
واضحرہےکہاسکایہعقیدہاسآیتمبارکہکاصافانکاربلکہکھلمکھلامخالفتہےجسمیںارشادباریتعالیٰہے :"
مَّاكَانَمُحَمَّدٌأَبَاأَحَدٍمِّنرِّجَالِكُمْوَلَكِنرَّسُولَاللَّهِوَخَاتَمَالنَّبِيِّينَوَكَانَاللَّهُبِكُلِّشَيْءٍعَلِيمًا" (الأحزاب: 40)
(محمدتمہارےمردونمیںکسیکےباپنہیں،ہاںاللہکےرسولہیں،اورسبنبیونکےپچھلے،اوراللہسبکچھ جانتاہے.)
اسیطرحاسکایہقولحضرتنبیکرمصلیاللہعلیہوسلمکےاسارشادپاککابھیمنافیہے"لانبيَّبعدي" رواهالبخاري (میرےبعدکوئینبینہیں)
اسکیامامبخارینےروایتکیہے۔قادیانیدھرمکیایکبےایمانییہبھیہےکہنبیوناوررسولونکیعظمتونپرحملےکرتاہےاورخلفاءےراشدیناورصحابہکرامپرزباندرازیکرتاہےاسیطرحجنتکےنوجوانونکےسردارحضرتامامحسناورامامحسینرضیاللہعنہماکیحرمتونامو سپرغلاظتاچھالنےکیکوششکرتاہے،مثالکےطورپرقادیانیکہتاہے : "يقولونعنيبأنيأفضّلنفسيعلىالحسنوالحسين،فأناأقول: نعم،أناأفضّلنفسيعليهما،وسوفيُظهِراللهُهذهالفضيلةَ". "لوگمیرےبارےمینکہتےہیں
کہمیناپنےآپکوحسناورحسینسےبہترکہتاہوں،لیکنمینتوکہتاہوں :
ہاںہاں،مینخودکوانسےبہترکہتاہوںاورعنقریباللہاسفضیلتکودکھادیگا
"(یادرہےکہیہعربیعبارتکاترجمہہےاسلئےلفظونمیںکچھتقدیموتاخیرہوسکتیہے(۔قادیانیتکیگمراہیونمیںسےایکگمراہییہبھیہےکہقرآنمجیدکیآیتونکےمفہومونکومسخکرتاہےاورانمیںہیراپھیریکرتاہےاورمنمانیمطلبنکالتاہے،اسکیمثالیںموجودہیںلیکناتنےزیادہہینکہانکےتذکرےکییہانگنجائشنہیںہے،انمیںسےایکیہہےکہوہسوربنیاسرائیلکیاسآیتکریمہ
"سبحانَالذيأَسربعَبدِهلَيلاًمِنالمَسجِدِالحَرامِإلىالمَسجِدِالأَقصىالذيبارَكناحَولَهلِنُرِيَهمِنآياتِناإنَّههوالسَّمِيعُالبَصِيرُ" (الإسراء:1)
(پاکیہےاسےجواپنےبندےکوراتونراتلےگیامسجدحرامسےمسجداقصیٰتکجسکےگرداگردہمنےبرکترکھیکہہماسےاپنیعظیمنشانیاندکھائیں،بیشکوہسنتادیکھتاہے.)
پرتبصرہکرتےہوئےکہتاہے،کہمسجداقصیسےیہانبیتالمقدسوالیمسجدمرادنہیںہےجیساکہمفسرینکراماورمؤرخینکااتفاقہےاسکاکہناہےکہاسسےمرادقادیانکیمسجدہےکیونکہاسکےخیالمیںحضرتنبی علیہ
السلامکیمعراجاسمسجدسےہوئیجوقادیانکیمشرقیسمتمیںواقعہےاورقادیانیاسمسجدکومسجدحرامکےمماثلقراردیتاہےاور----
----یہعقیدہرکھتاہےکہقادیانکیمسجدہیوہمسجدہےجسکےبارےمیںاللہتعالیٰنےاسارشادپاککونازلفرمایا:" ومَندَخَلَهكانآمِنًا"
(آلعمران)(97: اورجواسمیںآئےامانمیںہو).
قرآنمجیدکیآیتونمیںاسکیبےجااورلایعنیبکواسکیایکمثالیہبھیہےکہوہاللہتبارکوتعالیٰکےاسارشاد
"محمدٌرَسُولُاللهِوالذينمعهأَشِدّاءُعلىالكُفّاررُحَماءُبينهم" الفتح48: 29
(محمداللہکےرسولہیں،اورانکےساتھوالےکافرونپرسختہیںاورآپسمیںنرمدل) مینکہتاہےکہ "محمد" سےاسکیاپنیذاتمرادہے.
چنانچہوہکہتاہے
"محمدهناهوأنا؛لأناللهسمانيفيهذاالوحيمحمدًاورسولاً،كماسمانيبهذاالاسمفيعدةمقاماتأخرى"(یہانمحمدسےمرادمینہونکیونکہاللہتعالیٰنےمجھےاسوحیمینمحمداوررسولقراردیااسیطرحدیگرکئیمقاماتپرمجھےاسنامسےیادکیا.)
اوراسےاپنیتبلیغرسالتکتابمینتحریرکرنےسےبھینہشرمایا،مزیداسکاکہناہےکہ "وماأَرسَلناكَإلاّرَحمةًللعالَمِينَ" (الأنبياء:107)(
اورہمنےآپکونہبھیجامگررحمتسارےجہانونکےلیے) سےمرادمینہوں،اسیطرحسورہصفکیآیت
"ومُبَشِّرًابرَسُولٍيأتيمِنبعدِياسمُهأَحمَدُ "(الصف:6) (انرسولکیبشارتسناتاہواجومیرےبعدتشریفلائینگےانکانامااحمدہے)
کامصداقمینہوں۔قادیانیتکیمصیبتونمیںسےایکمصیبتیہبھیہےکہیہٹولیاپنےدمچھلونکومقاماتمقدسہ وزیارتمکہومدینہسےروکنےاورانکاانسےرشتہمنقطعکرنےکیکوششکیاسیلئےاسنےقادیانگاؤنکومکہمکرمہمیںواقعکعبہشریفکیجائےقبلہاورکعبہقراردیا،اوراپنےمنحرفدھرممیںقادیانگاؤنمیںمنعقدہونےوالےسالانہکانفرنسمیںشرکتکوحجکےقائممقامقراردیا،اسسلسلےمیںاسکاگروگھنٹالقادیانیکہتاہے:" قادیانکوآناحجہے ." اسیطرحقادیانیوننےمغربیپاکستانمیںایکچھوٹاساشہرآبادکیااوراسے "ربوہ"
سےموسومکیااوراسےاپنےدھرمپرچارکےلئےمرکزقراردیااوراسپرتقدسوجلالاورعظمتوہیبتکیچادرچڑھایا .
قادیانیکادعویہےکہاسپراللہکیطرفسےایکقرآناتراجسکانام "کتابمبین"
ہےاوراسپرسارےانبیائےکرامسےبڑھکروحینازلہوئیاسکےعلاوہاسنےاوہاموخرافاتسےلبریزکئیخبیثکتابیںشائعکیںانمیںچندحسب

ذیلہیں : "براھینأحمدیہ"، "إزالةالأوھام"، "حقیقةالوحي"، "سفینہنوح"، "تبلیغرسالت"، "خطبہإلھامیہ"(
یادرہےکہیہمضمونعربیسےترجمہکیاہواہےاسلئےکتابونکےاردوناموںمیںکچھفرقہوسکتاہے) .
اسیطرحقادیانیتکیگمراہکناورمکرفریبکیچالیہبھیہےکہیہٹولیاپنےآپکو "احمدیہ"
کےنامسےمشہورکرتیہےتاکہلوگونکومکروفریبکےذریعہیہاحساسدینکہیہلوگاحمدمجتبیصلیاللہکیطرفمنسوبہیںجبکہحقیقتمیںیہلوگدجالزمانہجھوٹااورنبوتکامدعی "غلاماحمد" کیطرفمنسوبہے۔

اسیطرحقادیانیانگریزقابضینکےخلافجہادمیںمسلمانونکوکمزورکرنےکےلئےجہادکومنسوخکردیااسیلئےوہدعویکرتاتھاکہآجکےبعدسےاسلاممیںکوئیجہادنہیںہےاوراسمیںیہحیلہبازیکرتاتھاکہاللہتعالیٰنےآہستہآہستہجہادکیمشقتکوآسانکردیاکیونکہحضرتموسیکےزمانےمیںبچونکوقتلکرناجائزتھالیکنحضرتمحمدکےزمانےمیںبچوں،بوڑھوںاورعورتونکوقتلکرناناجائزکردیاگیالیکنابمیرےزمانےمیںبالکلاورسرےسےہیجہادمنسوخکردیاگیا . چنانچہوہلکھتاہے
:"آجسےتلوارسےجہادمنسوخہوگیا،اسلئےجوبھیکافرونکےخلافہتھیاراٹھائےگااوراپنےآپکوغازیکہےگاوہحضرترسولصلیاللہعلیہوسلمکےاسفرمانکامخالفہوگاجسمیںانہوںنےآجسےتیرہسوبرسپہلےمسیحموعودکےزمانےمیںجہادکومنسوخفرمادیااورمیںمسیحہونمیرےظہورکےبعداب جہادنہیںہے،ہاںہمصلحکاجھنڈااوراحسانکاپرچمبلندکرتےہیں" دوسریجگہکہتاہے :"
میںنےتوانگریزیحکومتکیحمایتاورجہادکےروکتھاممیںاپنیزندگیکااکثرحصّہگزاراہےاوراببھیاسکےلئےانتھککوششکرتاہونتاکہمسلماناسحکومتکےسچےوفاداربنسکیں."

جھوٹااورالزامتراشغلاماحمدقادیانینےصرفانہیںبدعتوں،خرافتوناوربکواستحریفونپرہیبسنہیںکیابلکہیہانتککہہگیاکہکسیبھیمسلمانکےپیچھےنمازجائزنہیںہےجبتکقادیانینہہو،اسکیعبارتکاترجمہیونہے
:"میراتومشہورمذہبیہیہےکہغیرقادیانیکےپیچھےتمہارینمازجائزنہیںہے،چاہےکوئیبھیہواورکیسابھیہواورچاہےلوگاسکیکتنیبھیبڑائیکرتےہونیہیاللہکاحکمہے،اوریہیاللہکیمشیئتہے،شککرنےوالااورترددمیںرہنےوالےجھٹلانےوالونمیںہیشاملہیںاوراللہتوانکےاورتمہارےدرمیانامتیازچاہتاہے۔مزیدیہکہقادیانیتقیہاورفریبکاسہارالیتاہےاسیلئےکبھیمصلحتکےپیشنظرغیرقادیانیکےپیچھےنمازکوجائزقراردیتاہےبشرطیکہدوبارہدہرالیجائے۔

......شاعراسلاممحمداقبالنےقادیانیونکےمکروفریب،چالبازیوناورمکاریونکاپردہچاککرنےکےسلسلےمیںمضامینکیسیریزلکھااوریہہرگزشتہصدیکیتیسریدہائیونکیباتہے،انکےعلاوہدیگرکئیعلمائےکرام،مبلغیناورمحققیننےبہتتصنیفاتکیں،لیکنپھربھیقادیانیاپنیگمراہی،بےراہرویمیںبہٹکتارہاورسامراجکیحمایتکرتارہااورغلاماحمدقادیانیمذہبیشعورکیکمیاوراپنےاردگردکیجہالتکافائدہاٹھایااورمختلفسماجیحالاتکےاثراتکوکاممیںلایااوراپنےفرضیخیالاتاوراپنیجہالتوناورخرافتونکومنوانےکےلئےمناسبماحولتیارکیا۔الغرضقادیانیتکےمتعلقمختصرباتیہیہکہقادیانیتسامراجیتکاایکبدترینآلہکارہےمذہباسلامکادکھاواکیاجبکہاسلامسےصافطورپربیگانہہے،یادرہےکہسامراجیتکیچالبازیاسگمراہاورگمراہگردھرمکواپنےمقاصدکےحصولکےلئےاستعمالکرنےمیںکامیابرہی،جوہمیشہاسلامکومسخکرنےاورمسلمانونکوکمزورکرنےکےلئےانتھککوششکرتیہے،لیکنپھربھیاسلاماپنےدشمنونکےباوجودسداباقیرہےگاجیساکہارشادباریتعالیٰہے "واللهُغالِبٌعلىأَمرِهِولكنَّأَكثَرَالنّاسِلايَعلَمُونَ" (یوسف: 21)
(اوراللہاپنےکامپرغالبہےمگراکثرآدمینہیںجانتے.(انہینساریباتونکےپیشنظرمسلمانونکااجماعہےکہقادیانیعقیدہاسلامیاصولسےبالکلبیگانہہے،اوراسیوجہسےاسےمذہباسلامسےمرتدقراردیاگیاہے،اورمرتدوہہےجودیناسلامکاانکارکرتاہےاورکسیدوسرےدھرمکواختیارکرلیتاہے . اللہتعالیٰارشادفرماتاہے :"
ومَنيَرتَدِدمنكمعندِينِهفيَمُتوهوكافِرٌفأولئكحَبِطَتأَعمالُهُمفيالدنياوالآخرةِوأولئكأَصحابُالنارِهمفيهاخالِدُون" (البقرة: 217)
"اورتممیںجوکوئیاپنےدینسےپھرےپھرکافرہوکرمرےتوانلوگونکاکیاکارتگیادنیامیںاورآخرتمیںاوروہدوزخوالےہیںانہیںاسمیںہمیشہرہناہے."علمائےکراماورفقہاسلامکےتمامماہریننےمتفقہطورپرفیصلہکیاہےکہاسلامسےمرتداگرشادیکرتاہےتواسکانکاحباطلہوتاہےچاہےمسلمانخاتونسےنکاحکرےیاغیرمسلمسےکیونکہوہتونکاحکےمتعلقاحکاماکامنکرہےالایہکہوہتوبہکرلےاوراسلامکیطرفواپسآجائےاوراپنےمرتدانہفکرسےبیزارگیکااعترافکرلے . اسسلسلےمیںمجمعالبحوثالإسلامیةبالأزھرالشریف
(اسلامیتحقیقاتسنٹر،ازہرشریف،قاہرہ،مصر)
نےشیخجادالحقعلیجادالحقرحمہاللہتعالیکےدورمیںقادیانیتکےبارےمیںایکفیصلہصادرکیاکہقادیانیتانفرقوناورگروہونمیںشاملہےجواسلامکادکھاواکرتےہیںاورانکااسلامسےکوئیتعلقنہیںہے. نیزمجمعالبحوثالإسلامیة (اسلامیریسرچاکیڈمی) نےاگست 2007 میںاپنےفیصلہکومزیدتفصیلکےساتھتازہکیااسمیںبیانکیاگیاکہقادیانیدھرمکےپیروکارمسلماننہیںہیں،اوراسفرقےکااسلامسےکوئیرشتہنہیںہےیہانتککہانکیننئیتحریرونمیںترامیمکےباوجودجوانکےپیروکارونکیطرفسےکئےگئےہیںجنمیںوہدعویکرتےہیںکہاح

کے آئینی دفعہ اور اُن کو "اسلام" کے نام پر اپنے مذہب کی نشرو اشاعت سے منع کرنے،اور امتناع قادیانیت کے قانون کواس دفعے کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں اور مسلسل بین الاقومی طور پر اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔کیونکہ مغرب کی نظر میں "قادیانیوں"کے ساتھ پاکستان کے آئین کے تحت "امتیازی سلوک" ہے اور اُن کی آزادئی رائے میں مداخلت ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دوسری اقلیتیں جو پاکستان میں رہتی ہیں خاص طور پر مسیحی اقلیت، سے متعلق بعض ملکی قوانین کو بھی اس دفعے کی خلاف ورزی کہہ کر اُنہیں ختم کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

دنیا میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جو مذہب کی بنیاد پر ایک قانونی جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔تو لازمی بات ہے کہ یہاں کے قوانین ایسے ہوں گے جو اسلامی تعلیمات اور سیرت طیبہ کی روشنی میں تشکیل پائیں گے یہاں ایسا معاشرہ ہو گا جو قرآنی احکامات اور نبوی تعلیمات کا ایک نمونہ ہوگا۔اسلامی احکامات کی عملداری اس ریاست کی بنیادی فرائض میں شامل ہوگی۔اور یہ دنیا کا ایک مسلم قانون ہے کہ کسی بھی ملک میں بسنے والے شہری کی ذاتی رائےاگر کسی ریاستی قانون کے خلاف ہو تو اس پر اُسے عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی بلکہ ریاستی قانون کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے اُسے چارو ناچار اُسے من وعن قبول کرنا لازمی ہوگا ۔اور اگر اُس آئینی قانون کے خلاف کسی فعل کا مرتکب ہو ا تو یہ اُس کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اُس ریاست کے خلاف بغاوت شمار ہوگی۔جس کے لیے کوئی بھی ملک یا ریاست تیار نہیں ہوگی۔

اس وجہ سے اسلام آزادئی رائے کے سلسلے میں ایسے حق دینے کی اجازت نہیں دیتا۔جس کے نتیجے میں ہمارے ہاں حدود آرڈیننس قائم ہے۔جس کی وجہ سے کوئی بھی توہین رسالت کا ارتکاب نہیں کر سکتا،کوئی بھی غیر مسلم اپنے مذہب کے کھلے بندوں تبلیغ

مدیہفرقہقادیانیہفرقہسےکچھمختلفہے،مذکوربالااکیڈمینےمتنبہکیاکہکچھلوگونکولگتاہےکہقادیانیہاسلامکےفرقونمیںسےایکفرقہہےاورخودقادیانیلوگبھیاسباتکوپھیلاناچاہتےہیںتاکہاپنیضرورتکیتکمیلکےلئےمسلمانونکےزمرےمیںشاملرہیںیہدعویکرتےہوئےکہمسلمانوناورانکےدرمیانصرففکچھذیلیمسائلمیںمعمولیتنازعہہے،لیکنانلوگونکایہدعویسراسرغلطہے،اورصحیح تویہہےکہاحمدیہقادیانیہکاعقیدہ - جیساکہانکیتحریرونسےنمایاںہے- مذہباسلامکیبنیادیاورمشہورتریںاحکامکےمنافیہے . اسیطرحبینالاقوامیاسلامیفقہاکیڈمی (مجمعالفقهالإسلاميالدولي) سےمنسلکاسلامیکانفرنسکیتنظیم (منظمةالمؤتمرالإسلامي) نےجدہمیںبتاریخ 10-16 ربیعالآخر ١٤٠٦ھ۔سےجدہمیںمنعقداپنےدوسرےکانفرنسکےسیشنمیںبمطابق 22-28 دسمبر 1985 اسبارےمیںبحثکیاکہقادیانیتاوراسسےنکلیٹولیجواپنےآپکوقادیانیہلاہوریہکےنامسےمتعارفکراتیہےکیاانددونوںفرقونکومسلمانکےشمارمیںرکھاجائےگایانہیں؟تواسمیںیہفیصلہکیاگیاکہمرزاغلاماحمدنےنبوتورسالتاوروحیآنےکادعویکیاتھااوریہصافطورپرمذہباسلامکےبنیادیاورنمایاںاورمشہورومعروفاصولکامنافیہےکیونکہیقینیاورقطعیطورپریہباتثابتہےکہنبوتورسالتہمارےآقاومولیٰحضرتمحمدصلیاللہعلیہوآلہوسلمپرختمہوچکیہے،انکےبعدکسیپروحینہیںاترےگی،اسدعویکیوجہسےمرزاغلاماحمداورانکےسارےحمایتیمرتدہیںاوراسلامکےدائرےسےخارجہیںاورلاہوریہبھیمرتدہونےکےحکممیںقادیانیہکیطرحہیںہےاگرچہکہیہلوگمرزاغلاماحمدکوہمارےنبیحضرتمحمدصلیاللہعلیہوسلمکاظلاورعکسقراردیتےہیں . اسیطرحبینالاقوامیاسلامیفقہاکیڈمی (مجمعالفقهالإسلاميالدولي) سےمنسلکاسلامیکانفرنسکیتنظیم (منظمةالمؤتمرالإسلامي) نےاپنےپہلےسیشنمیںقراردادنمبر ٣ میںبالاتفاقیہفیصلہکیاکہعقیدۂقادیانیتجسےاحمدیہبھیکہاجاتاہے-----

-----اسلامسےبالکلخارجہےاوراسکےماننےوالےکافرہیںاوراسلامسےمرتدہیںاورانلوگونکااسلامکادکھاواکرنادراصلدھوکہاورمکروفریبکےلئےہے،اسلئےتماملوگونپربشمولحکومتوں،علمائےکرام،اہلقلم،مفکریناوردعوتوتبلیغسےوابستہبلکہدیگرتماملوگونپرضروریہےکہدنیاکےہرہرحصےمیںاسگمراہدھرماوراسکےماننےوالونکامقابلہکریںاورانکاروکتھامکریںاوریہیفتویاللجنةالدائمةللبحوثالعلميةوالإفتاءبالمملكةالعربيةالسعودية(دائمیکمیٹیبرائےعلمیتحقیقاتاورفتوینویسیسعودیعربیہ) نےبھیصادرکیا۔(http://www.daralifta.org/viewMoslemFatawa.aspx?ID) مورخہ28/11/2017

نہیں کر سکتا کوئی بھی انسان اللہ تعالیٰ ،نبی علیہ السلام اور شعائر اسلام کے خلاف کسی بھی قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔اس وجہ سے مغرب مسلسل اسے آزادئی رائے کے خلاف تصور کرکے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

مسلمان یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں اپنے آئینی مذہب"اسلام"کے تحفظ اور اس کی نشر واشاعت کی ذمہ داری"ریاست"پر آتی ہے جس میں یہ بھی شامل ہے کہ ملک میں بسنے والے تمام افراد کو یہ حق تو ہے کہ وہ اپنانظری اختلاف تو رکھ سکتے ہیں اور آئین میں بیان شدہ تمام حقوق سے مستفید ہو سکتے ہیں لیکن کسی بھی بنیاد پر اس اسلامی اور نظریاتی ملک کے آئین اور اس کے اسلامی تشخص کو کسی بھی طریقے سے چیلنج نہیں کیاجا سکتا ۔

جہاں تک "قادیانی مذہب"کا مسئلہ ہے اس حوالے سے مولانا زاہدالراشدی[1] کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ"اس سلسلہ میں قادیانیوں کا موقف اور طرز عمل سب سے زیادہ تعجب انگیز بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ وہ عالم اسلام کے اجماعی فیصلے کو ماننے سے انکاری ہیں، پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے دستوری فیصلے سے منحرف ہیں، ملک کی سپریم کورٹ کے متفقہ فیصلے کو تسلیم نہیں کر رہے اور پاکستان کے شہریوں کے جمہوری فیصلے سے انحراف کر رہے ہیں، اور اس سب کچھ کے ساتھ ان کا اصرار ہے کہ پوری امت مسلمہ اور ساری کی ساری پاکستانی قوم ان کے سامنے سرنڈر ہو اور تمام جمہوری، عدالتی اور دینی فیصلوں سے دست بردار ہو کر ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مسلمان کے طور پر اپنے وجود کا حصہ تسلیم کرے، آج قادیانی گروہ دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ پاکستان میں ان کے انسانی حقوق اور مذہبی آزادی پامال کی جا رہی ہے اور وہ مظلوم ہیں جبکہ بین الاقوامی ادارے اور مغربی ممالک حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے چلے جار ہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ مسئلہ قادیانیوں کے مذہبی یا شہری حقوق کا نہیں بلکہ ان کے معاشرتی سٹیٹس اور حقوق کے ٹائٹل کا ہے، وہ اگر اپنے بارے میں دستوری، عدالتی اور شرعی فیصلوں کو قبول کر کے مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں تو ملک کی دیگر غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور ان کے کسی مسلمہ حق سے انکار نہیں ہے، لیکن اگر وہ جمہوری اور دینی فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے دستور و قانون کو چیلنج کرتے ہیں اور مسلم اکثریت کا زبردستی حصہ بننا چاہتے ہیں تو اس کا سرے سے کوئی امکان موجود نہیں ہے[2]" یہ بات ملحوظ نظر رہے کہ اسلام میں جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اُسے "مرتد" کہا جاتا ہے ۔اسی طرح سابقہ آسمانی کتب میں جو احکام موجودتھے اور وہ واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں اورقرآن میں اس کے نسخ کے متعلق کچھ احکام نہ ہو تو وہ بھی اسلام ہی کا ایک حکم متصور ہوگا۔اب اگر مغرب سے یہ سوال کیا جائے کہ تمہاری اپنی کتابونمیں مرتد کے لیے جو سزا تھی اسلام وہی سزا تجویز کرتا ہے اس میں صرف اسلام پر نہیں بلکہ تمہارے ادیان پر بھی

---

[1] محمد عبدالمتین خان،زاہد،المعروف ابو عمار زاہدالراشدی بن مولانا محمد سرفرازخان صفدررحمہ اللہ،20اکتوبر1948ءکو گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔سواتی پٹھان ہے۔فاضل درس نظامی ہے۔صدر مدرس وناظم تعلیمات جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ہے۔جمعیۃ العلماء اسلام پاکستان کے موجودہ امیر مولانا فضل الرحمان کے والدمولانامفتی محمود رحمہ اللہ کے دست راست رہ چکے ہیں۔اہم ملکی ومذہبی عہدوں پر فائز رہ رہے ہیں ۔ ماہنامہ"الشریعہ" کے مدیر ہے۔دنیا کے بیشتر ممالک کے تعلیمی وتبلیغی دورے کر چکے ہیں۔مصنف کُتب کثیرہ ہیں۔ (WWW.ZAHIDRASHDI.ORG 25/11/2017)

[2] زاہدالراشدی،ابو عمار،اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی نقطہ نظر،ص18، الشریعہ اکادمی گوجرانوالا،1433ھ

الٰہی آتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل جب بچھڑے کی عبادت کر کے ارتداد کے مرتکب ہوئے تو اُن کے بارے میں آسمانی فیصلہ یہ تھا کہ:

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھائیو ، تم نے بچھڑے کو (معبود) ٹھہرانے میں (بڑا) ظلم کیا ہے ، تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اور اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو۔ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ پھر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ وہ بے شک معاف کرنے والا (اور) صاحبِ رحم ہے"[1]

قادیانی مذہب کے ماننے والوں کے بارے میں پاکستان کے تمام علماء (دیوبندی،بریلوی،اہلحدیث وغیرہ) نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اُن کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اُن کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے گا۔قادیانیوں نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کیا اورآج تک وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔1984ء میں ایک آرڈیننس کے تحت اُن پر یہ پابندیاں لگائی گئیں کہ وہ اپنی عبادت گاہ کو "مسجد"اپنے لیڈر کو"رسول"اپنے حکمران کو "امیرالمؤمنین"نہیں کہہ سکتے اسی طرح وہ ام المؤمنین،نماز،روزہ اور حج کی اصطلاحات بھی اپنے مذہب کے حوالے سے استعمال نہیں کر سکتے۔اس وجہ سے مغرب انہی قوانین کو ٹارگٹ بنا کر پاکستان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ان قوانین کو ختم کیا جائے کیونکہ یہ انسان کی آزادئی رائے اور آزادئی مذہب کے حقوق کے منافی ہے۔حالانکہ نبی علیہ السلام کے بعد ایک اور نبی کے ماننے کی وجہ سے وہ شریعتِ محمدی ﷺ سے نکل گئے ہیں اور چونکہ رسول،مسجد،نماز،روزہ،حج،امیرالمؤمنین وغیرہ کی جو اصطلاحات ہیں وہ اسلام کا"ٹریڈ مارک"ہیں اور اس دنیا کا ایک مسلم قانون ہے کہ کسی بھی کمپنی کے ٹریڈ مارک کو استعمال کرنا قانونی طور پر درست نہیں ہے بلکہ اگر کسی نے ایسا کام کیا تو سزا کا مستحق قرار پائے گا۔اس وجہ سے اگر "مغرب" یا قادیانی مذہب والے یہ مطالبہ کریں ،تو یہ توزیادتی پر زیادتی ہوگی کہ اسلام کو مانتے بھی نہیں اور اسلام کےٹریڈ مارک کو استعمال بھی کریں ۔اوراوپر سے شکوے بھی کرتے پھریں کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔

پاکستان کے لیے یہ مرحلہ ذرا الجھن کاہے کہ اقوام متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے وہ اقوام متحدہ کے قوانین ماننے کا پابند ہے جبکہ دوسری طرف ایک نظریاتی مسلمان ملک کے ناطے اسلام سے اِس جیسے قوانین سے دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔اس وجہ سے اِن قوانین کو عقیدے کے لحاظ سے ماننے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اقوام متحدہ کا اپنا ایک نظام ہے جس کی بنیاد پر وہ انکے قوانین بنتے ہیں اور جو کوئی بھی ملک یا فرد اُن قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اقوام متحدہ کے وضع کردہ قوانین کے تحت انسانی حقوق کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے ۔آزادئی رائے اورآزدئی مذہب کے بارے میں اُن کے اپنے اصول ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی دین،مذہب کے خلاف کیوں نہ ہو۔

آزادئی رائے کے حوالے سے مولانا زاہدالراشدی کےالفاظ میں اسلامی تعبیر کچھ یوں ہے۔

<u>آزادیٔ رائے کی حدود:</u>عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے د فعہ ۱۹ میں آزادیٔ رائے کی بات کی گئی ہے اور اس کی بنیاد پر کہا جا رہا ہے کہ مذہب اور مذہبی شخصیات سے اختلاف اور ان پر تنقید بھی آزادیٔ رائے کا حصہ ہے اور اس کو جرم قرار دے کر اس پر موت کی سزا مقرر کرنا آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کے انسانی حق کے منافی ہے۔ یہ بات مغالطہ

---

[1] البقرة 54:2

کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ اختلاف رائے اور چیز ہے اور توہین اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مسلمانوں نے علمی اختلاف کا جواب ہمیشہ علمی انداز سے دیا ہے، صدیوں سے مستشرقین اسلام پر، قرآن کریم پر اور جناب نبی اکرم□کی شخصیت اور کردار پر اعتراضات کر رہے ہیں اور مسلمان دانش ور ان کے جوابات دے رہے ہیں، لیکن جناب نبی اکرم□یا کسی بھی سچے رسول اور نبی کی توہین کو انہوں نے کبھی برداشت نہیں کیا اور نہ ہی آئندہ کبھی یہ بات برداشت ہو سکتی ہے۔ میں اس کی دو واقعاتی مثالیں دینا چاہوں گا۔ مغرب کے ایک دانش ور سرولیم میور نے جناب نبی اکرم□ کی سیرت طیبہ پر کتاب لکھی اور اس میں بعض اعتراضات کیے، ان میں اعتراضات کا مسلمانوں کی طرف سے کتاب کی صورت میں جواب دیا گیا، لیکن سلمان رشدی [1]نے ''شیطانی آیات'' کے نام سے خرافات کا مجموعہ مرتب کیا جس کی بنیاد علمی یا تاریخی اشکالات پر نہیں بلکہ توہین و استخفاف اور طنز و استہزاء پر تھی، اس لیے اسے برداشت نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اب سے ڈیڑھ سو سال قبل لاہور میں ایک ہندو دانش ور پنڈت دیانند سرسوتی[2] نے ''ستیارتھ پرکاش'' کے نام سے کتاب لکھی اور اس کے ایک باب میں قرآن کریم اور جناب نبی اکرم□کے بارے میں سو سے زیادہ اعتراضات کیے، مسلمان علماء نے اس کتاب کا جواب لکھا اور پنڈت سرسوتی سے براہ راست مباحثہ کر کے اسے لا جواب کیا۔ لیکن لاہور میں ہی ایک اور ہندو مصنف راج پال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے کتاب لکھی جس کا نام ہی توہین آمیز تھا، اسے برداشت نہیں کیا گیا ۔

اختلاف اور توہین میں فرق ہے اور توہین رسالت□کو جرم قرار دینے پر اعتراض در حقیقت توہین کو حقوق میں شامل کرنے کی بات ہے جو قطعی طور پر غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں ''ہتک عزت'' پر قانونی چارہ جوئی کا حق شہریوں کو حاصل ہے اور ''ازالۂ حیثیت عرفی'' سے شہریوں کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہے، اگر کسی ملک کے ایک عام شہری کی ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی جرم ہے تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ہتک عزت اور آزالۂ حیثیت عرفی اس سے کئی گنا زیادہ سنگین جرم ہے، اس لیے کہ اس کے ساتھ پیغمبر اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کروڑوں عقیدت مندوں کے دلی جذبات کی توہین بھی شامل ہو جاتی ہے۔

''آزادیٔ رائے'' کے حوالہ سے ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ کم و بیش ہر ملک میں اس کی نظریاتی اساس، اس کے دستور اور قومی شخصیات کی توہین کا کسی کو حق نہیں دیا جاتا، حتیٰ کہ قومی شعائر مثلاً پرچم وغیرہ کی حرمت کے قانونی تحفظ کا اہتمام کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ فوج کی وردی، پولیس کی وردی اور ان کے سٹارز وغیرہ کو بھی قومی شعبوں کی علامات قرار دے کر ان کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح اسلام بھی چونکہ ایک اسلامی ریاست کی دستوری اساس ہے، اس لیے اسلام کے شعائر اور دینی علامات کی توہین بھی جرم ہے، اور انسانی حقوق کے نام سے ان شعائر اور علامات کی بے حرمتی کا جواز فراہم کرنا انصاف اور عقل کے خلاف بات ہے۔

---

[1] احمدسلمان رشدی،کشمیری:،دیوناگری:ایک بھارتی برطانوی ناول نگار اور مضمون نگار ہے۔ 19 جون 1947 کو ممبئی میں پیدا ہوئے۔ دہریت اس کا مذہب ہے۔ اسکا چوتھا ناول، شیطانی آیات (The Satanic Verses) ایک بڑے تنازع کا مرکز تھا، جس نے کئی ممالک میں مسلمانوں کو احتجاج پر اکسایا۔14فروری1989 کوایرانی شیعہ لیڈرآیت اللہ خمینی کی طرف سے جاری ایک فتوی میں سلمان رشدی موجب قتل قرار دیا گیا۔جو آج تک جاری ہے(http//ur.wikipedia.org/wiki)

[2] پنڈت سرسوتی ایک ہندو مذہبی دانشور ہے ۔مشترکہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔اور وہیں وفات پائے۔اسلام کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جس کانام تھا''ستیارتھ پرکاش''۔علمائے اسلام نے اس کا مدلل جواب دیا اور وہ لاجواب ہوگئے۔

ہمارا مغرب سے مطالبہ ہے کہ اختلاف اور توہین کے فرق کو تسلیم کیا جائے اور جس طرح کسی بھی ملک کی قومی شخصیات اور قومی علامات کی حرمت و عزت کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، مسلمہ مذاہب اور ان کی علامات و شعائر کے قانونی تحفظ کا حق تسلیم کیا جائے[1]۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام "آزادئی رائے" اور"آزادئی مذہب" کا قائل تو ہے لیکن اس کے لیے وہ حدود متعین کرتا ہے۔اول الذکر کے بارے میں قرآنی آیت بطور استشہاد کے یہ پیش کی جاتی ہے کہ:

"اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ کیا تُو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت وخون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"[2]

یہاں پر فرشتوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ باری تعالیٰ اگر آپ اپنی عبادت کے لیے کسی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتے ہو تو ہم ہیں نا۔عبادت بھی کرتے ہیں اور آپ کی نافرمانی بھی نہیں کرتے۔

اور"آزادئی مذہب "کے حوالے سے بالکل واضح حکم موجود ہے کہ کسی کو زبردستی اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان بنانے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ کاارشاد ہے:" لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ"[3] دین (کے قبول کرنے)میں کوئی جبر نہیں ہے"

اسلام کہیں بھی یہ تصور نہیں دیتا کہ لوگوں کو زور زبردستی سے مسلمان بناؤ۔بلکہ وہ تو ایک فطرتی دین ہے کہ لوگ خود بخود آتے رہے ہیں اور آتے رہینگے۔

---

[1] اقوامِ متحدہ کا منشور اور اسلامی نقطہ نظر،ص18،19

[2] البقرہ30:2

[3] البقرہ256:2

دفعہ: ۲۰

(۱)ہرشخص کو پرامن طریقے پر ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔

(۲)کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اس دفعے اور اس کے بعد والے دفعے میں "سیاسی نظام" کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

اسلام کا اپنا ایک زبردست سیاسی نظام ہے جس میں ریاست،ریاستی ادارے اورحکومت وغیرہ کے اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں۔معاشرے میں سیاسی گروپ بندی کی نظائر بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں۔اسلام سے پہلے بھی سیاسی گروہ بندیاں تھیں جن کی صورتیں قبائلی سسٹم کی شکل میں تھیں۔اس سسٹم میں سیاسی امور نمٹانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مختلف قبائل میں مختلف امور تقسیم ہوا کرتے تھے جن کی بجاآوری اس قبیلے کی ذمہ داری ہوتی تھی ۔اسلام کے بعد بھی بسا اوقات سیاسی گروہ بندیاں منظر عام پر نظر آئی ہیں۔جیسا کہ نبی علیہ السلام کی رحلت فرمانے کے فوراََ بعد خلافت کے موضوع پر خاندان نبوت،مہاجرین وانصار کی گروہ بندی ۔کہ اِن تینوں کا سیاسی مؤقف ایک دوسرے سے مختلف تھا۔انصار ملک کے اصل باشندے تھے اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔جبکہ مہاجرین "سابقینِ اسلام" کی بنیاد پر اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتے تھے۔خاندانِ نبوت کے ایک فرد کی حیثیت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک الگ نقطہ نظر تھا۔قطع نظر اِن سب امور کے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سیاسی و معاشرتی امور پر مسلمانوں کے اندر الگ الگ نقطہ نظر اختیار کرنا اور عملاََ اس کے لیے کوشش کرنا پہلے دور کے اسلامی معاشرے میں موجود تھا۔

انجمن سازی اور اس میں شرکت کے حوالے سے انسان آزاد ہے لیکن یاد رہے کہ یہ آزادی کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے استعمال نہ کی جائےگی۔ آج کے دور میں سیاسی امور کے حل کے لیے ترقی یافتہ شکل "سیاسی نظریات" اور "سیاسی پارٹیوں"میں موجود ہے۔اس وجہ سے اگر انجمن سازی کی بنیاد اور اس کی حدود وشرائط :" نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو"[1]پر قائم ہو تو اس میں اسلامی نقطہ نظر سے کوئی اشکال نظر نہیں آرہا۔

---

[1]المائدہ2:5

فصل چہارم
"عالمی منشور برائے انسانی حقوق" دفعہ 21تا دفعہ 30کا سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ

دفعہ: ۲۱

(۱)ہر شخص کوحکومت کا حصہ بننے کا حق ہے۔
(۲)ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔
(۳)حکومت عوام کی مرضی سے بنی گی۔

یہ تعلقات سیاسی امور سے تعلق رکھتے ہیں۔جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اس وجہ سے اسلام کا اپنا ایک سیاسی نظام بھی ہے۔جس میں "سیاست" سے متعلق تمام امورزیر بحث آتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے ا س عالمی منشور برائے انسانی حقوق کی روشنی میں ہر وہ طرز سیاست اور حکومت جائز اور درست ہوگا جس میں عوام کی رائے حرف آخر سمجھی جائے گی۔اورجس معاشرے کے ہر فرد کو ڈائریکٹ یا اِن ڈائریکٹ اپنی رائے دینے کاحق ہو اور پھر حکمران اُس رائے کے مطابق عملدرآمد کرنے کا پابند ہوگا۔اور جو معاشرہ یا حکومت اس سے ہٹ کر ہوگی وہ اقوام متحدہ کے قانون میں جائز نہیں ۔

پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ"اسلامی طرزِسیاست" اور اقوام متحدہ کی مرضی کے مطابق"جمہوریت"سے چلنے والی سیاست میں بہت فرق ہے۔نہ تو اسلام موجودہ "جمہوریت" کامکمل حامی ہے اور نہ ہی مکمل مخالف۔سیاست میں ایک مرحلہ "حکومت" کا بھی آتا ہے جس کے چلانے والے کوجمہوریت کی زبان میں "حکمران"کہتے ہیں جبکہ اسلامی طرز سیاست میں اس کے چلانے والے کو"خلیفہ"کہلاتا ہے۔خلیفہ کے معنی ہے"نائب"۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

" اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ(بادشاہ) بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے فیصلے کیا کرو"[1]

اسی طرح حدیث میں آتا ہے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں:

> "بنی اسرائیل کے انبیاء ان کی سیاسی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے، جب بھی ان کا کوئی نبی ہلاک ہو جاتا تو دوسرے ان کی جگہ آ موجود ہوتے، لیکن یاد رکھو میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ہاں میرے نائب ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ان کے متعلق آپ کا ہمیں کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس سے بیعت کر لو، بس اسی کی وفاداری پر قائم رہو اور ان کا جو حق ہے اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن ان کی رعایا کے بارے میں سوال کرے گا"[2]

یہی سے "خلافت" کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔اور اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ ہر دو نظامہائے حکومت ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں کیونکہ ایک نظام میں سب کچھ "عوامی رائے" کے تابع ہوگا اوردوسرے میں سب کچھ"آسمانی ہدایات" کے مطابق ہو کر رہے گا۔اول الذکر میں حکمران کی حیثیت"بادشاہ" کی ہوگی جب کہ "ثانی الذکر" میں ایک نائب کی ۔جس میں اصلاََ"حکم چلانے" والا کوئی اور (اللہ تعالیٰ)ہوتا ہے۔ اور "خلیفہ"نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے احکام کانفاذ کرنے والا ہوگا۔

اقوام متحدہ کے رکن ملک ہونے کے ناطے اس کے ممبر ممالک اس بات کے پابند ہیں کہ ان کاطرزِ سیاست وحکومت"عوام" اور شہریوں کی اجتماعی رائے کے مطابق ہوگی۔اور عوام کی مرضی کے بغیر کسی بھی طریقے سے حکومت چلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔کیونکہ یہی"جمہوریت" ہے جس میں عوام کی حکومت،عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے ہوگی۔

---

[1] سورة صٓ26:38

[2] بخاری،کتاب احادیث الانبیاء،باب ماذکر عن بنی اسرائیل،رقم:3455

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافت ایک ایسا طرز حکومت ہے جو قرآن وسنت کی بنیاد پر قائم ہو۔جس میں "خلیفہ" عوامی مرضی کے بجائے فیصلے اللہ تعالی کے احکامات اور نبی علیہ السلام کے طریقوں کے مطابق کرتے ہیں۔کیونکہ "خلیفہ" نبی علیہ السلام کی نیابت کرتے ہوئے عوام کے اجتماعی امور نمٹاتے ہیں۔کسی کو بھی اسلامی احکام میں ردوبدل کا اختیا ر نہیں ہے،بلکہ اُن احکام کی پابندی ملک کے ہر باشندے (چاہے حکمران ہو چاہے رعایا ہو)کے لیے لازمی ہوگی۔جہاں کسی حکم کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح ہدایات موجود نہ ہو وہاں "اجتہاد" کے ذریعے فیصلے کیے جائیں گے۔انتظامی امور کے لیے "خلیفہ"یا حاکم اپنی مرضی سے ڈھانچہ بنا نے کا حق رکھتا ہے۔لیکن جن مسائل کا تعلق شرعی امور اور دینی تعبیر و تشریح سے ہے ان میں صرف اُن اہل علم کےفیصلے معتبر ہوں گے جن کا علم وفضل سب کے نزدیک مسلّم ہو۔ "خلیفہ" کے انتخاب میں عوامی رائے کا احترام کیاجائے گا۔لیکن یہاں عوام سے مراد اہل الرائے ہیں جسے اہل حل وعقد بھی کہا جاتا ہے۔اگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو دیکھا جائے تو وہ بھی عوامی رائے کی بنیاد پربنی تھی ۔نامزدگی تو نبی علیہ السلام کی جانب اقدس سے ہوئی تھی لیکن فیصلہ عوامی رائے پرچھوڑا گیا تھا۔مسلم شریف کی روایت ہے کہ:

> "نبی علیہ السلامنے اپنے مرضِ وفات میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:ابوبکر اور اَپنے بھائی کوبلاؤ تاکہ میں اُن کے لیے کچھ لکھو۔مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی اس تمنا کی اظہار نہ کرے کہ میں "اولیٰ" ہو۔ اللہ تعالیٰ ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے اور مسلمان بھی کسی اور کو قبول نہیں کریں گے"۔لیکن پھر آپ ﷺ نےاپنا یہ ارادہ ترک فرمادیا۔اور ہوا بھی ایسا کہ نبی علیہ السلام کی رحلت فرمانے کے بعد اس مسئلہ میں اختلاف تو ہوا لیکن آخرکار سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے "خلیفہ اول" مقرر ہوئے۔اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خلیفہ کاانتخاب درجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے"[1]

1۔مسلمانوں کے اہل حل وعقد خلیفہ کا انتخاب کریں۔جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کاانتخاب ہوا تھا۔

2۔خلیفہ اپنا جانشین خود مقرر کریں گے جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایاتھا۔

3۔اکابرمسلمانونمیں سے ایک گروپ مقرر کیا جائے جو خلیفہ کا انتخاب کریں گے جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک پینل تشکیل فرمایا تھا جس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنازبیر رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ شامل تھے۔

4۔کسی خلیفہ کی وفات پر اہل الرائے نئے خلیفہ کاانتخاب کریں گے جیساکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر مدینہ منورہ میں موجود اصحاب شوریٰ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرکے خلیفہ منتخب کیا تھا۔

5۔خلافت کے اہل شخص کا طاقت کے بل بوتے اقتدارپر قبضہ کرنا اور امت کا اُسے قبول کرنا جیسا کہ سیدنامُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کوسیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کے

[1] مسلم،کتاب فضائل الصحابہ،باب من فضائل ابی بکر رضی اللہ عنہ،رقم:6332

بعد امت نے قبول کر لیا تھا اور وہ اس کے بعد کم و بیش بیس برس تک امت کے متفقہ امیر المؤمنین رہے۔

ایک شرعی خلیفہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے درجہ بالا طریقوں میں سے دوسرا،تیسرا اور چوتھا طریقہ تو موجودہ دور میں ممکن نہیں ہے۔اس کے علاوہ جو دو طریقے ہیں وہ قابل عمل ہیں اہل الرائے(اقوام متحدہ کے قانون میں ہر بالغ فرد)کے انتخاب کے ذریعےاور طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ کرنے کے ذریعے،جس کو عوام اپنا "حکمران" بھی تسلیم کرلیں اور عملی طور پر اُس کے احکامات نافذ بھی ہو جائیں۔

بہر حال خلیفہ کے انتخاب میں یہ باتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔

1۔یہ انتخاب عام مسلمانوں کی مرضی کے مطابق ہوگا

2۔خلافت کوئی خاندانی چیز نہیں ہے۔

3۔"خلیفہ"اپنے آپ کوحکمران سمجھنے کی بجائے اللہ تعالی کے احکام کے تابع سمجھے گا۔

4۔دلیل کی بنیاد پرکسی امر میں خلیفہ وقت سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ دور کی سیاسی اصطلاح میں ایسے طرز حکمرانی کو "قانون"اور"دلیل" کی حکومت کہا جاتا ہے۔پس اگر اقوام متحدہ کے قانون"جمہوریت"کا یہ مطلب ہے کہ عوام کی مرضی سے حکومت بنے تو یہ کارنامہ تو اسلام نے آج سے صدیوں پہلے سرانجام دیا تھا فرق صرف اصطلاح کی ہے کیونکہ یہاں"جمہوریت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اسلام میں"شورائیت"۔اور اگر "جمہوریت" کے معنی یہ ہیں کہ عوام کی ہر جائزوناجائز خواہشات پوری ہوں ،زندگی سے متعلق دیگر امور میں وہ خود مختار ہو ،اور جس بات پربھی عوام متفق ہوجائے وہی قانون ہوگا تو ایسی جمہوریت کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔اسی طرح عوام کے انتخاب سے وجود میں آئی ہوئی "پارلیمنٹ" بھی فیصلہ کرنے میں خودمختار نہیں ہو گی بلکہ وہ بھی اسلامی تعلیمات کی پابند ہوگی۔اسی وجہ سے دنیا اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کرتی ہے کہ اسی طریقے پر تو پھر"پارلیمنٹ کی خودمختاری" ختم ہوجاتی ہے۔ جو کہ دنیا کے مروجہ قوانین کے خلاف ہے۔لیکن اوپر کی سطور میں وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کااپنا الگ ایک جامع سیاسی نظام ہے جس میں کسی دوسرے نظام یا اُس نظام کے دفعات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

موجودہ دنیا میں خلافت کے حوالے سے اگر سعودی عرب[1]کے طرز حکومت اور پاکستان کے طرزحکومت کو دیکھا جائےتو یہ دستور ''خلافت''کے تصور کے قریب ہیں، کیونکہ سعودی عرب میں حاکمیت اعلیٰ قرآن و سنت کی ہے، حکمرانی کا حق خاندانِ" آل سعود" کو حاصل ہے مگر وہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں اسی طرح پاکستان کے دستور اور آئین میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی

---

[1]**مملکت سعودی عرب:جزیرہ نمائے عرب**میں سب سے بڑا ملک ہے ۔ شمال مغرب میں اس کی سرحداردن، شمال میں عراق اور شمال مشرق میں کویت،قطر اور بحرین اور مشرق میں متحدہ عرب امارات،جنوب مشرق میں عمان،جنوب میں یمن سے ملی ہوئی ہے جبکہ خلیج فارس اس کے شمال مشرق اوربحیرہ قلزم اس کے مغرب میں واقع ہے ۔ یہ حرمین شریفین کی سرزمین کہلاتی ہے کیونکہ یہاں اسلام کے دو مقدس ترین مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منور موجود ہیں۔https://ur.wikipedia.org/wiki-سعودی عرب)مورخہ 28/11/2017

عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن و سنت کے پابند ہیں۔

دفعہ:۲۲

ہر شخص کو قومی و بین الاقوامی سطح پرمعاشرتی تحفظ حاصل ہوگی"۔

معاشرہ کی تعمیر وترقی کے لیے ضروری ہے کہ فرد کو اس کے تمام جائز حقوق میسر ہوں ۔سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ :معاشرے میں آباد تمام افراد کو اپنے علاقے اور ملک کے دائرے میں تحفظ حاصل ہو۔جس کے لیے اگر باہر کی دنیا سے کوئی مدد لینے کی ضرورت پیش آئے تو ملکی قانون کی روشنی میں وہ اُس مدد سے بھی استفادہ کر سکتا ہے۔معاشرتی تحفظ بہت سارے دیگر حقوق کے ساتھ ساتھ کسی فرد کی شخصیت اور عزت کوبھی ملحوظ نظر رکھتی ہے۔

سیرتِ طیبہ میں اس حوالے سے کوئی اشکال نہیں ہے۔فرد کے تمام جائز معاشرتی حقوق،اُس کی شخصیت اور عزت کے حوالے سے ہر قسم کے قانونی کارروائی،جدوجہداور لائحہ عمل ترتیب دینے میں سیرت طیبہ کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔

دفعہ:۲۳

(۱)ہرشخص کو اپنے لیے روزگار تلاش کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔
(۲)ہرمزدور مناسب مشاہرے کا حق رکھتا ہے۔
(۳)ہرشخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جوخود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو۔اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذرائع سے اضافہ کیا جا سکے۔
(۴)ہرشخص کو اپنے مفاد کےبچاؤ کے لیےتجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

معاوضے کی بنیاد پرکسی سے کام لینا اور کسی کے لیے کام کرنا ایک انسانی حق ہے،جس کے لیے کام کیا جاتا ہو اس کا بھی حق ہے کیونکہ ہر کوئی تو ہر قسم کے کام سرانجام نہیں دے سکتا۔اسی طرح ہر کسی کے پاس تو اتنی دولت نہیں ہوتی جس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی انسان معاوضے پر کسی کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ ہو ۔یہ دنیا کاقانون ہے مال دار لوگ معاوضہ دے کر اپنے کام کراتے ہیں جبکہ غریب لوگ محنت مزدوری کرکے معاوضہ لیتے ہیں ۔جس کے نتیجے میں دونوں طبقے خوشحالی کی زندگی بسرکرتے ہیں۔

سیرت اور اسلام کے موضوع میں یہ تمام امورمعاملات کے جزء"اجارے"سے متعلق ہیں۔اسلامی فقہ میں"کتاب الاجارہ" کے نام سے ایک مستقل عنوان موجود ہے۔اجارے کے حوالے سے قرآنی آیت میں بھی اس طرف اشارہ ہے جیساکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں اللہ جل شانہ کاارشاد ہے:

" إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ"[1]"بہتر نوکر جو آپ رکھیں وہ ہے (جو) توانا اور امانت دار (ہو)۔

<u>کسی کو کام پر رکھنے کے لیے مطلوبہ صفات:</u>اسلام میں ہرکسی کو جائز کام کاج کی مکمل اجازت ہے،چاہے وہ اپنا کوئی کاروبار کرتا ہو یا کسی دوسرے(ادارے،حکومت وغیرہ)کے ساتھ مل کر شرکت کے ساتھ یا کسی معاوضے کے بدلے کام ہو۔قرآنی تعلیمات اس بارے میں جو اصول بیان کرتی ہیں اُس میں مالک اور کام کرنے والے کے درمیان انصاف پر مبنی شرائط ہیں۔ وپر کی آیت میں نوکر رکھنے کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ایک یہ کہ وہ کام کرنے کا اہل بھی ہو اور کام کرنے کے سلسلے میں امانت دار بھی ہو۔جیسا کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا ہےکہ:

" ان دونوں صاحبزادیوں میں سے ایک نے باپ کی توجہ دلائی۔ (یہ توجہ دلانے والی صاحبزادی وہی تھیں جو آپ علیہ

[1] القصص26:28

السلام کو بلانے گئی تھیں)کہا کہ "انہیں آپ ہماری بکریوں کی چرائی پر رکھ لیجئے کیونکہ وہ کام کرنے والا اچھا ہوتا ہے جو قوی اور امانت دار ہو"۔ باپ نے بیٹی سے پوچھا "تم نے یہ کیسے جان لیا کہ ان میں یہ دونوں وصف ہیں"۔ بچی نے جواب دیا کہ "دس آدمی مل کر جس پتھر کو کنویں سے ہٹا سکتے تھے انہوں نے تنہا اس کو ہٹا دیا ان سے ان کی قوت کا اندازہ با آسانی ہوسکتا ہے۔ امانت داری کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ جب میں انہیں لے کر آپ کے پاس آنے لگی تو اس لیے کہ راستے سے ناواقف تھے میں آگے ہولی انہوں نے کہاتم میرے پیچھے رہو اور جہاں راستہ بدلنا ہو اس طرف کنکر پھینک دینا میں سمجھ لونگا کہ مجھے اس راستے چلنا چاہیئے"[1]

روایت میں آتا ہے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"تین شخص کی سی زیرکی، معاملہ فہی، دانائی اور دوربینی کسی اور میں نہیں پائی گئی، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دانائی کہ جب انہوں نے اپنے بعد خلافت کے لیے جناب عمر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا۔ یوسف علیہ السلام کے خریدنے والے مصری جنہوں نے بیک نظر یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور جا کر اپنی بیوی سے فرمایا کہ انہیں اچھی طرح رکھو۔ اور اس بزرگ کی صاحبزادی جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی نسبت اپنے باپ سے سفارش کی کہ انہیں اپنے کام پر رکھ لیجئے"[2]

مقررہ اور معقول معاوضے پر کام کرنا: اس دفعے میں یہ بھی ہے کہ ایک معقول معاوضے کے بدلے ہر کسی کو کام کاج کرنے کاحق ہے۔اسلامی تعلیمات میں اس حوالے سے بہت سارے واقعات ہیں جن میں سے ایک واقعہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا بھی ہے۔سیدنا موسیٰ علیہ السلام مصر میں رہتے تھے وہاں پر بے خبری میں ایک آدمی کے قتل کا سبب بنے۔وقت کے بادشاہ کے خوف سے ملک سے چپکے سے نکل گئے اور مدین پہنچ گئے۔وہاں پرایک مقام پر دو عورتوں کی خدمت کی ۔انہوں نے جا کر اپنے والد کو بتایا اُن کے والد نے موسیٰ علیہ السلام کو بلایا اورفرمایا:

"اُنہوں نے (موسیٰ سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کو تم سے بیاہ دوں اس عہد پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو "[3] یہاں پر کام کرنے والے اور جس کے لیے کام کیا جاتا ہوکے، درمیان ایک معلوم اور معقول معاوضے کے بدلے کام (خدمت)کرنے کا بیان ہے۔

کام کاج میں کمی بیشی(مالک اور نوکر کے درمیان معاہدہ): اس سلسلے میں جس کے لیے کام کیا جاتا ہو اور جس سے کام لیا جاتا ہے،اُن کی مرضی کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔یعنی کام کاج کے اس معاملے میں "معقولیت"ہونی چا ہئیے کہ اگر مالک یا

---

[1] طبری،ج19،ص563،562،561

[2] عبداللہ بن محمد،ابن ابی شیبہ،مصنف ابن ابی شیبہ،کتاب المغازی،باب ما جاء فی خلافۃ عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ،ج14،ص574،رقم:38213

[3] القصص28:27

نوکر چاہے تو اپنے درمیان طے شدہ معاہدے کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں جیسا کہ اسی واقعے میں آگے یہ بھی ہے کہ:

" اور اگر دس سال پورے کر دو تو تمہاری طرف سے (احسان) ہے اور میں تم پر تکلیف ڈالنی نہیں چاہتا۔ مجھے انشاء اللہ نیک لوگوں میں پاؤ گے"[1]

یہاں مالک نے خدمت کے لیے جس شخص کی خدمات حاصل کرنی کی بات کی ہے وہ یہ ہے کہ میری خدمت کے لیے تو آٹھ سال کافی ہیں لیکن تم دس سال اپنی مرضی سے پورے کرتے ہو تو یہ تمہاری طرف سے مجھ پر ایک احسان ہوگا۔ اس کے جواب میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"موسٰی نے کہا کہ مجھ میں اور آپ میں یہ (عہد پختہ ہوا) میں جونسی مدت (چاہوں) پوری کردوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو"[2]

فائدہ: سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کتنے سا ل اُن بزرگ کے پاس گزارے؟ اس بارے میں بخاری کی روایت ہے کہ:

" سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یہودیوں نے سوال کیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال پورے کئے تھے یا دس سال؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے خبر نہیں پھر میں عرب کے بہت بڑے عالم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے یہی سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان دونوں میں جو زیادہ اور پاک مدت تھی وہی آپ علیہ السلام نے پوری کی یعنی دس سال۔ اللہ تعالیٰ کے نبی جو کہتے ہیں پورا کرتے ہیں "[3]

معقول معاوضہ: اس دفعے میں ایک شق "معقول معاوضے" کی ہے ہر ملک اور عرف کے مطابق معاوضہ طے ہوتا ہے جس میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ اصحاب امام احمد رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کر کے کہا ہے کہ"کھانے پینے اور کپڑے پر کسی کو مزدوری اور کام کاج پر لگا لینا درست ہے"[4]

اس کی دلیل میں ابن ماجہ رحمہ اللہ[5] کی ایک حدیث بھی ہے ایک صحابی فرماتے ہیں کہ:

"نبی علیہ السلام نے سورۃ طس کی تلاوت کی جب موسیٰ علیہ السلام کے ذکر تک پہنچے تو فرمانے لگے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیٹ کے بھرنے اور اپنی شرمگاہ کو بچانے کے لیے آٹھ سال یادس سال کے لیے اپنے آپ کو ملازم کر لیا "۔ اس

---

[1]القصص27:28

[2]القصص28:28

[3]بخاری،کتاب الشہادات،باب من امر بانجاز الوعد،رقم:2684

[4] ابن کثیر،ج6،ص230

[5]آپ ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی ہیں۔ ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ آپ کے مشہور تصانیف تفسیر قرآن، سنن اور تاریخ قزوین ہیں۔ حصول علم کے سلسلے میں بصرہ، بغداد،شام،مصر اور حجاز کے لمبے سفر کئے۔64سال کی عمر میں 237ھ/887ء میں وفات پائی۔الذہبی،سیر اعلام النبلاء،ج25،ص276،رقم 133۔ ابن حجر،تہذیب التہذیب،ج9،ص530 تا 532۔ الذہبی،تذکرۃ الحفاظ، ج2،ص636۔

حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اتنی مزدوری پر بھی
کسی کو مزدور مقرر کیا جا سکتا ہے جس پر وہ پیٹ بھر کر
کھانا کھا لیتا ہے"[1]

معاوضے کی بروقت ادائیگی: مزدور جس کے ساتھ بھی کام کرتا ہے اُس پر لازم ہے کہ اُس کے معاوضے کی بروقت ادائیگی یقینی بنائےکیونکہ پورے دن کی مزدوری انسانی جسم کو متاثر کرتی ہے لیکن جب اُس کو اپنی مزدوری بروقت مل جائے تو اُس کی ساری تھکاوٹ دور ہوجاتی ہےحدیث میں آتا ہے:

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی علیہ
السلامنے فرمایا" :مزدور کو اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے
اس کی مزدوری دے دو"[2]،[3]

معاوضہ ادا نہ کئے جانے کی صورت میں مزدور کے دوبارہ آنے تک "معاوضہ"سنبھال کے رکھنا: اگرکوئی انسان کسی کے ساتھ کام کرتا ہے اور اُس نے ابھی اپنا معاوضہ لیا نہیں تھا کہ کہیں چلاگیا تو اُس کے آنے تک اُس کے "معاوضے"کو محفوظ رکھا جائے گا اور جب بھی وہ ملے ،اُسے دینا اُس کے حقوق میں شمار ہوگا بلکہ اگر اُس "معاوضے" کو کسی سرمایہ کاری میں لگالیا اور وہ بڑھتا گیا تو یہ اور بھی ثواب کاکام ہوگااور اُس کے تعاون کی ایک بہترین صورت ہوگی۔اس حوالے سے بخاری میں تین ساتھیوں کا ایک طویل واقعہ نقل کیا گیا ہے جس میں ایک اپنے والدین کے لیے پوری رات کھڑے کھڑے گزار دی تھی۔دوسرے نے باوجود قدرت کے بدکاری چھوڑ دی تھی اور تیسرے نے ایک مزدور کی تنخواہ پر کاروبار شروع کی جو بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ ہو گیا تھا اور پھر مزدور کے واپسی پر سب کچھ اسے حوالے کیا تھا۔

اس حدیث میں محل استشہاد:
ہے، کہ یہ تیرا وہ معاوضہ ہے جو تجھ سے رہ گیا تھا میں نے اس میں سرمایہ کاری کی ہے جس کے وجہ سے یہ اتنی زیادہ ہوگئی ہے۔اسلام بھی یہی ترغیب دیتا ہے کیونکہ اُس بندے نے جو یہ کام کیا تھااللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اور باعثِ اجرتھا تبھی تو اُ ن پر غارکا دروازہ کھل گیا۔

اس دفعے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ایک ایسے مشاہرے پر کام کرنا ہر انسان کے حقوق میں شمار ہوتا ہے جو اُس کے اور اُس کے اہل وعیال کےلیے کافی ہو اس کے علاوہ اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذرائع سے اضافہ کیا جا سکے۔

سیرت طیبہ میں مزدورں کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کرنے کی ترغیب موجود ہے۔ چاہے مالی ہو،جانی ہو یااخلاقی ہو۔اس سلسلے میں اُن کو زکوٰۃ،نفلی صدقات اور ہدایا وغیرہ دینے کی اوراُن کے دکھ درد میں برابر کی شرکت کے بارے میں ترغیب موجود ہے۔

معاوضہ مقرر کرکے نہ دینا بہت بڑا گناہ ہے: اسی طرح ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ معاوضے کے بارے جو بات کی گئی ہو ،اُس سے کام لینے کے بعد وہ معاوضہ دیا جائے اور اگر نہ دیا تو یہ نہ دینا انتہائی ظلم ہے۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا اللہ
تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین طرح کے لوگ ایسے ہوں گے جن کا

---

[1] ابن ماجہ،کتاب الرھون،باب اجارہ الاجیر علی طعام بطنہ،ج3،ص511،رقم:2444

[2] ابن ماجہ،کتاب الرھون،باب اجر الاجراء،ج3،ص510،رقم:2443

[3] یہ حدیث صحیح ہے۔صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ،ج5،ص543

قیامت کے دن میں مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے
میرے نام پر عہد کیا اور وہ توڑ دیا، وہ شخص جس نے کسی
آزاد انسان کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور وہ شخص جس
نے کوئی مزدور اجرت پر رکھا، اس سے پوری طرح کام لیا،
لیکن اس کی مزدوری نہیں دی"[1]

دفعہ:۲۴

ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حدبندی کی حدبندی اور تنخواہ کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ایک حد تک تو کام کر سکتا ہے لیکن ایک حد کے بعد تھکاوٹ کاشکار ہوکر اس کے امورِزندگی متاثر ہوتے ہیں۔اس وجہ سے انسان کا یہ حق ہے کہ آرام حاصل کرنے کی غرض سے کچھ اوقات کے لیے "تعطیلات"منائے۔اور جہاں تک کام کے گھنٹوں کی حد بندی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے جتنا اور جہاں تک وہ کام کرسکتا ہے ، کرے اور جب طاقت ختم یا کمزور ہوجائے تب اُسے آرام کا موقع دیا جائے ۔خود اللہ تعالیٰ جب انسانوں کو "اسلامی احکامات"دیتے ہیں تو اس میں بھی حد بندی ہوتی ہے کہ جہاں تک انسانی طاقت ہے

[1] بخاری،کتاب البیوع،باب اثم من باع حرا،رقم"2227

اسی کے مطابق احکام دیتے ہیں جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:" لا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا[1]"اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

اس کی تفسیر میں امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" التكليف هو الامر بما يشق عليه-وهذا خبر جزم. نص الله تعالى على أنه لا يكلف العباد من وقت نزول الآية عبادة من أعمال القلب أو الجوارح إلا وهي في وسع المكلف"[2]

" تکلیف سے مراد وہ"کام"ہے جس کاکرنا مشقت والا ہو۔اوریہ اللہ جل شانہ کے طرف سے واضح خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ بدنی اور قلبی اعمال میں سے کوئی بھی "حکم" ایسا نہیں دیتے جس پرانسان پر عمل کرنا کے لیےناممکن ہو"۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس دفعے کے حوالے سے سیرتِ طیبہ اور "عالمی منشور برائے انسانی حقوق" میں کوئی تقابل نہیں ۔

دفعہ:۲۵

(۱)ہرشخص کواپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے۔جس میں خوراک ،پوشاک،مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری،بیماری ،معذوری،بیوگی،بڑھاپا یا ان حالات میں روزگا سے محرومی ،جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں،کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

(۲)زچّہ اور بچّہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔تمام بچے خواہ وہ شادی سے پہلے پیدا ہوئے ہو یا شادی کے بعد،معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

عالمی منشور کے اس دفعے کا سیرت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے تقابلی جائزہ:

اس دفعے میں انسان کے "معاشی تحفظ" کے ساتھ ساتھ اُس کے "معیار زندگی" کے بارے میں ہدایات موجود ہیں۔جہاں تک سیرت طیبہ کی روشنی میں "معیارزندگی"اور "معاشی تحفظ" کی بات ہے،اس میں "طبقاتی تفریق" نہیں ہے بلکہ انتظامی امور کے حوالے سے مختلف حالات میں انسان مختلف قسم کے فوائدسے مستفید ہو سکتا ہے۔اسلام میں اس حوالے سے حکمران اور رعایا کاکوئی فرق نہیں ہے کیونکہ جب ہم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو دیکھتے

---

[1] البقرہ286:2

[2] قرطبی،ج3،ص429،430

ہیں تو جب آپ رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو مشورے سے یہ طے پایا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے گھر کے خرچے کی ذمہ داری سرکاری بیت المال سے ہوگی کیونکہ بارِ خلافت کی وجہ سے آپ کو اپنے روزگار کے مواقع نہیں ملیں گے۔لیکن اس میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ یہ "خرچہ"مدینے منورے کے ایک عام شہری کے معیار کے مطابق ہوگا۔شوریٰ کے فیصلے میں ایک جملہ کہا گیا تھا جو اسلام میں ہر انسان کے مساوات کو علمبردار ہے" **لا وکس فیھا ولا شطط** "کہ نہ اس میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی بیشی ۔اس میں واضح طور پر دنیا کو ایک پیغام دیا گیا کہ ایک مسلمان حکومت میں عام شہری اور حکمران کے معیار زندگی میں کوئی فرق نہیں رکھا جائے گا۔معیار زندگی میں مساوات کے حوالے سے امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرامین اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے کیونکہ انہوں نےسرکاری عمال کے بارے میں ہدایات جاری فرمائی تھیں کہ:عام سواری کے بجائے عمدہ گھوڑے پر سواری نہیں کرے گا،گھر کے سامنے کوئی مخصوص جگہ نہیں بنائے گا(جس کو ہم ڈیوڑھی سے تعبیر کر سکتے ہیں) ۔باریک کپڑے نہیں پہنیں گے،ایسی روٹی نہیں کھائیں گے جو کہ چھنے ہوئے آٹے کی ہو وغیرہ ۔

چونکہ اُس دور میں اس قسم کی اشیاءایک امتیاز کی علامت ہواکرتی تھیں اس وجہ سے اِن امور سے اُنہیں منع کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اسلام میں حکمران اور رعایا کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے "معیار" میں کسی قسم کا فرق نہیں رکھا جائے گا۔

ایک فلاحی مملکت میں شہریوں کے لیے ریاست کی طرف سے روزینے کا انتظام ہواکرتا ہے ۔اس میں بھی برابری کا خیال رکھا گیا ہے چنانچہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔"معیار زندگی" کے حوالے سے اسلام نے معاشرے میں "طبقاتی نظام" کی گنجائش نہیں چھوڑی ۔ بلکہ "معاشرتی یکسانیت "کی بنیاد پرہی معاشرہ مستقل بنیادوں پر قائم رہ سکتا ہے۔اس حوالے سے چند باتیں "معیار زندگی"پر اثر انداز ہوسکتی ہیں ۔اس لیےان کی وضاحت ضروری ہے۔

<u>رزق کی فراخی/تنگی:</u>انسانی زندگی میں انسان پر مختلف حالات آتے ہیں جن میں کبھی تو رزق کی تنگی آتی ہے،اور کبھی فراوانی۔رزق کی تنگی اور فراوانی معمول کی باتیں ہیں۔لہٰذا رزق کی تنگی کو ذلّت اور فراوانی کو فضیلت کا معیار نہیں سمجھنا چاہئیے۔بلکہ دونوں حالتوں کواللہ تعالیٰ کی تقسیم سمجھ کرصبر وشکر کا دامن تھامناچاہئیے جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

> "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہو میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"[1]

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی [2]مرحوم لکھتے ہیں"دنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام جس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جسے اللہ کشادہ رزق دے رہا ہے، وہ اس کا محبوب ہے اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے، وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔حالانکہ اگر کوئی شخص ذرا آنکھیں کھول کر

---

[1] سبا36:34

[2] سید ابوالاعلیٰ مودودی25 ستمبر1903ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ خواجہ مودود چشتی کے نام سے منسوب ہوکر ہی مودودی کہلاتا ہے۔آپ کا گھرانہ ایک مکمل مذہبی گھرانہ تھا۔مصنف کتب کثیرہ ہے۔ فن تفسیر میں "تفہیم القرآن" کے نام سے ایک شاہکارتفسیر لکھی۔دیگر تصانیف میں رسائل ومسائل،خلافت وملوکیت، الجہاد فی الاسلام،پردہ،معاشیات اسلام وغیر ہ ہیں۔1979ءکو پہلا شافیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔اُن کے مخصوص نقطہ نظر کی وجہ سے اہل علم کے درمیان اُن کی حیثت متنازعہ رہی۔22ستمبر1979ء کو امریکہ میں وفات پائے۔
(https://ur.wikipedia.org/wiki/ابو_الاعلیٰ_مودودی،مورخہ3نومبر2017)

دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ نہایت خوشحال ہوتے ہیں اور بہت سے نیک اور شریف انسان جن کے کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے تنگ دستی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اخلاق کے لوگ ناپسند ہیں اور وہ شریر خبیث لوگ ہی اسے بھلے لگتے ہیں[1]"

اورحدیث میں بھی آتا ہے کہ :

> " ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر چیز تقدیر کے ساتھ ہے حتیٰ کہ بے چارگی و درماندگی اور دانائی و ہوشیاری"[2]

فطری اوصاف وکمالات کااختلاف:ہر انسان کے اوصاف دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں یہ اُس کا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی اللہ جل شانہ کی طرف سے انسانوں میں ودیعت کردہ ایک فطری اختلاف ہے جوتمام انسانوں کی تخلیق میں رکھا گیا ہے۔جس کی بناء پر انسانوں کی ذہنی صلاحیتوں اور کمالات و اوصاف میں فرق و امتیاز ہے۔ مثلا ان کی جسمانی توانائیوں اور طاقتوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ ان کے افکار و خیالات اور نصب العین بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں رزق حاصل کرنے کے طورطریقے بھی مختلف ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ اسی فطری اختلاف کی بدولت رزق میں کمی بیشی آتی ہے اور انصاف بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ رزق کے معاملہ میں انسان کی کوششوں اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھا جائےجیسا کہ ارشاد ہے:" اور انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔[3]

رزق کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے:انسانوں کے درمیان اللہ جل شانہ کی طرف سے رزق کی تقسیم میں بہت ساری مصالح میں سے ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اسی تقسیم کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کی خدمت سرانجام دیں گے جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

> "کیا یہ لوگ تمہارے رب کی رحمت کو بانٹتے ہیں ؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے رب کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے"[4]

مولانا مودودی مرحوم اس آیت کریمہ کی تفسیر میں کفار کی طرف سے ذکر کردہ اعتراض کے جواب میں کہتا ہے کہ:

> "کب سے اللہ کی رحمت کی تقسیم ان لوگوں کو سپرد کیا گیاہے؟یہ لوگوں کاکام نہیں کہ وہ اللہ تعالی کو اس بارے میں مشورے دے کہ فلاں کواتنا دو اور فلاں کو اتنا!دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہاتھ میں

---

[1]تفہیم القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ، جلد چہارم ص207، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور

[2]مسلم،کتاب القدر،باب کل شئ بقدر،رقم:6922

[3]النجم 36:53

[4]الزخرف32:43

رکھی ہے کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت ، کس کو خوش آواز اور کسی کو بد آواز، کسی کو قوی ہیکل اور کس کو کمزور، کسی کو ذہین اور کسی کو کند ذہن، کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا، کسی کو سلیم الاعضاء اور کسی کو اپاہج یا اندھا گونگا اور بہرا، کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ سوجس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی تقدیر پر پڑتا ہے اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے، اسے کوئی گرا نہیں سکتا اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آجاتا ہے، اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر اللہئی انتظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرتے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔تیسری بات یہ ہے کہ اس اللہئی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسرے سے بے نیاز نہ ہو بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے زیاست اور وجاہت دی ہے، اسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اس طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت ، حسن، طاقت، اقتدار اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دئیے جائیں اور جس کو ایک چیز نہیں ملی اسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دئ جائے"[1]

زہد اختیار کرنا:اس حوالے سے "معیار زندگی" میں اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئیے کہ زینت،خواہشات اور دنیاکی محبت کو چھوڑا جائے۔حدیث سے اس بات کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے ،ارشاد ہے:

---

[1]تفہیم القرآن ، جلد چہارم ص536-537

"سیدنا ابوذرغفاری [1] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا دنیا کے بارے میں زہد اور اس کی طرف سے بے رغبتی ، حلال کو اپنے اوپر حرام کرنے اور اپنے مال کو برباد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ "زہد" کا اصل معیار اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس اور تمہارے ہاتھ میں ہو اس سے زیادہ اعتماد اور بھروسہ تم کو اس پر ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس اور اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے، اور یہ کہ جب تم کو کوئی تکلیف اور نا خوشگواری پیش آئے تو اس کے اخروی ثواب کی رغبت تمہارے دل میں زیادہ ہو بہ نسبت اس خواہش کے کہ وہ تکلیف اور ناگواری کی بات تم کو پیش ہی نہ آتی"[2]

اس دفعے میں یہ بھی ہے کہ انسان کو بے روزگاری،بیماری ،معذوری،بیوگی،بڑھاپا یا ان حالات میں روزگا سے محرومی ،جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں،کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔اس حوالے سے مولانا زاہدالراشدی لکھتے ہیں:"بیت المال" جناب نبی اکرم کے دور میں ہی موجود تھا اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے معذور اور ضرورت مند افراد کی مدد کی جاتی تھی، جناب نبی اکرم بیت المال کی رقوم سے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور تاوان میں پھنس جانے والے حضرات کی مدد بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک روایت میں مقتول کی دیت بھی بیت المال سے ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ:

" جو شخص مال چھوڑ کر مرا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف رجوع کرے گا اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی"[3]

میری طالب علمانہ رائے میں "بیت المال" کے ذریعہ سوسائٹی کے معذور، نادار، بے روزگار، ضرورت مند اور بوجھ تلے دبے لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی کفالت کرنے کی بنیاد نبی علیہ السلامکے اسی ارشاد گرامی پر ہے۔سیدناابوبکررضی اللہ عنہ اور سیدناعمررضی اللہ عنہ نے اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے بیت المال کے نظام کو اس قدر منظم کیا کہ خلافت راشدہ کا دور آج بھی" ویلفیئر سٹیٹ" اور رفاہی ریاست کے لیے آئیڈیل تصور کیا جاتا ہے اور بہت سے مغربی ممالک اس کے بعض حصوں کی پیروی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ ناروے میں اس سلسلہ کے بعض قوانین اور وظیفے سیدناعمررضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ رائج کیے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست ہی صحیح معنوں میں ایک فلاحی ریاست ہے جو مملکت کے تمام باشندوں کی ضروریات زندگی فراہم کرنے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اس سلسلہ میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا یہ تاریخی جملہ ایک راہ نما اصول کا درجہ رکھتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو "عُمر"سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

---

[1] ابوذر غفاری جندب بن جنادۃؓ ہیں۔صحابی نبی علیہ السلام ہیں۔نبی علیہ السلام اور معاویہ بن ابو سفیانؓ سے روایت لی ہے۔تلامذۃ میں انس بن مالکؓ،اسامہ بن سلمانؒ اور احنف بن قیسؒ شامل ہیں۔ 32ھ/652ء میں وفات پائی۔اسد الغابہ،ج8،ص369۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ج1،ص75۔ابن حجر،الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ج7،ص125

[2] ترمذی،کتاب الزھد،باب الزھادۃ فی الدنیا،رقم:2340

[3] بخاری،کتاب الفرائض،باب میراث الاسیر،رقم:6763

ایک اسلامی رفاہی ریاست میں "بیت المال" کا کردار کیا ہے؟ اس کے حوالے سے امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزرحمہ اللہ کے دور کا ایک واقعہ ہے کہ:

"عمربن عبدالعزیز [(1)]رحمہ اللہ نےعراق[2] کے گورنرکو خط لکھاجس کے جواب میں اُس نے امیر المومنین کو خط لکھا کہ اس سال صوبہ میں بیت المال کو جو آمدنی ہوئی ہے اس سے سال بھر کے اخراجات پورے کرنے کے بعد کچھ رقم بچ گئی ہے اس کے بارے میں فرمائیں کہ کیا کیا جائے؟ امیر المومنین نے جواب دیا کہ صوبہ میں اعلان کر کے جو حضرات مقروض ہیں اور اپنے قرضے ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے قرضے بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنر کا جواب آیا کہ یہ کام کر چکا ہوں اس کے باوجود زائد رقم موجود ہے۔ امیر المومنین کا دوسرا خط آیا کہ سروے کر کے معلوم کرو کہ جو لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل ہیں اور اخراجات میسر نہ ہونے کی وجہ سے شادیاں نہیں کر سکتے ان کی شادیاں بیت المال کی طرف سے کرادو۔ گورنر صاحب نے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، رقم پھر بھی بچ گئی ہے، امیر المومنین نے لکھا کہ وہ شادی شدہ حضرات جو بیوی کا مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ان کے مہر بیت المال سے ادا کر دو۔ گورنرنے لکھا کہ یہ بھی کر چکا ہوں، امیر المومنین رحمہ اللہ نے پھر لکھا کہ بے

[1]ابو حفص عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکمؒ القرشی ہیں۔ تبع تابعی ہیں۔متقی ،فقیہ ،محدث اور امیر المومنین تھے۔مثالی عدل و انصاف قائم کرکے عمر ثانی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ 101ھ/720ء کو میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔الذہبی ،سیر اعلام النبلاء،ج5،ص114۔الزرکلی،الاعلام ، ج5،ص50

[2]عراق: **عراق** ایشیا کا ایک اہم عرب اور مسلمان ملک ہے۔ یہ قدیم میسوپوٹیمیا) مابین النھرین (، قدیم شام کے کچھ صحرائی علاقوں اور مزید کچھ علاقوں پر مشتمل ہے۔ تیل کے ذخائر میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب ، مغرب میں اردن ، شمال مغرب میں شام ، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے۔ اسے ایک محدود سمندری رسائی بھی حاصل ہے جو خلیج فارس کے ساحل ام قصر پر ہے۔ جو بصرہ سے قریب ہے۔ عراق دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شامل ہے جس نے کئی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ فلسطین کی طرح اسے انبیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ، حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق اسی علاقے سے تھا اور بروایتے حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس کے شہر قرنہ کو اپنا وطن بنایا تھا۔2003 ء میں اس پر امریکا نے قبضہ کرلیا تھا جو تا حال جاری ہے البتہ ایک برائے نام حکومت قائم ہے۔ اس کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے البتہ کافی تعداد میں عیسائی بھی ہیں۔ اس کا دارالحکومت بغداد ہے جو اس کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے علاوہ نجف ، کوفہ ، بصرہ ، کربلا، سامرا ، موصل اور کرکوک اس کے مشہور شہر ہیں۔ دریائے دجلہ اور فرات اس کے مشہور دریا ہیں۔ ان کے درمیان کی وادی انتہائی زرخیز ہے اور اس میں سات سے نوہزار سال سے بھی پرانے آثار ملتےہیں۔ سمیری ، اکادی ، اسیریا اور بابل کی تہذیبیں اسی علاقے میں پروان چڑھیں اور فنا ہوئیں۔(https://ur.wikipedia.org/wiki/)

آباد زمینوں کا سروے کرا کے انہیں آباد کرنے کے
لیے زمین داروں کو آسان قسطوں پر قرضے دے دو"[1]

یہ بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے لیکن تاریخی حقیقت ہے اور ایک اسلامی ریاست میں ‘‘بیت المال’’ کے کردار کی وضاحت کرتی ہے، ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اسلام کے یہ سنہری اصول اور خلافت راشدہ اور خلافت اسلامیہ کی یہ زرّیں روایات رفاہی ریاست کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں کی توجہ تو حاصل کر رہی ہیں لیکن مسلم ممالک کے حکمرانوں کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔[2]

*: دفعے کی دوسری شق میں زچے اور بچے کے حقوق کے حوالے سے بات کی گئی ہے جیسا کہ اس کے الفاظ سے ظا ہر ہے کہ:"زچّہ اور بچّہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔تمام بچے خواہ وہ شادی سے پہلے پیدا ہوئے ہو یا شادی کے بعد،معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے"۔

اس شق میں چند امور غور طلب ہے۔

1۔زچہ اوربچہ کی مدد

2۔شادی کے ذریعے پیدا شدہ زچہ اور بچہ

3۔شادی (نکاح)کے بغیر پیدا شدہ زچہ اوربچہ

پہلے اور دوسرے نمبر پر جو امورمذکورہیں ان کی مددکےبارے میں سیرت طیبہ میں واضح ہدایات موجود ہیں،اسی طرح تیسرے نمبر پر "بچے" کے حوالے سے بھی مدد کرنے کے احکامات موجود ہیں جیسا کہ درجہ ذیل احکامات میں ہیں قرآن کرم میں ارشاد ہے:

"اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہوگا۔ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد رکھو کہ) نہ تو ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے"[3]

اس کے تفسیر میں ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" بچوں کی ماں کا نان نفقہ بچوں کے والد پر ہے۔ اپنے اپنے شہروں کی عادت اور دستور کے مطابق ادا کریں، نہ تو زیادہ ہو نہ کم بلکہ حسب طاقت و وسعت درمیانی خرچ دے دیا کرو جیسے فرمایا:یعنی کشادگی والے اپنی کشادگی کے مطابق اور تنگی والے اپنی طاقت کے مطابق دیں، اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، عنقریب اللہ تعالیٰ سختی کے بعد آسانی کر دے گا۔امام ضحاک رحمہ اللہ [4]فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اس کے ساتھ بچہ بھی ہے تو

---

[1] قاسم بن سلام،ابو عبید،کتاب الاموال،باب فصل مابین الغنیمۃ والفیئ ومن ایھماتکون اعطیۃ المقاتلہ وارزاق الذریۃ،ص320،دار الفکر،بیروت

[2] اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی نقطہ نظر،ص22،21

[3] البقرہ233:2

[4]۔ آپ ابو القاسم ضحاک بن مزاحم الہلالیؒ ہیں۔ مفسر قرآن ہیں۔ محدثین کی ایک جماعت نے ثقہ جبکہ ابن حجر نے صدوق اور شعبہ نے ضعیف کہا ہے۔ شیوخ میں انس بن مالکؓ،زید بن ارقمؓ اور عبداللہ بن عباسؓ جبکہ تلامذہ میں علی بن الحکمؒ،عمارہ بن ابو حفصہؒ اور عمر بن میمونؒ شامل ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں کہ آپ کی عبداللہ بن عباس سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔105ھ/723ء میں وفات پائی۔الذہبی،سیر اعلام النبلاء،ج8،ص173۔ الزرکلی،الاعلام،ج3،ص215۔

اس کے دودھ پلانے کے زمانہ تک کا خرچ اس مرد پر واجب ہے۔ پھر ارشاد باری ہے کہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر کے اس کے والد کو تنگی میں نہ ڈال دے بلکہ بچے کو دودھ پلاتی رہے اس لیے کہ یہی اس کے گزربسر کا سبب ہے۔ دودھ سے جب بچہ بے نیاز ہو جائے تو بیشک بچہ،باپ کو دیدے لیکن پھر بھی نقصان رسانی کا ارادہ نہ ہو۔ اسی طرح خاوند اس سے جبراً بچے کو الگ نہ کرے جس سے بے چاری پریشان ہوجائی گی"[1]

اسی طرح اللہ تعالی نے فرمایا:

"اگر عورتیں بچے کو دودھ پلایا کریں تو تم ان کی اجرت بھی دیا کرو اور آپس میں عمدگی کے ساتھ معاملہ رکھو۔ یہ اور بات ہے کہ تنگی کے وقت کسی اور سے دودھ پلوا دو"[2]

چنانچہ یہاں بھی فرمایا اگر والدین باہم رضامندی سے کسی اور سے دودھ پلواناچاہیں تو اس کی اجازت ہے۔اور دونوں پر کوئی گناہ بھی نہیں، اب کسی دوسری دایہ کو اُجرت دے کر دودھ پلوا دیں۔(اس حکم کی اہمیت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے جس کے فورا بعد اللہ تعالی نے فرمایا) لوگو ں !اللہ تعالیٰ سے ہر امر میں ڈرتے رہا کرو اور یاد رکھو کہ تمہارے اقوال و افعال کو وہ بخوبی جانتا ہے۔

امام بخاری نے تو اس حوالے سے ایک "باب" بھی قائم کیا ہے جس میں بہت ساری قرآنی آیات بھی لائے ہیں[3]

بچہ کے حوالے سے تو اسلام یہاں تک کہتا ہےکہ طلاق کے بعد بھی اگر عورت حاملہ ہو تواُس کا نفقہ سابقہ شوہر پر ہے جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی وہ نفقہ مانگتی رہی لیکن نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"تجھے اِس صورت میں نفقہ مل سکتی ہے اگر تو (سابقہ شوہر)سے حاملہ ہو"[4]،[5]

یہاں تک تو بات بالکل واضح ہے لیکن اس دفعے کی اس شق (شادی سے پہلے زچہ کی مدد)سے اسلامی تعلیمات یکسر مختلف ہیں کیونکہ یہاں غیر محسوس طریقے سے "زنا" کے لیے ایک چور دروازہ کھل رہا ہےکیونکہ دفعے میں شادی کے نتیجے میں یا شادی کے بغیر،زنا سے پیدا ہونے والے بچے اور اُس کی والدہ دونوں صورتوں میں یکساں مدد کے مستحق قرار دئے گئے ہیں۔بچے کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں ہے۔چاہے وہ جس طریقےسے بھی پیدا ہوا ہو کیونکہ اُس کاتو کوئی قصور نہیں ہے۔لیکن "زچہ" کے بارے میں واضح ہدایات ہیں کہ شادی کے بغیر"زنا"کےمرتکب کو سزا دی جائیگی۔چاہے یہ مرتکب "عورت"ہو یا "مرد"۔جیسا کہ ایک غامدیہ صحابیہ کا واقعہ احادیث کی کتب میں باربار آیا ہے۔[6]،[7]

---

[1] ابن کثیر،ج1،ص634

[2] الطلاق6:65

[3] بخاری،کتاب النفقات،باب نمبر3

[4] سنن ابوداؤد،کتاب الطلاق،باب فی نفقۃ المبتوتۃ،رقم:2292

[5] قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج5،ص290

[6] سنن ابو داؤد،کتاب الحدود،باب المراۃ اللتی امر النبی برجمها ،رقم:4444

[7] قال الالبانی:صحیح،صحیح و ضعیف سنن ابی داؤد،ج9،ص442

اس کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم□نے زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو تحفظ فراہم کیا ہے اور اس کے تحفظ کی حد تک اس کی ماں کو بھی سہولت دی ہے لیکن اس ماں کے جرم کو معاف نہیں کیا اور اسے سزا دلوائی ہے، اس لیے زچہ بچہ دونوں کے لیے یکساں معاشرتی تحفظ کی بات اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔

دفعہ: ۲۶

(۱)ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے ۔تعلیم مفت ہو گی۔کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں۔ابتدائی تعلیم جبری ہو گی۔فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کاعام انتظام کیا جائے گا۔اور لیاقت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

. **(۲)** تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہو گا ۔اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کاذریعہ ہو گی،وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت،رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

. **(۳)**والدین کو اس بات کے انتخاب کااوّلین حق ہے کہ اُن کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

سیرت طیبہ میں "تعلیم"و"تعلم" کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے نبی علیہ السلامنے فرمایا کہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے" لا إله إلا الله "سکھاؤ اور موت کے وقت بھی " لا إله إلا الله "کی تلقین کرو جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سےایک مرفوع روایت ہےکہ :موت کے وقت اپنے بھائی کو کلمہ کی تلقین کرتے رہو کیونکہ جس کاآخری کلمہ لاالہ الااللہ ،ہو وہ جنت میں جائے گا:[1]،[2]

"اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہ معمول تھا کہ:جب بچہ بولنے لگتا تو اس کو سات بار یہ کلمہ پڑھاتے تھے۔[3]

دفعے میں جبری تعلیم کے حوالے سے اسلامی تعلیمات بھی ایک حدتک اجازت دیتی ہیں جیسا کہ روایت میں ہے کہ:

> "نبی علیہ السلامنے فرمایا" :جب تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال

---

[1] مسند احمد،ج2،ص170،رقم:6586

[2]یہ حدیث صحیح ہے۔الالبانی،الجامع الصغیر وزیادتہ،ج1،ص929

[3] عبیدابن سلام، غریب الحدیث، ج1 ،ص163،1، مجلس دائرة المعارف العثمانیہ،دکن،ہند،1384ء

کے ہو جائیں تو انہیں اس پر (یعنی نماز نہ پڑھنے پر)مارو ۔

اس حدیث میں ایک حد تک تعلیم سمجھانے کی حد تک دی جانے کی تعلیم ہے اور نہ ماننے پر اُس کے ساتھ حدود میں رہ کر "جبر" کرنے کا حکم ہے۔کیونکہ "مارنے" کے لفظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے ۔نبی علیہ السلام کے زمانے میں توبچوں کے لیے "مستقل علحٰیدہ مکتب"نہیں تھا۔عموماًَ یہ کام گھروں میں سرانجام دیا جاتا تھا۔

سب سے پہلے بچوں کی تعلیم کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے "مکاتب"جاری کیے اور اُن میں اساتذہ بھی بھرتی کئے۔جیسا کہ روایت میں ہےکہ:

"مدینہ منورہ میں تین اساتذہ تھے جو بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہر ایک کو ماہوار پندرہ درہم (وظیفہ)دیا کرتے تھے"[3]

اس حوالے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ترقی کرکے "تعلیم سب کے لیے" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئےذہین اور کند ذہن بچوں کی بھی رعایت فرمائی جیسا کہ اس حوالے سے معلوم ہوتا ہے:"سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے مکتب جاری کرکے عامر بن عبداللہ خزاعی کو استاد مقرر کیا۔اور سرکاری خزانے سے باقاعدہ اُن کے لیے "تنخواہ"مقرر فرمائی۔اور اُن کو یہ حکم دیا کہ ذہین بچوں کو زبانی اور کند ذہن بچوں کو تختی پر لکھ کر تعلیم دیا کریں۔پہلے تو پورے دن تک وہ بیٹھتے رہتے تھے پھر آرام کے لیے وقت دیا گیا"۔[4]

تعلیم کے حوالے سے خلافت راشدہ خاص کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک منظم شکل میں اس "محکمے" کی تشکیل" دی گئی۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو قرآن کاحکم فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم فرماتے تھے کہ سب سے پہلے "طوالِ مفصل" پڑھواؤ کیونکہ وہ آسان ہیں۔عمر فاروق رضی اللہ کے دور میں "تعلیم"و"تعلم"کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب آپ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو فارس[5]، شام[6]،جزیرہ[1]

---

[1] سنن ابو داؤد،کتاب الصلوۃ،باب متی یؤمر الغلام بالصلوۃ،رقم:495

[2]قال الالبانی:حسن صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج1،ص495

[3] علی بن احمد،ابن حزم،المحلی،ج8،ص195،دارالفکر للطباعۃ والنشر التوزیع،س نامعلوم

[4] مجلہ منار الاسلام،ابو ظبی،جمادی الاولی،1400ھ

[5]فارس:پارس یافارس ایک ملک تھا جس کے شمال میں خراسان جنوب میں مشرق میں کرمان،مغرب میں خوزستان اور جنوب میں بحر واقع ہے۔فارس بن اشور بن سام نم نوح علیہ السلام کے نا م سے فارس مشہور ہوا۔آج کل یہ ایران کے جنوب میں ایک ریاست کا نام ہےجو ایرانی نام کی ایک قوم سے منسوب ہے ،فارس ایران کا ساتوں صوبہ ہے۔اپنے وقت میں فارس ایک زبردست طاقت کی حامل مملکت تھی ۔مسلمانوں کے ہاتھوں آنے کے بعد مملکت اسلامیہ کا ایک صوبہ بن گیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک اہم حیثیت کی حامل علاقہ تھا۔ زکریا بن محمد بن محمود القزويني ،آثار البلاد واخبار العباد،ج1،ص93)

[6] شام جسے انگریزی میں سیریا کہا جاتا ہے:یا **لیونت** انگریزی میں (The Levant: مشرق وسطیٰ کے ایک بڑے علاقے کے لیے استعمال ہونے والی ایک غیر واضح تاریخی اصطلاح ہے۔ یہ علاقہ مغرب میں بحیرہ روم، مشرق میں صحرائے عرب کے شمالی حصوں اور بالائی بین النہرین اور شمال میں کوہ ثور کے درمیان واقع ہے۔ لیونت میں کوہ قفقاز،جزیرہ نما عرب یا اناطولیہ کا کوئی حصہ شامل نہیں سمجھا جاتا۔یہ اصطلاح انگریزی میں پہلی بار1947ء میں استعمال ہوئی جس کا مطلب"وینیٹیا" کے مشرق میں بحیرہ روم کی سرزمین" کو واضح کرنا تھا۔ لیونت قرون وسطیٰ کی فرانسیسی زبان کے لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب "ابھرنا" ہے اور اس ضمن میں اس خطے کو ابھرتے سورج کا علاقہ سمجھا جاسکتا ہے اور اسے کے لفظ مشرق کا متبادل سمجھا جا سکتا ہے یعنی وہ علاقہ جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ 19ویں صدی کے سفرناموں میں یہ اصطلاح سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں مشرقی علاقوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔لیونتیائی باشندوں کی اصطلاح خاص طور پر اطالویوں کے لیے استعمال ہوتی ہے خصوصاً وینس اور جنیوا فرانسیسی اور دیگر جنوبی یورپی نسل کے باشندوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جوصلیبی جنگوں،بازنطینی سلطنت،اور عثمانی سلطنت کے ادوار میں ترکی یا بحیرہ روم کے مشرقی ساحلوں پر رہتے تھے۔ ان افراد کے آبا و اجداد دراصل بحیرہ روم کی بحری مملکتوں کے رہنے والے تاجر تھے۔1920ء سے 1946 تک فرانس کے زیر قبضہ سوریہ اور لبنان

اور مصر کے تمام شہر فتح کیے وہاں مساجد بنائی،مصاحف لکھے،ہر جگہ قرآن کی تعلیم وتعلّم شروع فرمایا۔مکاتب میں بچوں کو پڑھایا اور یہ سلسلہ دس سال سے زیادہ چلتا رہا۔ اس حوالے سے آپ رضی اللہ عنہ نے باقاعدگی سے مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے تنخواہ دینے کا ایک منظم سلسلہ جاری فرمایا جیسا کہ اس بارے میں آیا ہے کہ"ثم فرض للناس علی منازلھم وقراءتھم القرآن وجھادھم[3]"(یعنی) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مرتبے کے مطابق اورقرآن پڑھنے اور جہاد کرنے پروظیفہ مقرر فرمایا"۔

مفت اور بامقصد تعلیم اسلام کا روز اول سے مدنظر رہا ہے اور اس کے لیےاصول وضوابط مقرر کرکے عملی طور پر دنیا کو ایک نظام دیا ہے۔جس میں یہ بات ہے کہ تعلیم بالکل مفت دی جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے جملہ اخراجات بھی سرکاری خزانے کے ذمے ہوتے تھے جیسا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے دور خلافت میں یہ فرمان جاری کیا تھا کہ:

""طالب علموں کا وظیفہ جاری کرکے اُن کو علم کے حاصل کرنے کے لیے فارغ کردو"[4]

اس دفعے میں ا س بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ تعلیم کےحوالے سے والدین کا بھی ایک خاص کردار ہوتا ہے۔چنانچہ اسلام نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:"ولابد للناس من معلم یعلم اولادھم ویاخذ علی ذلک اجرا،ولولا ذلک لکان الناس امیین[5]"عوام کی اولاد کو تعلیم دینے کے لیے "معلم" ضروری ہے جو اجرت لے ورنہ لوگ جاہل رہ جائیں گے"۔

اسی طرح اس دفعے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو ونما ہوگی۔اس حوالے سے بھی سیرت طیبہ اور اسلام میں ہدایات موجود ہیں۔اللہ جل شانہ کا ارشا دہے کہ :

"اے رسول جو کچھ تمہارے پاس آئے ہیں اُن کو دوسروں تک پہنچاؤ"[6]

یعنی علم حاصل ہونے کے بعد اسے دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔

بلاد شام (کہلاتے تھے۔آجکل لیونت کی اصطلاح ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دان خطے کی قبل از تاریخ ،قدیم اورقرونِ وسطیٰ کی تاریخ کے حوالے سے استعمال میں رہتی ہے خصوصاً جب وہ صلیبی جنگوں کا ذکر کرتے ہیں۔اس میں موجودہ اسرائیل،اردن،لبنان،فلسطین،جزیرہ نمائے سینا(مصر)اور سوری شامل ہیں)-https:/ur.wikipedia.org//wiki/-

[1] جزیرہ:یہ "بکر،مضر اور ربیعہ کے علاقوں پر مشتمل ہیں۔اس کانام"جزیرہ" اس وجہ سے پڑ گیا کہ یہ علاقہ "درایائے دجلہ اور دریائے فرات"کے درمیان واقع ہے۔اس کے شہروں میں "موصل" اور حران شامل ہیں۔یہ علاقہ موصل سے تھوڑا اوپر ہے جس کے تین اطراف میں "دریائے دجلہ" ایک ہلال کی شکل میں موجود ہے۔جس کو صرف ایک طرف سے خشکی کا راستہ ہے۔(زکریا بن محمد بن محمود القزويني ،آثار البلاد واخبار العباد،ج1،ص143)

[2] مصر: **عرب جمہوریہ مصر** یا **مصر**:جمہوریہ مصر بر اعظم افریقا کے شمال مغرب اور بر اعظم ایشیا کے سنائی جزیرہ نما میں واقع ایک ملک ہے۔ مصر کا رقبہ 1،001،450 مربع کلو میٹر ہے۔ مصر کی سرحدوں کو دیکھا جائے تو مغرب میں لیبیا، جنوب میں سوڈان، مشرق میں بحیرہ احمر، شمال مشرق میں فلسطین شمال میں بحیرہ روم ہیں۔آبادی کے حساب سے مصر دنیا کا پندھرواں اور افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے۔ مصر کے 7 کروڑ 88 لاکھ لوگوں کی اکثریت دریائے نیل کے قریب رہتی ہے۔ اس ہی علاقے میں مصر کی قابل کاشت زمین بھی پائی جاتی ہے/https:/ur.wikipedia.org//wiki.-

[3] احمد بن یحی،البلاذری،فتوح البلدان،ج3،ص551،

[4] یوسف بن عبداللہ،النمری،جامع بیان العلم وفضلہ،ج1،ص334،مؤسسۃ الریان،دار العلم،1424ھ

[5] تربیت الاولاد فی الاسلام،ج1،ص291

[6] المائدہ67:5

اسی طرح سورۃ العلق میں ہے :

" اے محمد(ﷺ)اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو)پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا،پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا"[1]

یہاں ہر تین چیزیں بیان کی گئی ہیں۔1۔کائنات(رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ)2۔انسان خود(خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ) 3۔ علوم(چاہے قدیم ہویاجدید)(عَلَّمَ بِالْقَلَمِ)

"تعلیم"اور "علم" کا جامع اسلامی تصور یہ ہے کہ علم کی درجہ بالا تقسیم مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور انہی سے اسلام ان تینوں کو اللہ سےمنسلک کرنے کی خصوصیت کی بنا پر دنیا کی تمام تہذیبوں اور مذاہب سے الگ اور خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔کہ کسی نے ایک،کسی نے دو اور اگر کسی نت تینوں کو بھی لیا تو پھر بھی انہیں اللہ تعالیٰ سے منسلک نہیں کیا۔یہ خصوصیت صرف اور صرف اسلام ہی کی ہے۔

تعلیم اور بامقصد تعلیم کے بارے میں پروفیسر خورشید[2] کے ایک لیکچر سے یہ اقتباس اُن کے الفاظ کے ساتھ ملاحظہ ہو:

بامقصد تعلیم کی نشانیاں:تعلیم اس نظام کا نام ہے جس کے ذریعے یہ تمام مہارتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک کو منتقل کرتی ہے اور یہ ایک انسانی اوراسلامی ضرورت ہے۔انسانی ضرورت تو اس طرح ہے کہ حیوانات کو اللہ تعالیٰ نےان کی بقا کے لیے خود سکھا دیا ہے،لیکن انسان مہد سے لے کر لحد تک علم سیکھنے میں دوسروں کا محتاج ہے اور یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے ذات،خاندان اور معاشرے کے حیثیت میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل بنائے۔اسلام میں تعلیم کا تصور ایک خاص وقت کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے انسان سازی کا،ضرورت کے مطابق صحیح وقت پر صحیح راہنمائی کا ،انسان کو انسان اور مومن بنانا،تزکیہ،تربیت،عل وفضل،علم وعمل،علم وحکمت غرض یہ کہ زندگی کے ہر پہلو کوگھیر کے رکھتا ہے،البتہ ہر مرحلے میں اس کے مطابق علم کی ضرورت ہے۔

کسی انسان کی شخصیت کی پوری نشوونما اس وقت ممکن ہوجاتی ہے جب اس کی تعلیم میں مقصدیت ہو ، بامقصد تعلیم کی چند نشانیاں ہیں جوذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

1۔حقانیت:اسلام میں علم پر مبنی برحق یقین کا نام ہے،جبکہ مغربی دنیااور یونان علم کے آغازکو شک سے مشروط کرتے ہیں۔بلاشبہ جستجو علم کا ایک اہم حصہ ہے،اوراسلام کا امتیازیہ ہےکہ اس نے بندوں کو یہ علم دیا،لیکن ٹامک ٹوئیاں مارنے کو نہیں بلکہ یقین،نور،اور تیقین کا!چنانچہ حق اور صداقت اس کی پہلی بنیاد ہے۔

2۔جامعیت: انسانوں نے ہمیشہ زندگی کو خانوں میں بانٹا ہے اور پھر ایک ہی خانے کو کل قرار دے کر سارے مسائل کو اسی حساب سے حل کرنے کی کوشش کی ہے نتیجتا ٹھوکر کھائی ہے اور یہی وجہ ہے بغاڑ اور خرابی کی۔زندگی کے تمام روحانی اور مادی پہلو اللہ ہی

---

[1] العلق 96 :4،3،2،1

[2]پروفیسر خورشید 23مارچ 1932 ء کودہلی میں پیدا ہوئے،2002ء میں سینٹ آف پاکستان کے ممبر بنے،ماہرِ تعلیم ومعاشیات تھے ، ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے 1955 ء سے لے کر 1958 ء تک کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا۔آپ نے اردو اور انگریزی میں سترکتابیں تصنیف کی ہیں۔اسی خدمات کے سلسلے میں "شاہ فیصل بین الاقوامی ایوارڈ، پہلا اسلامی ترقیاتی بینک ایوارڈ عطاکیا گیا۔

کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی سے منسلک ہیں،چنانچہ کلیت اور جامعیت اسلام کے علم کا امتیاز ہے۔اور جب ہم نے اس علم کو بانٹ دیا تو ہمارا حال آپ کے سامنے ہے۔

3۔نافعیت: نبی علیہ السلام کی مشہور دعا ہے کہ"اللھم انی اسئلک علما نافعا"اے اللہ میں تجھ سے فائدہ دینے والے علم کا سوال کرتا ہوں۔اس حوالے سے علم نافع اور غیر نافع کو جانچنا پڑے گا۔

4۔حرکت:چنانچہ اصول واقدار کے معاملے میں اصل سے پیوستہ بھی رہناچاہئیے اور اس کے ساتھ ساتھ خیر میں آگے بھی بڑھتے چلے جانا"سابقوا فی الخیرات"،اجتہاد کی طرف رہنمائی حدیث معاذ میں کی گئی ہے۔
اگر بظاہر راہنمائی نہیں ہے تو شریعت کا منشا دیکھو،او ر اسی کے لیے ہمارے بزرگوں نے اجتہاد،قیاس اور استحسان پر کام کیا لیکن یہ بگٹٹ دوڑنا نہیں ہے بلکہ اسی فریم ورک کے اندر آگے بڑھنا ہے۔ معلوم کے ساتھ نامعلوم کو معلوم کے دائرے میں لانا اور حالات کے حساب سے اس سے استفادہ کرنا۔۔تلاوتِ کتاب کے ساتھ تعلیم الکتاب او پھر ہے تعلیم الحکمت،اور تعلیم حکمت نام ہے تعلیم کتاب کو اپنے حالات پر اپلائی کرتے ہوئے آگے چلنے کا۔

5۔عملیت:علم اور عمل میں ناقابل انقطاع رشتہ ہے۔اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے توعلم،عمل کے بغیر ثمرآور نہیں ہے اور عمل،علم کے بغیر گمراہی کی طرف لے جانے والا بن جاتا ہے۔

6۔عملیت:علم کا مقصد یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی فلاح وسعادت حاصل ہو۔جیسا کہ امام غزالی نے احیاء العلوم کی شروع میں فرمایا ہے کہ "اصل السعادۃ فی الدنیا والآخرۃ ھو العلم[1]"۔

جبلت اور تعلیم کے ذریعے،ماضی میں جو کچھ انسان حاصل کر چکا ہے اسے پھر سے حاصل نہیں کرنا بلکہ اس سے آگے بڑھنا ہے۔اسلام اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ"خود سے آگے بڑھنے کی صلاحیت"بھی پیدا کرنی ہے۔عقل ،جستجو ،ایجاد،اختراع اس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی،چینی ضرب المثل ہے کہ اگر آپ ایک شخص کی بھوک مٹانا چاہتے ہو تو اسے مچھلی کھانےکو دو لیکن اگر اسے زندہ رکھنا چاہتے ہو تو اسے مچھلی پکڑنا سکھا دو۔کردار،استعداد اور معلومات مل کر اسلام کے نظام تعلیم کی تشکیل کرتی ہیں۔اور ہمیشہ ان سب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ہاں اسلام ساتھ یہ ضرور بتاتا ہے کہ یہ سب کن اصولوں اور اقدار کی روشنی میں استوار ہوں۔

آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ مسلمان منتشر ہو گئے ہیں،چنانچہ لادینی نظام تعلیم صرف پیٹ پالنے کی حد تک ہے،مذہبی تعلیم اپنے دائرے میں قید اور کردارکسی شمار قطار میں نہیں۔تین متوازی نظام چلانے والا ہمارایہ معاشرہ سرکاری،مذہبی اور بدیسی طرز تعلیم،طریق تعلیم اور مزاج تعلیم کے ذریعے تین یکسر مختلف مخلوقات دھڑادھڑ پیدا کررہا ہے۔ہماری تاریخ میں مختلف شعبہ ہائے علم کس طرح دینی ضرارتوں سے پھوٹے؟چند مثالیں:

1۔تحریر:قرآن کی کتابت اور اس کی پائیدار ترین بنانے کے لیے روشنائی کو انمٹ بنانے کی تگ ودو،کاغذسازی اور اس سے پہلے ہڈی پتھر کا استعمال،کیمسٹری کہ جس سے دوات اور سیاہی کا محلول:صرف ایکضرورت کے لیے اتنی چیزیں۔

2۔نماز کے اوقات:علم الافلاک

3۔سمتِ قبلہ:جغرافیہ

4۔حفاظتِ حدیث:علم الروایہ،اسماء الرجال،جرح وتعدیل وغیرہ اور یہ خالص آج کل کی سائنسی بنیادوں پر ہوا۔

---

[1]الغزالی،محمد بن محمد،ابو حامد،احیاء علوم الدین،ج1،ص27،س ن نامعلوم

ر۔طبِ نبوی □ .کوئی بیماری ایسی نہیں جس کی دوا نہ ہو۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے.

"نبی علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نےبیماری اور دوا (علاج)دونوں اتارا ہے اور ہر بیماری کی ایک دوا پیدا کی ہے لہذاتم دوا کرو لیک حرام سے دوا نہ کرو"[1]

اسی طرح "علم النباتات"بھی ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسپائریشن اسی ایک منبع ومرکز سے ہی آتی ہے،اسی نور سے راستوں کو روشن کرتے ہوئے ان سب سمتونمیں دنیا وآخرت کی فوز وفلاح کو مقصد بنا کر پیش قدمی کی جائے۔یہی اسلامی نظامِ تعلیم کی غرض وغایت ہے اور یہی اس کا منتہائے کمال ہے۔[2]

دفعہ:۲۷

(۱) ہرشخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے،ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(۲)ہرشخص کو حق حاصل ہے کہ اُ س کے اُن اخلاقی اور مادی مفاد کا بچاو کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی،علمی یا ادبی تصنیف سے،جس کا وہ مصنف مہے،حاصل ہوتے ہیں۔

اس دفعے اور سیرت مطہرہ کے درمیان کو ئی تضاد نہیں ہےکیونکہ اسلام بھی ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اور اس کے لیے فرد اور معاشرے دونوں پر شرائط اور قواعدوضوابط لاگو کرتاہےجس کے نتیجے میں وہ "ایجادات"کے مثبت نتائج سے استفادہ

---

[1] سنن ابوداؤد،کتاب الطب،باب فی الادویۃ المکروھۃ،رقم:3876

[2] یہ تحریر پروفیسر خورشید کے ایک لیکچر سے ماخوذ ہے۔

حاصل کرنے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے۔سائنس کے اس دور میں ،جب کہ اشیاء کی تجدیدنو کی گئی ہے،بھی اسلام اپنی تعلیمات وضاحت سے بیان کرتا ہے۔

ثقافتی زندگی کسی معاشرے کی عکاسی کرتی ہے اس وجہ سے ہر کسی کو اپنی ثقافت،رسم ورواج اور اندازِحیات سے منع نہیں کیا جاسکتا۔نبی علیہ السلام کے زمانے میں بھی اور بعد کے ادوار میں بھی مختلف ثقافتوں کے مظاہرے ہوتے رہے۔جس میں کبھی کبھارخود آپ شریک ہوتے تھے، انسان کی علمی،جسمانی،تنشیطی اور کرنٹ افئیر کے حوالے سے "تعلیم" کے بارے میں سیرت مبارکہ میں واضح ارشادات ہیں جیسا کہ روایت میں ہے کہ نبی علیہ السلام خود بھی حبشیوں کے ثقافتی کرتب دیکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے منع نہیں فرماتے تھے

1۔جیسا کی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے:

> "ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی علیہ السلامکو دیکھا کہ آپ مجھے اپنی چادر سے آڑ کئے ہوئے تھے، اور میں حبشیوں کو دیکھ رہی تھی کہ وہ مسجد میں کھیل رہے تھے، یہاں تک کہ میں خود ہی اکتا گئی، تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ ایک کم سن لڑکی کھیل کود (دیکھنے)کی کتنی حریص ہوتی ہے"[1]

2۔خود نبی علیہ السلام جسمانی صحت کے مقابلوں کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے بلکہ کبھی تو خود بھی شریک ہو جاتے تھے۔سیدنا سلمۃ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:بنواسلم کے لوگ تیر اندازی کررہے تھے نبی علیہ السلما نے اُن کی تحسین فرمائی۔[2]

ادبیات میں شعروشاعری ایک اہم جزو ہوتی ہے۔سیرت مبارکہ کے مطالعے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ادبیات کا یہ جزو مخفی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ مفید شعروشاعری کی حوصلہ افزائی کرکےباقاعدہ اس سلسلے میں ارشادات موجود ہیں۔ جیسا کہ مفیدشعر وشاعری کے بارے میں مشہور حدیث ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا ”بعض شعروں میں دانائی ہوتی ہے"[3]

3۔ادبیات کے حوالے سے خود نبی علیہ السلام شعراء کا کلام سنتے تھے اور کبھی کبھار صحابہ سے سننے کی فرمائش بھی فرماتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت ہے ایک صحابی فرماتے ہیں:

> "ایک دن میں سواری میں نبی علیہ السلام کے پیچھے بیٹھا تھا،آپ نے فرمایا تمہیں امیہ بن صلت کے اشعارآتے ہیں،میں نے کہا جی آتے ہیں،آپ نے فرمایا۔اُن میں سے کچھ کہو،میں چند اشعار سنائے آپ نے مزید کی فرمائش کی میں نے اور سنائے آپ نے پھر مزید کی فرمائش کی۔یہاں تک کہ میں نے سو(100)اشعار سنائے"[4]

4۔اسی طرح جب کسی غیر مسلم شاعر کا کوئی حکمت والا شعر سنتے تو اس کی تحسین فرماکر داد بھی دیتے جیسا کہ اسی مسلم شریف کی ایک روایت ہے:

---

[1]مسلم،کتاب صلوۃ العیدین،باب الرخصۃ فی اللعب الذی لامعصیۃ فیہ فی ایام العید،رقم:2101

[2]صحیح بخاری،کتاب الجھاد السیر،باب التحریض علی الرمی،رقم:2899

[3] بخاری،کتاب الادب،باب مایجوز من الشعر والرجز ومایکرہ منہ،رقم:6145

[4]مسلم،کتاب الشعر،باب حدثنا عمرو الناقد،رقم:6022

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کی
شعراء کے کلام میں سے اچھا کلمہ لبید [1]کا مصرعہ ہے: اللہ
کے سوا جو کچھ ہے سب معدوم و فنا ہونے والا ہے"[2]

5۔ زمانۂ جاہلیت کےشعراء میں سے اگر کسی شاعر کے شعر کے مجموعے میں کوئی اچھی خصوصیت ہوتی تو اس شاعر کے بارے میں بھی آپ اچھے کلمات ارشاد فرماتے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا کی
شعراء کے کلام میں سے سچا کلمہ لبید کا مصرعہ ہے جو یہ
ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب معدوم و فنا ہونے والا ہے۔
امیہ بن ابی الصلت[3] شاعر تو قریب تھا کہ مسلمان ہو جائے"[4]

6۔خود بھی بعض دفعہ آپ ایسے کلمات ارشاد فرماتے جو شعر کی شکل اختیار کرتے جیسا کہ حنین کے موقع پر آپ کی زبان مبارک پر چندکلمات جاری تھے۔سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ [5]سے کسی نے پوچھا:

"ایک شخص نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا
حنین کی لڑائی میں آپ لوگ نبی علیہ السلامکو چھوڑ کر چلے
گئے تھے؟ براء رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں لیکن نبی علیہ
السلاماپنی جگہ پر ثابت قدم رہے۔ ہوازن کے لوگ(جن سے اس
لڑائی میں مقابلہ تھا)بڑے تیرانداز تھے، جب ہمارا ان سے
سامنا ہوا تو شروع میں ہم نے حملہ کر کے انہیں شکست دے
دی، پھر مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور دشمن نے تیروں
کی ہم پر بارش شروع کر دی پھر نبی علیہ السلاماپنی جگہ
سے نہیں ہٹے۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
سفید خچر پر سوار تھے، ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب
رضی اللہ عنہ اس کی لگام تھامے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ
علیہ وسلم یہ شعر فرما رہے تھے " أَنَا النَّبِيُّ لاَ كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ

---

[1]لبید: ابو عقیل بن ربیعہ عامری کی پیدائش104قبل ہوئی۔ لبید عہد جاہلیت کا ممتاز شاعر تھا۔ ان کا نسب لبید بن ربيعة بن مالك بن جعفر بن كلاب بن ربيعة بن عامر بن صعصعة ہے۔ وفد بنو کلاب میں 13 افراد آئے ان میں لبید عامری بھی تھے یہ رملہ بنت حارث کے گھر میں ٹھہرے سب وفد کے لوگ اسلام لائے اور واپس ہوئے۔۔ لبید نے سخاوت اور بہادری کی آغوش میں پرورش پائی۔ اس کا باپ ربیعہ پریشان حال لوگوں کی امید گاہ تھا، اس کا چچا مضر اور ملاعب الاسنہ (نیزوں سے کھیلنے والا) تھا۔ اسلام لانے کے بعد طویل عرصہ تک زندہ رہا۔ جب کوفہ شہر بسایا گیا تو یہ خلافت فاروقی میں وہاں چلا گیا اور وہیں مقیم ہوگیا اوسیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اوائل میں41ھ،661 ء میں ایک سو پینتالیس (145)کی عمر میں فوت ہوا۔)(لبید بن ربیعہ عامری/https://ur.wikipedia.org/wiki)

[2] نفس مصدر،رقم:6025

[3]امیہ بن عبداللہ ابی الصلت بن ابی ربیعہ بن عوف ثقفی۔طائف کے باشندے، طبقہ اولیٰ کے جاہلی شاعر ہے۔اسلام سے پہلے دمشق آئے۔کتب قدیمہ سے باخبر تھے۔اپنے آپ پر شراب اور بتوں کے عبادت کو حرام قرار دیا تھا۔اسلام سے خبرداری حاصل ہوئی تھی اور قریب تھا کہ اسلام لاتے۔لیکن بدر میں اُن کے ماموں زاد کے قتل نے اُسے ایمان لانے سے روکا۔طائف میں 5ھ کو وفات پائے۔ج1 ص946۔

[4] بخاری،کتاب الادب،باب مایجوز من الشعروالرجز والحساء ومایکرہ منہ،رقم:6147

[5]ابو عمرو براء بن عازب بن حارثؓ انصاری صحابی ہیں۔ کم سنی کی وجہ سے جنگ بدر میں شریک نہ ہوئے تاہم 15 غزوات میں نبی کے ساتھ شانہ بشانہ رہیں۔ جنگ جمل و صفین میں سیدنا علیؓ کا ساتھ دیا۔72ھ/619ء میں وفات پائی۔(ابن حجر، الاصابہ،ج1،ص278۔ابن عبدالبر،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ، ج1،ص48)۔

المطلب میں نبی ہوں اس میں جھوٹ کا کوئی دخل نہیں، میں
عبدالمطلب کی اولاد ہوں"[1]

7۔نبی علیہ السلام کے شاعرِخاص سیدنا حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ [2]کے بارے احادیث میں کثرت سے واقعات موجود ہیں۔آپ ﷺ اُن سے اشعار سنتے تھے اور ایک دفعہ تو آپ ﷺنے سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا:حسان اِن مشرکین نے میری جو ہجو کی ہے اس کا جواب دو اور جبرائیل امین تمہارے مددکررہے ہیں۔جیسا کہ ایک طویل روایت ہےجس میں یہ واقعہ ہے:

"حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار کامنظوم ترجمہ : ایک شاعر نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ہجویہ اشعار کہے تھے۔ جب وہ اشعار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شاعر خاص حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ سے فرمایا: کہ حسان اٹھو، اور ان اشعار کا جواب دو۔ یہ وہ صحابی تھے جن کے لیے حضور ﷺ خود اپنی چادر بچھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ حسان اس چادر پر بیٹھو۔ اور انہی کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی تھی (اللھم ایدہ بروح القدس) "[3]

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان ہجویہ اشعار کا جواب کچھ اس طرح سے دیا اردو ترجمے میں ملاحظہ فرمائیں;

میرے آقا میرے مولا،میرے آقا میرے مولا
محمد رسول اللہ،محمد رسول اللہ
1۔جہاں میں ان سا چہرہ ہے نہ ہے خندہ جبیں کوئی
ابھی تک جن سکیں نہ عورتیں ان سا حسین کوئی
2۔نہیں رکھی ہے قدرت نےمیرے آقا کمی تجھ میں
جو چاہا آپ نے مولا وہ رکھا ہے سبھی تجھ میں
3۔بدی کا دور تھا ہر سو جہالت کی گھٹائیں تھیں
گناہ و جرم سے چاروں طرف پھیلی ہوائیں تھیں
4۔اللہ کے حکم سے نا آشنا مکے کی بستی تھی
گناہ و جرم سے چاروں طرف وحشت برستی تھی
5۔اللہ کے دین کو بچوں کا ایک کھیل سمجھتے تھے
اللہ کو چھوڑ کر ہر چیز کو معبود کہتے تھے
6۔وہ اپنے ہاتھ ہی سے پتھروں کے بُت بناتے تھے

---

[1] صحیح بخاری،کتاب الجہاد، باب من قاد دابة غیرہ في الحرب ،رقم:2864

[2] حسان بن ثابت بن المنذرؓ الخزرجی الانصاری صحابی رسول ہیں۔ آپ کی کنیت ابو الولیدیا ابو عبدالرحمٰن یا ابو الحسام ہے۔ آپ شاعر رسول ہیں۔ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے۔ آپ نے 60 سال کا عرصہ دور جاہلیت میں گزارا ۔اور تقریباً اتنا ہی اسلام میں گزارا۔آپ 54ھ/674ء کو مدینہ میں وفات پائی۔(ابن الاثیر،اسد الغابہ،ج2،ص7۔ ابن عبدالبر،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج1،ص100۔ الاعلام،ج4،ص458)۔

[3] مسلم،کتاب الفضائل،باب فضائل حسان بن ثابت،رقم:6550

انہی کے سامنے جھکتے انہی کی حمد گاتے تھے
7۔کسی کا نام "عُزی"تھا کسی کو "لات" کہتے تھے
"ہُبل" نامی بڑے بُت کو بتوں کا باپ کہتے تھے
8۔اگر لڑکی کی پیدائش کا ذکر گھر میں سن لیتے
تو اُ ُس معصوم کو زندہ زمیں میں دفن کر دیتے
9۔پر جو بھی بُرائی تھی سب ان میں پائی جاتی تھی
نہ تھی شرم و حیا آنکھوں میں گھر گھر بے حیائی تھی
10۔مگر اللہ نے ان پر جب اپنا رحم فرمایا
تو عبداللہ کے گھر میں اللہ کا لاڈلا آیا
11۔عرب کے لوگ اس بچے کا جب اعزاز کرتے تھے
تو عبدالمطلب قسمت پر اپنی ناز کرتے تھے
12۔اللہ کے دین کا پھر بول بالا ہونے والا تھا
محمد سے جہاں میں پھر اُجالا ہونے والا تھا
13۔فرشتہ ایک اللہ کی طرف سے ہم میں حاضر ہے
اللہ کے حکم سے جبرئیل بھی اک فرد لشکر ہے
14۔سپہ سالار اور قائد ہمارے ہیں رسول اللہ
مقابل ان کے آؤ گے ملے گی ذلت کُبری
15۔ہمیں فضل اللہ سے مل چکی ایماں کی دولت ہے
ملی دعوت تمہیں پر سر کشی تم سب کی فطرت ہے
16۔سنو اے لشکر کفار ہے اللہ غنی تم سے
لیا تعمیر زمیں کا کام ہے اللہ نے ہم سے
17۔لڑائی اور مدح و ذم میں بھی ہم کو مہارت ہے
قبیلہ معاذ سے ہر روز لڑنا تر سعادت ہے
18۔زبانی جنگ میں شعر و قوافی خوب کہتے ہیں
لڑائی جب بھی لڑتے ہیں لہو دشمن کے بہتے ہیں
19۔محمد کے تقدس پر زبانیں جو نکالیں گے
اللہ کے حکم سے ایسی زبانیں کھینچ ڈالیں گے(ان شاءاللہ)
20۔کہاں رفعت محمد کی کہاں تیری حقیقت ہے
شرارت ہی شرارت بس تیری بے چین فطرت ہے
21۔مذمت کر رہا ہے تُو شرافت کے مسیحا کی
امانت کے دیانت کے صداقت کے مسیحا کی
22۔اگر گستاخ ناموس احمد کر چکے ہو تم
تو اپنی زندگی سے قبل ہی بس مر چکے ہو تم
23۔میرا سامان جان و تن فدا ان کی رفاقت پر
میرے ماں باپ ہو جائیں نثار ان کی محبت پر
24۔زبان رکھتا ہوں ایسی جس کو سب تلوار کہتے ہیں
میرے اشعار کو اہل جہاں ابحار کہتے ہیں
میرے آقا میرے مولا، میرے آقا میرے مولا

محمد رسول اللہ، محمد رسول اللہ

8-اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایسے کلمات ارشاد فرمائے تھے:

"براء بن عازب ؓ نے بیان کیا کہ میں نے نبی علیہ السلام کو غزوہ احزاب (خندق) کے موقع پر دیکھا کہ آپ ﷺ مٹی (خندق کھودنے کی وجہ سے جو نکلتی تھی) خود ڈھو رہے تھے ۔ مٹی سے آپ ﷺ کے پیٹ کی سفیدی چھپ گئی تھی اور یہ شعر کہہ رہے تھے"لولانت ماابتدینا ولاتصدقنا ولاصلینا"اے اللہ اگر تو نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے اور ہم نہ صدقہ دیتے ، اور نہ نماز پڑھتے ، پس تو ہم پر سکینت نازل فرما ، اور جب ہم دشمن سے مقابلہ کریں ، تو ہمیں ثابت قدم رکھ ، بے شک ان لوگوں نے ہم پر ظلم کیا ہے ، جب یہ کوئی فساد کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان کی بات میں نہیں آتے"[1]

9-اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ نبی علیہ السلام کی دوستی کے بارے میں شعر کہا آپ ﷺ نے اس کا جواب بھی ارشاد فرمایا جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"انصار خندق کھودتے ہوئے (غزوہ خندق کے موقع پر) کہتے تھے " نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدَا" ... "عَلَى الْجِهَادِ مَا حَيِينَا أَبَدَا " " ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) سے جہاد پر بیعت کی ہے ہمیشہ کے لیے ، جب تک ہمارے جسم میں جان ہے۔نبی علیہ السلام نے جواب میں فرمایا"اللَّهُمَّ لاَ عَيْشَ إِلاَّ عَيْشُ الآخِرَهْ" ... "فَأَكْرِمِ الأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَهْ "اے اللہ اصل زندگی تو آخرت ہی کی ہے پس تو انصار اور مہاجرین کی اکرام کر"[2]

9-شعروشاعری کے حوالے سے اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ شعر وشاعری اس وقت تک جائز ہے جب اس میں قبیح الفاظ،مواد اوربے ہودہ مضمون نہ ہو۔اور اگر اس میں قبیح الفاظ ،مواد اور بے ہودہ کلمات ہوں تو پھر اس کے بارے میں قرآن وحدیث میں نہایت سخت وعیدیں آئی ہیں جیسا کہ ارشاد رربانی ہے:

"اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں"[3]

10-اور حدیث میں بھی اس سے منع فرمایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلامنے فرمایا" :کسی شخص کے پیٹ کا بیماری کے سبب مواد سے بھر جانا بہتر ہے اس سے کہ وہ شعر سے بھرا ہو"[4]

اس دفعے میں کسی کی "تصنیف"یا "تالیف" کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اُسی مصنف یا مؤلف ہی کا حق ہوگا کہ اپنی اس کاوش سے استفادہ کر سکے اور کسی دوسرے کو اس کے استعمال یا بلااجازت استفادے کی اجازت نہیں ہو گی ۔قرآن کریم میں اس بارے میں ارشاد ہے کہ وہ لوگ

---

[1] بخاری،کتاب الجہاد ،باب حفر الخندق،رقم:2837
[2] بخاری،کتاب الجہاد،باب البیعۃ فی الحرب ان لایفروارقم:2961
[3] الشعراء26:224
[4] مسلم،کتاب الشعر،باب حدثناعمرو الناقد،رقم:6031

جو ہر کوشش کے اور بغیر کسی کام کے کرنے کے یہ چاہتے ہیں کہ پھر بھی ان کی تعریف کی جائے اور یہ ارشاد مذمت کی جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے جیسا کہ:

"جو کرتے نہیں ان کے لئے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہوجائیں گے"[1]

یہاں پر کسی دوسرےکے کیے ہوئے کام کا کریڈٹ لینے سے اشارۃً منع کیا گیا ہے ۔اس حوالے سے جدید دور میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کی سائنسی یا علمی کاوش کا فائدہ (چاہے اخلاقی ہو یا مادی)صرف اسی کو ہونا چاہئیے جس کی یہ کاوش ہے ۔ہر دو صورت میں اُس کے حقوق کے بچاؤ کے لیے کوشش کی جائے گی۔

دفعہ:۲۸

اعلان میں پیش کر دہ حقوق کے بنا پر ہر شخص معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حق دار ہے ۔

بین الاقوامی نظام کا تعارف تو اسلام نے آج سے صدیوں پہلے دیا ہے جیسا کہ :"يَاأَيُّهَا النَّاسُ"سے مترشح ہوتا ہے۔جس میں رنگ،نسل،ملک،جنس اور زبان وغیرہ آتے ہیں۔

اللہ تعالی کا بھیجا ہوا دین بھی "بین الاقوامیت "کا درس دیتا ہے۔جیسا کہ قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے۔آج کے دور میں دنیا بین الاقوامیت کی بات کرتی ہے حالانکہ یہ "اصطلاح" تو سب سے پہلے اسلام نے استعمال کی ہے اور اس کا عملی نفاذ بھی دنیا کو دکھایا ہے۔جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

"لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بےشک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے"[2]

اس حوالے سے اللہ تعالی مزید فرماتے ہیں:

"اے لوگوں اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا یعنی اول اس سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پیدا کرکے روئے زمین پر پھیلا دئیےاور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور قطع رحمی سے بچو کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[3]

حافظ عماد الدین رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" محبت و مودت کا آفاقی اصول اللہ تعالیٰ اپنے تقوے کا حکم دیتا ہے کہ جسم سے اسی ایک ہی کی عبادتیں کی جائیں اور دل میں صرف اسی کا خوف رکھا جائے، پھر اپنی قدرت کاملہ کا بیان فرماتا ہے کہ اس نے تم سب کو ایک ہی شخص یعنی آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے، ان کی بیوی یعنی حواء علیہما

---

[1] آل عمران188:3

[2] الحجرات13:49

[3] النساء1:4

اسلام کو بھی انہی سے پیدا کیا، آپ سوئے ہوئے تھے کہ بائیں
طرف کی پسلی کی پچھلی طرف سے حواء کو پیدا کیا، آپ نے
بیدار ہو کر انہیں دیکھا اور اپنی طبیعت کو ان کی طرف راغب
پایا اور انہیں بھی ان سے انس پیدا ہوا"[1]

اور معاشرتی نظام میں شامل ہونے کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو دنیا کے ہر قانون اورمذہب سے آسان تر ہیں ۔یہ اسلامی تعلیمات ہی تو تھیں جن کے بدولت معاشرتی اقدار کی پاسداری کے حوالے سے ایسی مستحکم بنیادیں رکھی گئیں ہیں جو رہتی دنیا تک کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ بطور خلاصہ چند یہ ہیں۔

1۔فرد کے حقوق وفرائض
2۔خاندان کے حقوق وفرائض
3۔والدین کے حقوق وفرائض
4۔اولاد کے حقوق وفرائض
5۔بچوں کے حقوق وفرائض
6۔عورتوں کے حقوق وفرائض
7۔جوانوں کے حقوق وفرائض
8۔بوڑھوں کے حقوق وفرائض
9۔میاں بیوی کے حقوق وفرائض
10۔ہمسائیوں کے حقوق وفرائض
11۔غیر مسلموں کے حقوق وفرائض
12۔فقراء ومساکین کے حقوق وفرائض
13۔اساتذہ کے حقوق وفرائض
14۔طلباء کے حقوق وفرائض
15۔اولواالامر کے حقوق وفرائض
16۔مریضوں کے حقوق وفرائض
17۔(نوکروں)غلاموں کے حقوق وفرائض

مندرجہ بالا حقوق وفرائض کی رعایت اگر رکھی جائے تویہ کسی بھی معاشرے کے امن و کامیابی کے لیے بہترین زینہ بن سکتے ہیں ۔اسلام ان حقوق وفرائض کے بارے میں جو ہدایات دیتا ہے اُسی ہی کےذریعے خیرالقرون کے پُرامن معاشرے تشکیل پائے تھے۔جن میں تمام معاشرتی "حقوق وفرائض"عملی طور پر نافذ تھے۔ان سب کے بارے میں اس مقالے کے باب دوم میں تفصیلی وضاحت کی جاچکی ہے۔

---

[1] ابن کثیر،ج2،ص206

دفعہ: ۲۹

(۱) معاشرے کا بھی ہر شخص پر حق ہے.

(۲) قانون کی رو سے امن اور فلاح عامہ کی خاطردوسروں کی آزادی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

فرد چونکہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور معاشرے کے بنیادی اکائی ہونے کی وجہ سے "فرد" پر کچھ فرائض لاگو ہوتے ہیں جن کے ذریعے معاشرے میں امن،پائیداری اور مساوات قائم ہو سکتا ہے۔اس بارے میں فرد پردرجہ ذیل امور لازم ہوتے ہیں۔

1۔اتفاق واتحاد کا ماحول پیدا کرنا:
2۔اجتماعی امور شرکت کی پالیسی کے تحت نمٹانا
3۔معاشرے کے ثقافتی اقدار کا تحفظ کرنا
4۔رسم ورواج کی پابندی کرنا
5۔معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کرنا
6۔معاشرے کو بین الاقوامی دھارے میں لانے کے لیے سعی کرنا
7۔معاشرے میں پائیدار امن کی خاطر اپنے حقوق کے بارے میں معافی سے کام لینا
8۔ذاتی مفادات کے بجائے مشترکہ مفادات کو ترجیح دینا
9۔اپنے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرنا
10۔الٰہی احکام کی روشنی میں اجتماعی مسائل کا حل تلاش کرنا

دفعے کی دوسری شق کے حوالے سے بھی اسلامی تعلیمات موجود ہیں۔اپنے حقوق کے حصول کے لیے ایسی جدوجہد کرنا،جس میں دوسروں کے حقوق پامال نہ ہو۔اخلاقی ضابطہ حیات تشکیل دینا جس میں عائلی زندگی سے لے کر سیاسی ومعاشی زندگی تک تمام شعبہ ہائے زندگی میں اصلاحی عمل کے ذریعے مثبت انقلاب لانے کی کوشش کرنا۔

اخلاقی کردار کے بارے میں احادیث نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام ہیں مثلاََ :

1۔راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو صدقہ کہا گیا ہے جیسا کہ :

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی علیہ السلام کے حوالہ سے بیان کیا کہ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے"[1]

2۔ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت ہے:

---

[1] بخاری،کتاب المظالم والغصب،باب اماطۃ الاذی نمبر24

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:ایمان کے کچھ اوپر ستریاکچھ اوپر ساٹھ درجے ہیں جس میں سب سے افضل" لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ "کا کہنا ہے اور سب سے کمزورراستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے"[1]

3۔کسی کو برے نام سے نہ پکارا جائے اور نہ ہی کسی کا نام ایسا رکھا جائے جس کے معنی اچھے نہ ہوں،اس حوالے سے بخاری کی روایت ہے کہ:

"سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:اللہ کے محبوب کلمے چارہیں"سبحان اللہ،الحمد للہ،لاالہ الااللہ اللہ اکبر"کسی بھی کلمے سے شروع کیا جاسکتا ہے۔اپنے غلام (لڑکے)کے " يَسَار، رَبَاح،نَجِيح ، أَفْلَح "نام نہ رکھ دو۔کیونکہ پھر تم کہو گے کہ(مثلا) " يَسَار "وہاں ہے؟ وہ نہ ہو تو کہا جائے گا کہ نہیں۔(اور یہ اچھی بات نہیں ہے)"[2]

4۔ اوراگر کسی کا ایسا نام رکھا گیا ہو تو اُسے تبدیل کرنا چاہئیے جیسا کہ خود نبی علیہ السلام نے بہت سارے نام تبدیل فرماتے تھے جیسا کہ :

"سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ام المؤمنین سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کا نام " بَرَّةَ "تھا ۔آپ ﷺ نے اسے تبدیل فرماکر "جویریہ" رکھ دیا۔کیونکہ آپ ﷺ یہ بات ناپسند فرماتے تھے کہ یہ کہا جائے"(آپ)" بَرَّةَ "کے ہاں سے نکل گئے"[3]

"ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے " عَاصِيَةَ "بدل فرماکر" جَمِيلَةُ "رکھ دیا"[4]

اور ایک روایت میں ہے:

"نبی علیہ السلام نے اس(جیسے)نام (رکھ دینے)سے منع فرمایا ۔میں نے " بَرَّةَ "نام رکھ دیا۔آپ ﷺ نےفرمایا:اپنے آپ کو پاک پاک ہونے کے دعوے نہ کرو۔اللہ تم میں سے نیک(پاک) بہتر جانتا ہے۔صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے پوچھا:پھر کیا نام رکھ دے۔آپ ﷺ نے فرمایا " زَيْنَبَ "نام رکھ دو"[5]

دفعہ: ۳۰

اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک،گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کاحق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو۔جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

---

[1] مسلم،کتاب الایمان،باب شعب الایمان،رقم:162

[2] مسلم،کتاب الاداب ،باب کراهية التسمية بالاسماء القبيحه ،رقم:5724

[3] نفس مصدر،رقم:5729

[4] نفس مصدر،رقم:5727

[5] نفس مصدر،رقم:5733

دفعہ نمبر 30 میں ان تمام دفعات کے حوالے سے یہ بات کی گئی ہے کہ اپنے "حقوق" کے حصول میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئیے کہ اس میں ایسا کوئی بھی کام نہ کیا جائے جس سے منشور کے دوسرے دفعات متاثر ہوتے ہوں۔

اسلامی تعلیمات میں بھی یہ ہدایات ہیں کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کرنی چاہئیے کیونکہ جہاں آپ کے حقوق دوسروں کے حقوق سے ٹکراتے ہوں ،وہاں پر ایسی تطبیقی صورت پر عمل میں لائی جائی گی کہ آپ کے حقوق بھی متاثر نہ ہوں اور دوسروں کے حقوق بھی ضائع نہ ہو ۔

عالمی منشوربرائے انسانی حقوق 1948ءکی خامیاں:

اس منشور کو دنیا انسانیت کا کمال سمجھتی ہے حالانکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس میں بہت ساری خامیاں ہیں۔یہ خامیاں یا تواس طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے درآئی ہیں یادیدہ دانستہ طور پر اس سے تغافل برتا گیا ہے۔مثلا

پاگلوں،کم عقلوں وغیرہ کے حقوق: اس سلسلے میں " عالمی منشور"بالکل خاموش ہے حالانکہ ایسے لوگ بھی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اور خصوصی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔عقل میں فتور رکھنے والے لوگوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔اور اُن کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔معاملات وغیرہ کے حوالے سے اُن کے ساتھ "احسان" کا حکم دیا گیا ہے۔اسی طرح اُن کا مزاق اُڑانے یااُن کے ساتھ اس طرح کے دوسرےناشائستہ کام کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کاارشاد ہے:

اور بے عقلوں کو ان کا مال جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے
سبب معیشت بنایا ہے مت دو (ہاں) اس میں سے ان کو کھلاتے
اور پہناتے رہے اور ان سے معقول باتیں کہتے رہو"[1]

یتیموں کے حقوق: اس منشور میں "بچے" کے حقوق کے متعلق تو سفارشات کی گئی ہیں لیکن اس میں معاشرے کے ایک اہم اور قابل توجہ مسئلے یعنی "یتیموں کے حقوق"کی طرف اشارہ تک نہیں دیا گیا ہے ۔سو اس بارے میں اسلامی تعلیمات میں ان پر توجہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو
کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے۔ اور اگر تم ان
سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکھٹا رکھنا) چاہو تو وہ
تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا
کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو
تکلیف میں ڈال دیتا۔بےشک اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے"[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے
کردو اور ان کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور)
برے مال سے نہ بدلو۔ اور نہ ان کا مال اپنے مال میں ملا کر
کھاؤ۔ کہ یہ بڑا سخت گناہ ہے"[3]

اس آیت میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ یتیموں سے مال لینے دینے کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہئیے۔

اسی طرح آگے یتمیوں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھنے کا بھی ارشاد ہے[4]

اس آیت میں اُن کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب تک اُن میں کامل سمجھ بوجھ نہ ہو اس وقت تک ان کی مال کی نگرانی کرتے رہو ۔نیز اگر ان کے اموال کی نگرانی کرنے کی وجہ سے تمہیں کچھ ضرورت محسوس ہو توسخت ضرورت کے وقت اُن کے اموال سے بقدر ضرورت استعمال کرسکتے ہو۔

اسی طرح یتیموں کا مال ناحق طریقے سے کھانے "ظلم"کہاگیا۔ اور اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

" جولوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ
میں آگ بھرتے ہیں۔ اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے"[5]

یتیموں کے ساتھ بھلائی کا حکم دے کر معاشرے کے ایک "محروم طبقے"کو سایہ فراہم کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

"اور یہ (بھی حکم دیتا ہے) کہ یتیموں کے بارے میں انصاف
پر قائم رہو۔ اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے"[6]

---

[1] النساء5:4
[2] البقرة220:2
[3] النساء2:4
[4] النساء3:4
[5] النساء10:4
[6] النساء127:4

حق میراث: جن انسانی حقوق کا اس عالمی منشور میں ذکر تک موجود نہیں ہے ان میں سے ایک "حقِ وراثت"ہے۔حق وراثت ایک اہم انسانی حقوق میں سے ہے جو کسی شخص کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کو حاصل ہوتا ہے ۔معمول کے مطابق میت کی تجہیزوتکفین اور اُس کے ذمے واجب الادا قرض کی ادائیگی کے بعداور اُس کی جائز وصیت کے نفاذ کے بعد اگر کچھ مال بچ گیا تو اس کے وارثوں کی طرف لوٹ آئے گا۔شریعتِ مطہرہ میں "وراثت" کے مستقل احکام موجود ہیں جو عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔اس سلسلے میں مرد اور عورت دونوں کو حقوق ملتے ہیں۔اللہ تعالی فرماتے ہیں :

" جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں تھوڑا ہو یا بہت۔ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی یہ حصے (اللہ کے) مقرر کئے ہوئے ہیں"[1]

حصص کےحوالے سے بھی قرآنی ارشادات بھی موجود ہیں۔[2]

جو حضرات بے اولاد ہیں ۔شریعتِ مطہرہ نے اُن کے بھی مستقل حقو بیان کئے ہیں ۔ اس بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان موجود ہے :

" لوگ تم سے حکم دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ کلالہ بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مرجائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کے بہن ہو تو اس کو بھائی کے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا۔ اور اگر بہن مرجائے اور اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے تمام مال کا وارث بھائی ہوگا اور اگر دو بہنیں ہوں تو دونوں کو بھائی کے ترکے میں سے دو تہائی۔ اور اگر بھائی اور بہن یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اللہ تم سے اس لئے بیان فرماتا ہے کہ بھٹکتے نہ پھرو۔ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے"[3]

احادیث میں بھی ان کے حقوق کے بارے میں واضح ارشادات موجود ہیں۔جیساکہ ابو داؤد کی روایت ہے:

"نبی علیہ السلامنے فرمایا" :کہ اللہ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے لہٰذا اب وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں"[4]،[5]

ذاتی دفاع:" عالمی منشور" کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جان/ذاتی دفاع کے متعلق اس میں کچھ ہدایات نہیں ہیں ۔حملہ آوروں سے اپنے بچاؤ کے لیےاحتیاطی تدابیر اختیار کرنا انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہیں۔اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات میں صدیوں پہلے اپنی جان کے بچاؤ اور دفاع کے مشروط حقوق دئیے ہیں۔ اوراپنے اوپرسے زیادتی کو روکنے کی کیفیت کے حوالے سےارشادت دئیے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] النساء7:4

[2] النساء11:4

[3] النساء176:4

[4] ابوداؤد،کتاب الوصایا،باب ماجاء فی الوصیۃ للوارث،رقم:2872

[5] قال الالبانی:حسن صحیح۔صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج6،ص370

پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر
کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان
رکھو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے"[1]

اسلام نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ معافی کے بھی تحسین فرمائی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اور جو ایسے ہیں کہ جب اُن پر زیادتی ہو تو مناسب طریقے
سے بدلہ بھی لیتے ہیں۔اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی
برائی ہے۔مگر جو درگذر کرےاور معاملے کو درست کردے
تواس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم
کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا"[2]

اپنی دفاع کی جدوجہد کرنا بھی انسانی حقوق میں سے ہیں اور اگراس بارے کسی کو میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ باعث اجر ہے،جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" :جو اپنا مال بچانے
میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے بال بچوں کو بچانے یا
اپنی جان بچانے یا اپنے دین کو بچانے میں مارا جائے وہ بھی
شہید ہے"[3]،[4]

معافی کاحق:کسی کو کسی غلطی کی پاداش میں معاف کردینے سے کسی بھی معاشرے میں امن وسکون آتا ہے ۔معافی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات دنیا کے دیگر مذاہب سے ممتازہیں۔عالمی منشور میں اس حق کے بارے میں کوئی واضح دفعہ موجود نہیں ہے۔یہ معافی انفرادی بھی ہو سکتی ہے اوراجتماعی بھی۔فرد اور معاشرے میں شریروں کے سامنے ہتھیار ڈالے بغیر معافی کی دعوت ہے۔مد مقابل جو شر کے داعی ہو،کو اچھے طریقے سے ٹالنے اور معاف کر دینے پر زور دیاگیا ہے۔اس "ٹالنے" اور "معافی" کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

" اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی۔ تو (سخت کلامی
کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے
سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ
تمہارا گرم جوش دوست ہے"[5]

اللہ جل شانہ مزید فرماتے ہیں:

" فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ[6]"پس اچھی طرح درگزر کیجئے"

اسی طرح ارشاد ہے:

"آپ برد باری سے کام لیں اور نیکی کاحکم کرتے رہیں اور جاہلوں سے اعراض کریں"[7]

حدیث میں معافی کے بارے میں ارشاد ہے:

---

[1] البقرۃ194:2

[2] الشوری42 :40،39

[3] ابوداؤد،کتاب السنۃ،باب فی قتال اللصوص،رقم:4774

[4]قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج10،ص272

[5] فصلت34:41

[6] حجر85:15

[7]الاعراف199:7

نبی علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا: ''میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں اور میں تم لوگوں سے ایک بات بیان کر رہا ہوں جسے یاد رکھو''، ''کسی بندے کے مال میں صدقہ دینے سے کوئی کمی نہیں آتی)یہ پہلی بات ہے(، اور کسی بندے پر کسی قسم کا ظلم ہو اور اس پر وہ صبر کرے تو اللہ اس کی عزت کو بڑھا دیتا ہے)دوسری بات ہے(، اور اگر کوئی شخص پہنے کے لیے سوال کا دروازہ کھولتا ہے تو اللہ اس کے لیے فقر و محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہے"[1]،[2]

منشور کا عملی نفاذ: ایک کمی جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق کےحوالے سے کسی زیادتی کی روک تھام کے لیےذرائع اور حفاظتی اقدامات بھی اُسی معیار کے ہونے چاہئیے جس معیار کا یہ منشور ہے یعنی یہ اقدامات بھی عالمی معیار کےہونے چاہئیے۔اس حوالے سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"اکتفی بایرادالنص عام مبهم یقرر ان(لکل فردالحق فی التمتع بنظام اجتماعی دولی تتحقق بمقتضاه الحقوق والحریات المنصوص علیها فی هذاالاعلان تحقیقا تاما(المادة28)کما تضمن الاعلان تحذیرامن التحایل علی نصوصه اواساءة تاویلها دون تحدیدا جزاء للمخالفة،اذا ورد النص کمایلی(لیس فی هذا الاعلان نص یجوز تاویله علی انه یخول لدولة وجماعة اوفرد ای حق فی القیام بنشاط اوتادیة عمل یهدف الی هدم الحقوق والحریات الواردة فیه)"

(چنانچہ)میں اہم "مبہم عبارت "کی مثال پیش کرتا ہوں جو درجہ ذیل چیز کو لازم ٹھہراتی ہے کہ:

ہرانسان کو حق حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی معاشرتی نظام کے اس منشور کے دفعہ28میں ڈکلئیر کردہ حقوق اور آزادیوں سے فائدہ اٹھائے اور ان سے اپنے مقصد کی برآری کو یقینی بنائے۔ علاوہ ازیں یہ منشور اپنی عبارت کی غلط ترجمانی اور اس سے پہلو تہی کرنے پر (ایک عدد)وارننگ پر بھی مشتمل ہے لیکن اس وارننگ کی خلاف ورزی پرسزا کا کوئی ذکر نہیں ،کیونکہ اس وارننگ کی عبارت اس طرح ہے:

"اس منشور میں کوئی ایسی عبارت نہیں ہے کہ جس سے یہ مطلب اخذ کرنا جائز ہو کہ کسی ملک اور کسی پارٹی یا فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اس منشور میں درج شدہ حقوق اورآزادیوں کو منہدم کرنے کی غرض سے کوئی سرگرمی یا کوئی فعل سرانجام دے سکتا ہے[3]"۔

قوتِ نافذہ کی معدومی: اس منشورکی خامیوں میں سے یہ بھی ہیں کہ اس میں عملی رکاوٹ ہے۔کیونکہ یہ منشور منظور تو ہو گیا، لیکن اس کےلیے ایسی قوت نہیں ہے جو اس کو نافذ بھی کر سکے۔ کیونکہ مثلا اگر کوئی ملک خاص طور پر کوئی طاقت ور ملک عالمی منشور کی خلاف ورزی کرے تو اسے اس کا پابند بنانے کی کوئی ٹھوس اور موثر تدبیر اس میں تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت آپ آج کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں کہ ایک بڑا ملک اپنی طاقت کے نشہ میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔

---

[1] ترمذی،کتاب الزھد،باب مثل الدنیا مثل اربعة نفر،رقم:2325

[2] قال الالبانی:صحیح،صحیح وضعیف سنن ترمذی،ج5،ص325

[3] سلیمان بن عبدالرحمان،الحقیل،حقوق الانسان فی الاسلام والرد علی الشبہات المثارة حولھا، ص107،مکتبة الملک فھد،الریاض،طبع رابع1424ھ

منشور میں ابہام: اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ اس میں مذہب کے حوالے سے آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس آزادی کیحدود متعیّن نہیں کی گئیں ۔کیونکہ مذہبی آزادی صرف پوجا پاٹ ، عبادت(گھر میں ہو یامسجدچرچ، گردوارے)کانام نہیں ہے۔کیونکہ آج دنیا مذہبی آزادی کو صرف ذاتی(نجی) اور خاندانی معاملات میں آزادی دے کر کہتی ہے کہ یہ مذہبی آزادی ہے۔اس سے زیادہ دنیا میں مذہبی آزادی کا کوئی تصور نہیں ہے ،اس کے مقابلے میں اسلام پوری زندگی کے بارے میں ہمیں ہدایات فراہم کرتا ہے اور ان کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ ایسا کوئی قانون نہیں ہے جو یہ کہے کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے تمام احکام پر چلنے کی آزادی ہے اور وہ اپنے دائرے میں اپنا قانون نافذ کرسکتے ہیں ۔

سید جلال الدین عمری کے الفاظ میں "ایک بات یہ بھی ہے کہ مغرب میں کلیسا اور اس کے زیر اثر برسراقتدار طبقہ نے انسان کی آزادیِ فکر و عمل اور اس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کیا جس کا صحیح مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے ردِّ عمل میں حقوق انسانی کا موجودہ تصور ابھرا۔ اس میں مذہب کے حقیقی رول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر دنیا کے مختلف گوشوں میں اور مختلف زمانوں میں آئے ان کی کیا تعلیمات تھیں ، ان کو جب اقتدار ملا تو ان کا کیا رویہ رہا اور انسانیت کس طرح فلاح سے ہم کنار ہوئی ہے؟ یہ چیز کہیں زیر بحث نہیں آتی۔ جیسے یہ طے کر لیا گیا ہو کہ مذہب سے ہٹ کر یا مذہب کو نظر انداز کر کے گفتگو کی جائے گی۔ اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی معروضی یا غیر جانب دارانہ مطالعہ ہے، صاف بات ہے کہ یہ جانب دارانہ مطالعہ ہے۔ جس میں پہلے سے طے کر لیا گیا ہے کہ مذہب کا حقیقی کر دار زیر بحث نہیں آئے گا، بلکہ اسے نظر انداز کیا جائے گا"[1]۔

[1]سید جلال الدین،عمری،اسلام اور انسانی حقوق(لیکچر،نومبر2004ء)،ص3

فصل پنجم
"عالمی منشور برائے انسانی حقوق 1948ء" اور سیرت نبویہ علی صاحبہاالصلاۃ والسلام کی مشترکات

اگر عالمی منشور برائے انسانی حقوق پر نظر دوڑائی جائے تو اس سے تین اصول نکلتے ہیں۔
1. عدل وانصاف 2. مساوات 3. فرد کی آزادی
قانون کے ماہرین کے نزدیک یہ اس اعلانیے کی بنیادی خصوصیات ہیں ۔ اگر یہ تینوں چیزیں انسان کو مل جائیں تو اس کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں۔
سیرت طیبہ میں بھی انسان کے حقوق میں یہ تینوں حقوق شامل ہیں۔عالمی منشور برائے انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات میں مشترکات بھی ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے تو بے

جا نہ ہوتاکہ بنیادی طور پر حقوق کے حوالے سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے
صرف" تعین" کا فرق ہے ۔حقوق میں کوئی "تفاوت" نہیں ہے لیکن اس کی تفصیل ا ورتشریح میں "فرق "ہے۔سیرت طیبہ/اسلامی تعلیمات میں اِن تینوں حقوق کے بارے میں تفصیل یہ ہے۔

1. عدل وانصاف

قرآن کریم کی آیت ہے" إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ[1] ": بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ کے اسماءالحسنیٰ میں بھی ایک اسم"عَادِل" ہے، عدل کرنے والے۔نبی علیہ السلامکے اسماء مبارکہ میں بھی ایک اسم مبارک"عَادِل"ہے یعنی نبی علیہ السلام بھی عدل کے پیکر تھے، عدل کرنے والے تھے۔

" عدل " کہتے ہیں ہر چیز کا حق ادا کرنا۔اس کے مقابلے میں" ظلم "کا لفظ آتا ہے۔ ظلم کہتے ہیں کسی کے ساتھ ناحق سلوک کرنے کو، کسی کے حق کو ضبط کرنا یا کسی کا حق دوسرے کو دے دینا۔ لغوی اصطلاح میں " الظلم وضع الشيء في غير محله[2]" کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے بجائے کسی دوسری جگہ پر رکھنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ :" عدل " ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کو کہاجاتا ہے۔اب جب کہ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ السلام کے اسمائے گرامی "عادل "ہیں تو لازمی بات ہے کہ وہ(اللہ اور رسول) جس دین کی طرف لوگوں کو بلائیں گے وہ بھی "عدل"والا دین ہوگا۔ اس وجہ سے اسلام نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ عدل کرو اور ظلم سے بچو۔ عدل اور ظلم کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے ۔

اس معاملہ میں خودنبی علیہ السلام کی سنت مبارکہ کیا تھی؟ مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی علیہ السلام تشریف فرما تھے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس لگی ہوئی تھی، ایک صحابی رضی اللہ عنہ آکر بیٹھے جنہوں نے جسم پر صرف ایک ہی چادر باندھی ہوئی تھی اور ان کی کمر ننگی تھی۔ اس زمانے میں دو چادریں کم ہی لوگوں کو میسر ہوتی تھیں، زیادہ تر لوگوں کے پاس جسم ڈھانپنے کے لیے صرف ایک ہی چادر ہوا کرتی تھی۔ آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک ٹہنی تھی آپ نے بیٹھے بیٹھے بے تکلفی سے ان صحابی رضی اللہ عنہ کی ننگی کمر پر چھڑی مار دی۔ آپ کا ہاتھ ذرا سخت لگ گیا اور صحابیکی کمر پر خراشیں آگئی۔ صحابیؓ کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! آپ نے مجھے چھڑی ماری ہے میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ آج کے زمانے میں تو سربراہ مملکت کو عدالت میں ویسے بھی نہیں طلب کیا جا سکتا اور جہاں طلب کیا جا سکتا ہے وہاں بھی حکومتی اثر و رسوخ عدالتی کاروائی میں آڑے آجاتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہ ہو یا سربراہِ مملکت جب تک وہ اپنے منصب پر فائز رہتا ہے عدالت میں طلبی سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی بات حضورؐ کی مجلس میں بھی کہی جا سکتی تھی کہ بھئی حضور سے بدلے کا حق مانگنے کی یہ جسارت تم نے کیسے کی! حضورؐ سے بڑا وی آئی پی اس دنیا میں کون ہوگا؟ لیکن جناب نبی کریمؐ نے صحابی کے مطالبے پر کیا رد عمل ظاہر کیا؟ آپ نے چھڑی ان صحابی کے ہاتھ میں دے کر اپنی کمر سامنے کر دی، آپؐ نے اس بارے میں کوئی عذر پیش نہیں کیا اور کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور میں حاکمِ وقت ہوں اس لیے کوئی مجھ سے بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ کوئی بات بھی امتیاز کی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ

---

[1] النحل90:16

[2] عبد رب النبی،الاحمد،قاضی،النکری،دستور العلماء او جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون،ج2،ص208،دار کتب العلمیہ،بیروت،1421ھ

میں نہیں تھی۔ ان صاحب نے چھڑی پکڑی اور کہا کہ یا رسول اللہ! بدلہ برابر نہیں ہے اس لیے کہ آپ نے میری ننگی کمر پر چھڑی ماری ہے جبکہ آپ نے کرتا پہن رکھا ہے، آپ□ پہلے اپنا کرتا اتاریے۔ ہم تو آج کے ماحول میں اپنے پیر و مرشد کے لیے، اپنے استاد کے لیے ایسی بات برداشت نہیں کرتے۔ حضور □ مسکرائے ،کرتا اتارا اور کمر سامنے کر دی، ان صحابیؓ نے چھڑی پھینکی اور حضور □سے لپٹ گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! وہ ہاتھ ٹوٹ نہ جائیں جو آپ پر اٹھیں، میں تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے جسم سے جسم ملانے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن جناب نبی کریم□ نے عدل کا تقاضا پورا کیا اور یہ تصور دیا کہ قانون کی نظر میں انصاف سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔[1]

اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ بہترین صفاتِ جتنی بھی ہیں، رسول کریم □ کی ذات بابرکت پوری دنیا میں ان صفات کے سب سے بڑے مظہر ہیں،اور" عدل " کےحوالے سے بھی آپ □،اللہ تعالی کی تمام مخلوقات میں سب سے بڑے عادل ہیں۔ایک روایت میں آتا ہے:

"سیدنا عبداللہ بن زید[2] رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:کہ غزوۂ حنین کے موقع(پر غنیمت کا بہت زیادہ مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا،جس میں بکریاں، اونٹ، سونا، چاندی اور دیگر بہت سا سامان تھا۔ نبی علیہ السلامنے یہ مال تمام مجاہدین میں تقسیم کیا لیکن جو) نئے نئے مسلمان ہونے والے عرب قبیلوں کے سردار تھے ان کو زیادہ دیاسیدنا اقرع بن حابس اور عیینہ رضی اللہ عنہما کو سو سو اونٹ دئیے۔ اس پر ایک آدمی(ذوالخویصرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منافقین میں سے تھا اس) نے اعتراض کر دیا۔ کہ اللہ کی قسم اس تقسیم میں تو عدل کا لحاظ اور اللہ کی رضا کا لحاظ نہیں رکھا گیا،راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اللہ کی قسم ،تمہاری یہ بات میں نبی علیہ السلام کو ضروربتاؤں گاپھر میں آیا اورآپ□ کو وہ بات بتادی۔یہ سنتے ہی آپ□کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا اور فرمایا"اگر اللہ اور اس کارسول عدل نہیں کرے گا تو "اور"کون کرے گا؟"[3]

مسلم شریف کی دوسری روایت میں اس شخص کانام صراحت کے ساتھ آیا ہےجیسا کہ:

"سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی علیہ السلام کے پاس تھے اورآپ □ کچھ بانٹ رہے تھے کہ بنی تمیم کا ایک شخص ذوالخویصرہ آیا اور اُس نے کہا اے اللہ کے رسول! عدل کرہ۔نبی علیہ السلام نے (ناگواری محسوس کرتے ہوئے)فرمایا تیرے لیے خرابی ہو جب میں عدل نہ کروں گا تو کون کرے گا؟"[4]

حالانکہ رسول ا للہ □ نے امت کی ضرورت کے پیش نظر ایک خاص مصلحت کے تحت اس قسم کی تقسیم فرمائی تھی۔ اور یہی اسلام کا عقیدہ ہے کہ نبی علیہ السلاممخلوقات میں سب سے زیادہ عدل کرنے والے ہیں۔آپ□ نے عدل اور ظلم کا تقابل بہت وسیع مفہوم میں بیان فرمایا ہے۔

عدل کی چند اقسام ہیں اور سب کے بارے میں سیرت مطہرہ کی ہدایات موجود ہیں۔

---

[1] طبرانی،معجم الکبیر ،ج3،ص101،رقم2610

[2] عبداللہ بن زید بن عاصم بن کعب المازنی رضی اللہ عنہ۔ابن ام عمارہ سے مشہور ہیں۔وضوء کے حدیث کے راوی ہے۔آپ ہی نے مسیلمہ کومارا تھا۔63ھ کو حرہ کے دن شہید ہوئے۔سیر اعلام النبلاء۔ج2،ص378،377

[3] مسلم،کتاب الزکوۃ،باب اعطاءالمؤلفۃ قلوبهم علی الاسلام،رقم:2494

[4] مسلم،کتاب الزکوۃ،باب اعطاءالمؤلفۃ قلوبهم علی الاسلام،رقم:2495

1-اللہ جل شانہ کے ساتھ عدل 2-انبیاء کے ساتھ عدل

3-قانون کے ساتھ عدل

4-اپنی ذات کے ساتھ عدل 5-اہل و عیال کے ساتھ عدل

1-اللہ جل شانہ کے ساتھ عدل: اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ بھی"عدل" کرے اور" ظلم "نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ "ظلم" کا معنٰی یہ نہیں ہے جو ہم عام حالات میں ظلم کا لیتے ہیں یعنی کسی کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی کرنالیکن سیرت مبارکہ میں اسے ایک وسیع مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جو اللہ جل شانہ کے اس ارشاد میں ہے:

"جنہوں نے ایمان لاکر اپنے ایمان کو ظلم سے بچاکے رکھا اُن کے لیے امن ہی ہے اورہدایت یافتہ بھی یہی لوگ ہیں"[1]

یعنی آدمی کے "ایمان" کے ساتھ اگر ظلم خلط ملط ہوگیا تو پھر "ایمان" اور" ہدایت"کہاں ملی؟اس کے مقابلے میں اگر ایمان کے ساتھ" ظلم" کا خلط ملط نہیں ہوا تو پھر "ایمان"معتبر ہے۔یعنی ایمان کی قبولیت کے لیے شرط یہ قرار پائی کہ ایمان کے ساتھ ظلم شامل نہ ہو ۔روایات میں آتا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہوگئے کہ یہ تو بہت کڑی شرط ہے، کیونکہ ان کے خیال میں" ظلم" کا مفہوم وہ تھا جو عام اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اُن کے خیال میں اس آیت مبارکہ سے گھر کے افراد ، رشتہ داروں ، دوست احباب سے اور عام زندگی کے معاملات میں کمی بیشی مراد ہے۔ کیونکہ چھوٹی موٹی زیادتی(جانے یا اَن جانے) میں تو ہر انسان سے ہوسکتی ہے۔ اس وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ اگر اس آیت سے مراد آپس کے حقوق میں کمی بیشی "امن اور ہدایت"کی شرط قرار پائی ہے تو پھر کسی کا بھی ایمان قبول نہیں ہوگا۔چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں اکٹھے ہوئے اور چہ میگوئیاں ہوئیں، پھرآکر حاضر خدمت ہوئے اورعرض کرنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! ہم تو مارے گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا ہوا؟ صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے متعلق بتایا کہ ایمان کی قبولیت کی بہت سخت شرط لگ گئی ہےاور کہا کہ" ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہو جاتی؟"۔ آپ اور دیگر تمام انبیاء کرام تو معصوم ہوتے ہیں لیکن ہم عام انسانوں سے معاملات میں کہیں نہ کہیں کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ آیت میں "ظلم "سے مراد اللہ تعالی کے ساتھ شرک ہے،جیسا کہ بخاری کی روایت ہے کہ:

"عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ ،جب سورۃ الانعام کی یہ آیت اتری "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں گناہوں کی آمیزش نہیں کی" تو آپ ﷺ کے اصحاب نے کہا یا رسول اللہ ! یہ تو بہت ہی مشکل ہے ۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا ۔ تب اللہ پاک نے سورۃ لقمان کی یہ آیت اتاری " إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ[2]" بے شک شرک بڑا ظلم ہے"[1]

---

[1] الانعام82:6

[2] لقمان13:31

ظلم کی مختلف اقسام ہیں جن میں ایک قسم م یہ بھی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے کچھ زیادتی کرے لیکن اس سے بڑھ کر ظلم وہ ہے جو خالقِ کائنات سے کیا جائے۔ دنیا میں کسی بھی انسان کا حق مارنا تو" ظلم" ہے ہی، لیکن اللہ جل شانہ کا حق مارنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ اس کی روشنی میں آیت کا ترجمہ ہے:

" جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو شامل نہ ہونے دیا تو ان کا ایمان قبول ہوگا اور وہ ہدایت پر ہوں گے"

توحید کو "عدل" بھی کہا جاتاہے۔اس وجہ سے معتزلہ[2]اپنے آپ کو" اہل العدل والتوحید" کہتے تھے۔ توحید کا معنٰی ہے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔

2۔انبیاء کے ساتھ عدل: اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ نے تمام حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰات والتسلیمات کے درجات میں کچھ نہ کچھ ترجیحات مقررفرمائی ہیں۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے:

"یہ رسول ، ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن سے اللہ نے گفتگو فرمائی اور بعض کے (دوسرے امور میں) مرتبے بلند کئے۔ اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے ان کو مدد دی"[3]

قرآن وحدیث کی تعلیمات میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں سب سے افضل نبی علیہ السلامکی ذاتِ مبارک ہے، پھر اُن کے بعد دیگر بڑے انبیاء جیسے سیدناابراہیم، سیدنا موسٰی، سیدنا عیسٰی، سیدنا نوح علیہم السلام اور ان کے بعد دوسرے انبیاء و رسل ہیں۔ واضح رہے کہ یہ درجہ بندی ترازو پر تولنے کے لیے نہیں ہے کہ یہ معلوم کرنا شروع کیا جائے کہ کون سا پیغمبر کتنا بڑا ہے اور کونسا کتنا چھوٹا۔ یعنی "تقابل"مقصود نہیں ۔کہ ہم عدالت لگاکر انبیاء کرام علیہم السلام کے اونچ نیچ کے فیصلے شروع کردیں ۔جیسا کہ بسا اوقات بعض لوگوں کے قلموں اور زبانوں سے مختلف انداز میں کچھ نہ کچھ اظہار ہوہی جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے اس قسم کے امور سے ہمیں منع کیا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں آتے ہیں:

"ابوہریرہ ؓ سے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ مجھے یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر بتائے"[4]

---

[1]بخاری ،کتاب الایمان،باب ظلم دون ظلم،رقم:32

[2]دوسری ہجری قمری کے آغاز میں واصل بن عطاء(80ھ-130ھ)نے مذہب اعتزال کی بنیاد رکھی۔اُس زمانے میں ارتکاب گناہ کبیرہ اور اس کے بارےمیں حکم دنیوی اوراخروی کا مسئلہ مورد بحث تھا،خوارج نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور حسن بصری رحمہ اللہ نے منافق قرار دیاتھا جبکہ مرجئہ اُنہیں بدستور مومن سمجھتے تھےاس درمیان واصل بن عطاء نے جو حسن بصری رحمہ اللہ کے شاگرد تھے ایک نیا نظریہ اپنایا،کہ مرتکبِ گناہ کبیرہ نہ مومن ہے اور نہ ہی کافر۔اس نظرئے کی"منزلہ بین المنزلتین"کے نام سے شہرت ہوئی اور واصل بن عطاء نے اس نظریے کے اعلان کے بعد اپنے استاد حسن بصری کے درس سے کنارہ کشی اختیار کی جس کی وجہ سے اُن کے پیرو"معتزلہ"کے طور پر پہچانے جانے لگے۔محمدبن عبدالکریم، شہرستانی، الملل والنحل،ج1،ص153،دارالمعرفۃ،بیروت،1404ھ

[3]البقرۃ2:253

[4] بخاری،کتاب التفسیر،باب‌ویونس ولوطا وکلا فضلنا علی العالمین،رقم:4631

اس کا واقعہ یوں ہوا کہ دو ساتھیوں میں انبیاء کرام کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی کہ فلاں موقع پرسیدنا یونس علیہ السلام تھے اس لیے ایسا ہوا اگر ہمارے نبی علیہ السلام ہوتے تو معاملہ یوں نہ ہوتا بلکہ مختلف ہوتا۔آپ □ کوجب اُن کی یہ بات پہنچی تو آپ□ نے ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت مت دو۔ یعنی آپ □ کامطلب یہ تھا کہ مجھے دوسرے انبیاء پر اس طرح فضیلت مت دو کہ جس سے دوسرے انبیاء کرام کی تنقیص لازم آئے ۔

تاہم ترجیح کی اجازت ہے کہ نبی علیہ السلام کا درجہ سب انبیاء سے افضل ہے لیکن"بیانِ فضیلت"اس اندازسے نہ ہو کہ جس سے دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی اہانت یا کمی کا پہلو سامنے آجائے کیونکہ یہ بہت بڑا نازک مرحلہ ہے کہ اس میں ایمان جاتے رہنے کاقوی خطرہ ہے ۔

مدینہ منورہ میں مسلمان اور یہودی اکٹھے رہتے تھے ا س دور میں ایک واقعہ پیش آیا جیسا کہ حدیث میں ہے:

> "ابو سعید خدری ؓسے ، انہوں نے کہا یہود میں سے ایک شخص نبی علیہ السلام کے پاس آیا ، اس کو کسی نے طمانچہ لگایا تھا ۔ کہنے لگا : اے محمد ! (□) تمہارے اصحاب میں سے ایک انصاری شخص نے مجھ کو طمانچہ مارا ۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا اس کو بلاؤ تو انہوں نے بلایا (وہ حاضر ہوا) آپ نے پوچھا تو نے اس کے منہ پر طمانچہ کیوں مارا ۔ وہ کہنے لگا : یا رسول اللہ ! ایسا ہوا کہ میں یہودیوں کے پاس سے گزرا ، میں نے سنا یہ یہودی یوں قسم کھا رہا تھا قسم اس رب کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو سارے آدمیوں میں سے چن لیا ۔ میں نے کہا کیا محمد □ سے بھی وہ افضل ہیں ؟ اور اس وقت مجھے غصہ آ گیا ۔ میں نے ایک طمانچہ لگا دیا (غصے میں یہ خطا مجھ سے ہو گئی) آپ □ نے فرمایا (دیکھو خیال رکھو) اور پیغمبروں پر مجھ کو فضیلت نہ دو قیامت کے دن ایسا ہو گا سب لوگ (ہیبت اللہوندی سے) بیہوش ہو جائیں گے پھر میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا ۔ کیا دیکھوں گا موسیٰ علیہ السلام (مجھ سے بھی پہلے) عرش کا ایک کونہ تھامے کھڑے ہیں ۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے یا کوہ طور پر جو (دنیا میں) بیہوش ہو چکے تھے اس کے بدل وہ آخرت میں بیہوش ہی نہ ہوں گے"[1]

اصل واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ایک یہودی اور مسلمان بازار میں آپس میں جھگڑ پڑے، دونوں آپس میں کوئی سودا کر رہے تھے کہ یہودی نے یہ کہہ کر قسم اٹھائی: اس رب کی قسم جس نے سیدنا موسٰی (علیہ السلام)کوتمام انبیاء پر فضیلت دی۔ یہ سنتے ہی مسلمان کو غصہ آیااوریہودی کو تھپڑ مار دیا ۔ پھر اُس مسلمان نے یہودی سے کہا کہ تمام انبیاء پر فضیلت تونبی علیہ السلامکو ہے۔ اس پر یہودی استغاثہ لے کرآپ□ کی خدمت میں آیا اورکہا یا

---

[1]بخاری،کتاب الدیات،باب اذا لطم المسلم یهودیا عند الغضب، رقم:6917

محمد! ایک مسلمان نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ نبی علیہ السلام نے پوچھا کیوں تھپڑ مارا ہے؟
اس نے معاملہ بتایا تو اس پر آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا : تقابل کی فضا قائم کر کے ہم انبیاء کا موازنہ مت کرو۔ نبی علیہ السلام نے اسے بھی عدل کا تقاضا قرار دیا۔نبی علیہ السلامکی تعلیمات یہ ہیں کہ" حق "متعین کرنے میں کسی کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ قرآن و حدیث میں عدل کے سینکڑوں پہلو بیان ہوئے ہیں ۔

3۔قانون کے ساتھ عدل: دنیا میں "عالمی منشور" کی روشنی میں ہر جگہ یہ بات کی جاتی ہے کہ قانون کی نظر میں سب انسانوں کے حقوق برابر ہونے چاہییں، لیکن عملا اس بات کے نفاذ میں بہت زیادہ چشم پوشی سے کام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں یہ بات بھی عدل کے تقاضوں میں سے ہے۔ نبی علیہ السلام کی سیرت مبارک میں واضح طور پر موجود ہے کہ آ ن کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔اس حوالے سے ایک دفعہ ایک یہودی جوڑے نے "زنا"کیا تو اُن کو سزا دینے کے حوالے سے اُ ن کی کتاب کے مطابق عمل فرمایا، بخاری شریف کی روایت ہے:

> "عبداللہ بن عمررضی اللہ عنہماسے مروی ہے کہ یہود ، نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو بتایا کہ ان کے یہاں ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کیا ہے ۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ رجم کے بارے میں تورات میں کیا حکم ہے ؟ وہ بولے یہ کہ ہم انہیں رسوا کریں اور انہیں کوڑے لگائے جائیں ۔ اس پر عبداللہ بن سلام[1] رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم لوگ جھوٹے ہو ۔ تورات میں رجم کا حکم موجود ہے ۔ تورات لاؤ ۔ پھر یہودی تورات لائے اور اسے کھولا ۔ لیکن رجم سے متعلق جو آیت تھی اسے ایک یہودی نے اپنے ہاتھ سے چھپا لیا اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کی عبارت پڑھنے لگا ۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ذرا اپنا ہاتھ تو اٹھاؤ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو وہاں آیت رجم موجود تھی ۔ اب وہ سب کہنے لگے کہ اے محمد ! عبداللہ بن سلام نے سچ کہا ۔ بے شک تورات میں رجم کی آیت موجود ہے ۔ چنانچہ آپ کے حکم سے ان دونوں کو رجم کیا گیا ۔ عبداللہ بن عمر ؓ نے بیان کیا کہ میں نے رجم کے وقت دیکھا ۔ یہودی مرد اس عورت پر جھکا پڑتا تھا ۔ اس کو پتھروں کی مار سے بچاتا تھا "[2]

سیدنا عبد اللہبن سلام رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ یا رسول اللہ! تورات میں اس جرم کی اصل سزا تو رجم ہی تھی لیکن جوں جوں زمانہ بدلا یہودی علماء نے اس سزا کے اطلاق میں خیانت کرنا شروع کر دی کہ جب کوئی غریب آدمی اس جرم میں پکڑا جاتا تو اسے سنگسار کر دیتے لیکن کوئی امیر اور صاحب ثروت آدمی پکڑا جاتا تو اس کو نرم سی سزا دے کر خانہ پری کر دیتے۔

---

[1] عبداللہ بن سلام بن حارث،اسرائیلی رضی اللہ عنہ۔اُن کے نام حصین تھے نبی علیہ السلام نے عبداللہ رکھ دیا۔تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔انصار کے حلیف تھے۔آپ کے خواص میں سے تھے۔دنیا میں اُنہیں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی۔بیت المقدس کے فتح کے وقت آپ رضی اللہ عنہ موجود تھے۔سیر اعلام النبلاء2/413-415

[2] بخاری،کتاب المناقب،باب قول اللہ توالی :یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم وان فریقا منہم لیکتمون الحق و ہم یعلمون، رقم:3635

جبکہ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ نبی علیہ السلام کے اہل وعیال اور عام مسلمان سبھی قانون کی نظر میں برابرتھے ۔ایک عورت کی چوری کے موقع پر جب آپ کو سفارش کی گئی تو آپ نے منظور نہیں فرمایا اور کھلی عدالت میں اس کی سماعت فرماتے ہوئے فیصلہ صادر فرمایا، جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ:

> "سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک مخزومی عورت کا معاملہ جس نے چوری کی تھی، قریش کے لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلامسے اس معاملہ میں کون بات کر سکتا ہے اسامہ رضی اللہ عنہ کے سوا، جو نبی علیہ السلامکو بہت پیارے ہیں اور کوئی آپ سے سفارش کی ہمت نہیں کر سکتا؟ چنانچہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلامسے بات کی تو نبی علیہ السلامنے فرمایا ”کیا تم اللہ کی حدوں میں سفارش کرنے آئے ہو۔“پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا اور فرمایا ”اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس لیے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کمزور چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے تھے اور اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنتمحمد نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد)صلی اللہ علیہ وسلم (اس کا ہاتھ ضرور کاٹ ڈالتے۔ اس کے بعد نبی علیہ السلامنے اس عورت کے لیے حکم دیا اور ان کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر اس عورت نے صدق دل سے توبہ کر لی اور شادی بھی کر لی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ بعد میں وہ میرے یہاں آتی تھیں۔ ان کو اور کوئی ضرورت ہوتی تو میں نبی علیہ السلامکے سامنے پیش کر دیتی"[1]

اس کے مقابلے میں سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق یہودیوں کا یہ طرز عمل تھا کہ عام آدمی کے لیے سزااور اثر و رسوخ والوں کے لیے سزا میں ترمیم کر دی جاتی تھی۔نبی علیہ السلامنے ایک بات فرمائی جو کہ کسی بھی معاشرے میں انصاف کی بنیاد ہے۔ کہ جب کسی قوم میں عام آدمی کی سزا مختلف اور بڑے آدمی کی سزا مختلف ہو، تو پھر وہ قوم تباہ وبرباد ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ کسی بھی قوم کی تباہی کا آغازاُس وقت ہوتا ہے جب اُن کے قانون میں اونچ نیچ کا تصور شروع ہو جائے ۔

4۔اپنی ذات کے ساتھ عدل:اسلام ایک آفاقی نظام ہے جس میں ہر کسی کےحقوق مقرر ہیں یہاں تک کہ اپنی ذات کے حقوق بھی مقرر ہیں جس میں عدل وانصاف کاحکم دیا گیا ہے۔نبی علیہ السلامکے فرمان کے مطابق اپنے نفس کے ساتھ بھی عدل کا حکم ہے۔کیونکہ بہت سی روایات میں ہیں کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے اپنے ساتھ سختی کا ارادہ کیا تونبی علیہ السلام نے باقاعدہ اس سے منع فرمایا۔جیسا کہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سیدنا ابوالدرداءرضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان ٹھہرے تو دیکھا کہ ان کے میزبان رات کو حسب ضرورت آرام کرنے اور اپنے گھر والوں کو وقت دینے کے بجائے

---

[1]بخاری،کتاب الحدود،باب کراهیۃ الشفاعۃ فی الحد اذا رفع الی السلطان،رقم:6788،4304،مسلم،کتاب الحدود،باب قطع السارق الشریف وغیرہ والنهی عن الشفاعۃ،رقم:4506

ساری رات نماز میں کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں۔ اس پر سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا"کہ تیرے رب کے بھی تجھ پر حق ہیں، تمہارے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، آنے جانے والے مہمانوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔نبی علیہ السلام کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ" سلمان"نے سچ بات کہی۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہمانے ارادہ کر لیا کہ ساری زندگی رات کو جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کروں گا اور ساری زندگی روزانہ ایک قرآن کریم پڑھوں گا۔ نبی علیہ السلام نے اس سے منع فرمایا کہ یہ اپنے اوپر ظلم ہے۔ تمہارے بدن کا تجھ پر حق ہے کہ اسے خوراک اور آرام دو، اور تمہاری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے کہ اسے نیند دو۔ چنانچہ اپنے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔روایت میں عبداللہ بن عمرو ؓ کا واقعہ اس بارے میں آتا ہےجو دن کو روزہ اور ساری رات تہجد پڑھتے تھے۔[2]

دوسری روایت میں ہے کہ:

> "انس بن مالک نے بیان کیا کہ تین حضرات،نبی علیہ السلامکی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آپ کی عبادت کے متعلق پوچھنے آئے، جب انہیں نبی علیہ السلامکا عمل بتایا گیا تو جیسے انہوں نے اسے کم سمجھا اور کہا کہ ہمارا نبی علیہ السلامسے کیا مقابلہ! آپ کی تو تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ آج سے میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے سے رہوں گا اور کبھی ناغہ نہیں ہونے دوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے جدائی اختیار کر لوں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ پھر نبی علیہ السلامتشریف لائے اور ان سے پوچھا کیا تم نے ہی یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ رب العالمین سے میں تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ میں تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں لیکن میں اگر روزے رکھتا ہوں تو افطار بھی کرتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں)رات میں(اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔" فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي"میرے طریقے سے جس نے بے رغبتی کی وہ مجھ میں سے نہیں ہے"[3]

5۔اہل وعیال کے ساتھ عدل:اہل وعیال بھی چونکہ انسانی معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے اور انسانی ضرورت ہے اس وجہ سے اہل وعیال کے ساتھ بھی عدل کا حکم دیا گیا ہے۔سیرت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خونبی علیہ السلام نے بھی اپنے گھر میں عدل برقرارفرمایاتھا۔ آپ کی بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں تھیں جن کے حقوق کے بارے میننبی علیہ السلام نے"عدل" کی بنیاد پر برابری فرمائی تھی۔چونکہ طبعی اُنس کسی بھی انسان

---

[1]بخاری،کتاب الصوم،باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع،رقم:1968

[2]بخاری،کتاب الصوم،باب حق الجسم فی الصوم،رقم:1975

[3]بخاری،کتاب النکاح،باب الترغیب فی النکاح،رقم:5063

کے اختیار میں نہیں ہے، اس وجہ سے جہاں آپ□ نے دیکھا کہ یہ معاملہ ان کے اختیار میں نہیں ہے تو وہاں فرما یا۔" اے اللہ ! اپنی استطاعت کی حد تک میں برابر تقسیم کرتا ہوں، اس لیے جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس میں میرا مواخذہ نہ کرنا(یعنی دل)"[1]

آپ□کا طبعی میلان سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہاکی طرف زیادہ تھا لیکن ظاہری معاملات کی تقسیم تمام ازواج کے ساتھ برابر کی تھی، حتیٰ کہ جہاں ضرورت محسوس ہوتی وہاں اجازت لیتے تھے۔ مرض وفات کے علاوہ ایام میں تو آپ□ نے ازواج کے گھروں میں رات گزارنے کی باریاں مقرر کی ہوئی تھیں لیکن مرض وفات میںنبی علیہ السلام کا یہ معمول قابل عمل نہ رہا۔چنانچہ آپ □ کے لیے ایک مناسب اور مستقل جگہ ٹھہرنے کے بارے میں اور آپ □کی طبیعت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام ازواج نے مشورہ کیا اور پھرآپ □ کو اس بات کی اجازت دی کہ: ہم اپنی باریوں کے دنوں سے دستبردار ہوتی ہیں تاکہ آپ(□) ایک ہی گھر میں اطمینان سے وقت گزار سکیں۔ پھر نبی علیہ السلامنے اپنے آخری ایام بیماری کی حالت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں گزارے۔ حتیٰ کہ آپ□ دعا فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ ! جو میرے اختیار میں ہے ان میں تو میں برابر تقسیم کرتا ہوں لیکن جو چیز میرے اختیار میں نہیں ہے، جیسے طبعی میلان، یا اللہ ! مجھ سے اس کے بارے میں مواخذہ نہ کرنا۔

بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے خود اُن سے اجازت مانگی تھی :

> " سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ، جب نبی علیہ السلام کی بیماری بڑھی اور تکلیف شدید ہو گئی تو آپ □ نے اپنی بیویوں سے میرے گھر میں ایام مرض گزارنے کی اجازت چاہی اور آپ □ کو بیویوں نے اجازت دے دی تو آپ اس طرح تشریف لائے کہ دونوں قدم زمین پر رگڑ کھا رہے تھے ۔ آپ اس وقت عباس (رضی اللہ عنہ) اور ایک اور صاحب کے درمیان تھے"[2]

اہل وعیال کے بارے میں قرآن کریم نے ایک طرف تو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہےتو دوسری طرف یہ شرط بھی لگائی ہے:

> " ان(یتیم عورتوں) کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کرلو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بےانصافی سے بچ جاؤ"۔[3]

جیسا کہ عدل کا معنٰی ہے تمام معاملات میں برابری کرنا، اور ایک سے زائد بیویوں کے ہوتے وقت ہر بیوی کو اس کا پورا حق ادا کرنا اور کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دینا۔

حدیث شریف میں ہے :"کہ اگر کسی کے دو بیویاں ہو اور صرف ایک کے طرف مائل ہوکر(دوسرے کو معلق کر دیا یعنی

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی القسم بین النساء،رقم:2136
[2]بخاری،کتاب الہبۃ وفضلہا والتحریض علیہا،باب الاشہاد فی الہبۃ،رقم:2588
[3]النساء3:3

اس کے حقوق ادا کرنے بند کر دیے) تو قیامت کے دن اس کے
جسم کا ایک حصہ مفلوج ہوگا"[1]،[2]

اہل وعیال کے حقوق میں بیوی/بیویوں کا معاملہ صرف ازدواجی تعلقات تک محدودنہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ روز مرہ زندگی کے باقی حقوق بھی شامل ہیں،جیسے خرچے اور کھانے پینے ،رہائش اور عزت وتوہین میں کمی بیشی کر دینا کہ ایک بیوی کو بہتر دیا اور دوسری کو اس کے برابر نہیں دیا، یا ایک کو تو اچھی رہائش دی لیکن دوسری کو اس معیار کی رہائش نہیں دی، یا ایک کی عزت و وقار کا لحاظ زیادہ رکھا گیا ،اور دوسری سے بے پرواہی برتری گئی ۔ خلاصہ یہ کہ اسلام اُن کے حقوق میں روز مرہ زندگی کی تمام ضروریات شامل کرتاہے۔اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہے کہ تم اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر زیادہ نکاح نہیں کیا کرو بلکہ ایک بیوی تک ہی محدود رہو۔بالفاظِ دیگر ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت صرف اسی صورت میں ہے جب ایک آدمی سب بیویوں کے حقوق برابر ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو ۔ اگر آدمی یہ محسوس کرے کہ اس سے انصاف کا معاملہ نہیں ہو سکے گا بلکہ کسی ایک طرف جھکاؤ ہوگا تو پھر ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔ یہ میاں بیوی کے معاملے میں قرآن کریم اور نبی علیہ السلامکی تعلیم ہے کہ اتنا ہی معاملہ اپنے ذمے لو جتنا بخوبی نبھا سکتے ہو۔

اہل وعیال میں اولاد بھی داخل ہے۔اسلام اُن کے معاملے میں بھی عدل کا حکم دیتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے:

> "(ایک تابعیؒ فرماتے ہیں) میں نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ[3]سے سنا وہ منبر پر بیان کر رہے تھے کہ میرے باپ نے مجھے ایک عطیہ دیا ، تو عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا[4](نعمان کی والدہ) نے کہا کہ جب تک آپ نبی علیہ السلام کو اس پر گواہ نہ بنائیں میں راضی نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ (حاضر خدمت ہو کر) انہوں نے عرض کیا کہ عمرہ بنت رواحہ سے اپنے بیٹے کو میں نے ایک عطیہ دیا تو انہوں نے کہا کہ پہلے میں آپ کو اس پر گواہ بنا لوں ، آپ نے دریافت فرمایا کہ اسی جیسا عطیہ تم نے اپنی تمام اولاد کو دیا ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں ، اس پر آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد

---

[1]سنن ابو داؤد،کتاب النکاح،باب فی القسم بین النساء،رقم:2135

[2]قال الالبانی :هذا حديث صحيح،صحیح وضعیف سنن ابی داؤد،ج5،ص133

[3] نعمان بن بشير بن سعد بن ثعلبة،خزرجي،انصاري،أبو عبد الله،أمير ، خطيب، شاعر ،ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے آپ کی پیدائش ہوئی۔مدینے منورے کے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قمیص لے کر شام تشریف لے گئے ۔معرکہ "صفین "میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔دمشق کے قاضی مقرر ہوئے۔یمن اور کوفہ کے والی بھی رہے۔ یزید بن معاویہ کے وفات کے بعدسیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ سے بیعت ہوئے۔ اُن سے 124 احادیث مروی ہیں۔خالد بن خلی الکلاعی کے ہاتھوں 65ھ کو شہید ہوگئے۔الاعلام ،ج8،ص36

[4]عمرة بنت رواحہ بن امرئی القیس بن مالک ۔ماں کا نام کبشۃ بنت واقد بن عمرو۔سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے والدہ ماجدہ ہے۔نبی علیہ السلام سے اُن کی یہ روایت ہے: "وجب الخروج علی کل ذات نطاق"(خلیفہ بن خیاط،ابو عمرو،کتاب الطبقات،ج1 ص 135،رقم:3306،دارالفکر،بیروت،س نامعلوم

کے درمیان انصاف کو قائم رکھو ۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے اور ہدیہ واپس لے لیا"[1]

ایک دوسرا واقعہ بھی اس قسم کا ہے : ایک صحابی حاضر خدمت ہوئے اور کہاکہ یا رسول اللہ! میری اولاد میں سے ایک لڑکا ایک بیوی سے ہے جبکہ باقی دوسری بیویوں سے ہیں۔ میری بیوی تقاضا کر رہی ہے کہ میں اپنی جائیداد میں سے اپنے اس بیٹے کو حصہ دوں، میں اسے حصہ دینے پر تیار ہوں لیکن اس پر میں آپ(ﷺ) کو گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے پوچھا، کیا تم نے باقی بیٹوں کو بھی جائیداد میں سے حصہ دیا ہے؟ اس نے کہا، یا رسول اللہ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، ظلم پر مجھے گواہ مت بناؤ۔ چنانچہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اپنی جان کے ساتھ، اپنے گھر کے ساتھ، سوسائٹی کے ساتھ، جس کا جو حق ہے وہ اسے ادا کرو، عدل اسی کا نام ہے۔ اگر کہیں حق تلفی ہوئی تو یہ ظلم شمار ہوگا۔

2۔مساوات

"عالمی منشور" کی دوسری خصوصیت" مساوا ت" ہے جس سے متعلق احکام اور ہدایات بھی سیرت طیبہ میں کثرت سے موجود ہیں۔آج کی دنیا پر نظر دوڑانے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے پوری دنیا سے ایک "گاؤں"بنادیا ہے ۔ تہذیب وتمدن کے بلند وبالا دعوے کیے جارہے ہیں لیکن اس کے باوجو ووحشت،بربریت،حصول اقتدار کی ہوس،جبر وظلم اور تشدد روزبروز بڑھتا جارہاہے۔کیونکہ ہر طرف ذاتی مفاد،لوٹ کھسوٹ،دشمنی،لالچ اور منافرت نے ڈھیرے ڈال دئیے ہیں۔تمام تر اسبابِ عیش وآرام میسر ہونے کے باوجود پوری دنیااطمینانِ قلبی ،امن اور محبت سے یکسر خالی ہے۔دنیا کا المیہ یہ ہے کہ مسائل حل کرنے کے لیے ذہن اور عقل کو معیار ٹھہرایاجارہا ہے جو کہ ناقص ہے۔اگر آج بھی دنیا "رحمتِ عالم ﷺ" کوآئیڈئیل بناکر مسائل حل کرنے کی کوشش شروع کریں تو تمام تر مسائل حل ہو سکتے ہیں ،امن ومحبت کا دور دورہ ہو سکتا ہے ۔کیونکہ صرف آپ ﷺ ہی کی ذات مبارک ہے جو ہر شعبہ زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔جو عدل ومساوات،امن وسلامتی اور محبت والفت کا پیکر ہے۔جو مسلمانوں کے لیے نہیں،تمام عالم کے لیے رحمت بناکر بھیجا گیا ہے۔قرآن فرماتا ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعٰلَمِينَ "[2] "اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت (بنا کر) بھیجا ہے"

ظاہری وباطنی طور پر مکمل انسان،آپ ﷺ ہی کی ذات ہے۔جیسا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

"رسول اللہ(ﷺ)کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین اسوہ ہے"[3]

---

[1]بخاری،کتاب الہبۃ وفضلہا والتحریض علیہا ،باب الاشہاد فی الھبۃ،رقم:2587

[2]الانبیاء107:21

[3]الاحزاب21:33

نبی علیہ السلام کی صفات کے صرف مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم بھی قائل ہیں جو وقتا فوقتا اپنے خیالات میں اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو ،کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بھیجا ہے یہ اسوہ معاشرے کے کسی مخصوص فرد، یا مخصوص گروہ کے لئے محدودنہیں بلکہ یہ تحفہ پوری انسانیت کے لئے عطا کیا گیا ہے:

" وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا"[1]" ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے اور ڈرانےوالا بھیجا ہے"

مساوات کے علمبردار ہونے کی وجہ سے آج دشمن بھی آپ کے معترف ہیں۔ایک روایت میں ہے ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھاکہ:

"میں نے(عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی ا للہ عنہما سے)عرض کیا کہ نبی علیہ السلام کی جو صفات توریت میں آئی ہیں ان کے متعلق مجھے کچھ بتائیے ۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ! قسم اللہ کی ! آپ کی تورات میں بالکل بعض وہی صفات آئی ہیں جو قرآن شریف میں مذکور ہیں ۔ جیسے کہ “ اے نبی ! ہم نے تمہیں گواہ ، خوشخبری دینے والا ، ڈرانے والا ، اور ان پڑھ قوم کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے ۔ تم میرے بندے اور میرے رسول ہو ۔ میں نے تمہارا نام متوکل رکھا ہے ۔ تم نہ بدخو ہو ، نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں شور غل مچانے والے ، (اور تورات میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ) وہ (میرا بندہ اور رسول) برائی کا بدلہ برائی سے نہیں لے گا ۔ بلکہ معاف اور درگزر کرے گا ۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کی روح قبض نہیں کرے گا جب تک ٹیڑھی شریعت کو اس سے سیدھی نہ کرا لے ، یعنی لوگ " لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ " نہ کہنے لگیں اور اس کے ذریعہ وہ اندھی آنکھوں کو بینا ، بہرے کانوں کو شنوا اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو پردے کھول دے گا "غُلْف" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پردے میں ہو ۔" سَيْفٌ أَغْلَفُ وَقَوْسٌ غَلْفَاءُ "اسی سے ہے اور "رَجُلٌ أَغْلَفُ"اس شخص کو کہتے ہیں جس کا ختنہ نہ ہوا ہو"[2]

یعنی نبی علیہ السلام مطیع کو بشارت ، عاصی کو ڈرسناتے، بے خبروں کو پناہ دیتے۔اللہ کے بندے اور رسول جملہ کاروبار کو اللہ پر چھوڑدینے والے، نہ درشت خو، نہ سخت خو، نہ چیخ کر بولتے، بدی کابدلہ ویساہی نہ دیتے، معافی مانگنے والے کو معاف کردیتے، گنہگار کو بخش دیتے، ان کا کام مذہبوں کی کجی کو درست کردینا ہے۔ ان کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں، بہرے کوکان دیتی اور غافل دلوں کے پردے اٹھادیتی ہے۔ حضور ہر ایک خوبی سے آراستہ، جملہ اخلاق فاضلہ سے متصف، سکینہ ان کالباس، نکوئی ان کاشعار، تقویٰ ان کاضمیر، حکمت ان کا کلام اور عدل ان کی سیرت ہے۔ ان کی شریعت سراپاراستی، ان کی ملت اسلام اور ہدایت

---

[1] سبا28:34

[2] بخاری،کتاب البیوع،باب کراھیۃ السخب فی السوق،رقم:2125

ان کی رہنما ہے۔ وہ ضلالت کو اٹھانے والے، گم ناموں کو راہ دِکھا کر رفعت بخشنے والے، مجہولوں کو نام ور کرنے والے، قلت کو کثرت اور تنگ دستی کو غنا سے بدل دینے والے ہیں۔"

نبی علیہ السلام، جو محسن انسانیت ہے کی سیرت طیبہ یہ سبق دیتی ہے کہ معاشرہ کو سچی خوشی اور واقعی سکون سے منور کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ صلۂ رحمی کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"تم اپنے انساب کاعلم حاصل کرو، جس سے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرسکو کیوں کہ صلۂ رحمی گھروالوں سے محبت، مال میں زیادتی اور عمر میں اضافے کا سبب ہے"[1]

اور صلۂ رحمی کی وضاحت اس حدیث میں بیان ہوئی ہے:

" اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی اور جب اس سے فراغت ہوئی تو رحم نے عرض کیا کہ یہ اس شخص کی جگہ ہے جو قطع رحمی سے تیری پناہ مانگے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم اس پر راضی نہیں کہ میں اس سے جوڑوں گا جو تم سے اپنے آپ کو جوڑے اور اس سے توڑ لوں گا جو تم سے اپنے آپ کو توڑ لے ؟ رحم نے کہا کیوں نہیں ، اے رب ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پس یہ تجھ کو دیا ۔ نبی علیہ السلام نے اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہارا جی چاہے تو یہ آیت پڑھ لو:

"یعنی “ کچھ عجیب نہیں کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم ملک میں فساد برپا کرو اور رشتے ناطے توڑ ڈالو "[2]

مساوات کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے :پیکر امن وآتشی کی سلامتی کی تمثیل"میثاقِ مدینہ"ہے۔نبی علیہ السلام جب مدینے تشریف لائے تو وہاں کے مختلف قبائل و مذاہب سے ایک "معاہدہ" فرمایا جس کو تاریخ "میثاقِ مدینہ"کے نام جانتی ہے۔جس میں آپ نے چند معقول شرائط پر اُن سے معاہدہ فرمایا:

1۔مدینے کے تمام لوگ ایک ہی قوم کے افراد شمار کیے جائیں گے۔

2۔ہر کوئی اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوں گے۔

3۔دشمن کا مل کر مقابلہ کیا جائے گا۔

4۔ایک دوسرے سے تعاون کی فضا بنائی جائے گی۔

5۔تمام لوگوں کو برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

6۔مظلوم کی ہر حال میں امداد کی جائے گی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے نبی علیہ السلام نے فرمایا:لوگو!ہرمسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہے۔اپنے غلاموں کا خیال رکھو جوخود کھاتے ہو وہی اُن کو کھلاؤ جیسا خود پہنتے ہو ویسا اُن کو پہناؤ۔

---

[1]ترمذی،کتاب البر والصلۃ،باب تعلیم النسب،رقم:1979

[2]بخاری،کتاب الادب،باب من وصل وصلہ اللہ،رقم:5987

3۔فرد کی آزادی

اس منشور سے جو تیسری بات مترشح ہوتی ہے وہ"فرد کی آزادی" ہے جسے آج کی دنیا "کمال" سمجھتی ہے کہ ہم نے فرد کو آزادی ہے،جو اس سے پہلے کبھی نہیں دی گئی تھی لیکن یہ اُن کی خام خیالی ہے۔آزادی کاتصور آج سے صدیوں پہلے "اسلام"کا پیش کردہ ہے۔ جب انسانیت "غلامی،بردہ فروشی اور ذلت کی اتاہ گہرائیوں "میں زندگی گزار رہی تھی،جب انسان صرف مخصوص جنس(مرد)شمار کیا جاتا تھا، جب انسانیت کے صنف نازک لڑکیوں کا قتلِ عام معمول کی بات تھی ،تب اسلام روشنی کی کرن بن کر دنیا میں آیا۔جس نے انسان کو اُس کااصل مقام دیا،جس نے انسان(ماں) کے پاؤں تلے جنت بتلایا،جس نے انسان(باپ) کی رضا کو احکم الحاکمین کی رضا بتلایا،جس نےانسان(غلام)کی آزادی کاتصور دیا۔اور ساتھ ساتھ اس کی ترغیب بھی دی اور غلام آزاد کرنے کے بڑے فضائل بھی بیان کئے۔

تمام مخلوقات میں "انسان" ہی وہ واحد مخلوق ہے جو سب سے اہم اور حساس ہے اس وجہ سے اس کے تقاضے اور ضروریات بھی سب سے اہم ہیں۔ان تقاضوں میں ایک تقاضہ"آزادی" بھی ہے۔"نفس "کا ساتھ رہنے کی وجہ سے انسان ہر قسم کی آزادیوں کا خواہش مند ہوتا ہے اور "اظہاررائے"کے میدان میں وہ اور زیادہ اس "آزادی" کی خواہش رکھتا ہے۔لیکن دنیا کا بھی ایک قانون ہے کہ کوئی بھی "نظام" یا"قانون"تب چل سکتا ہے جس میں ہر چیز ایک محدود دائرے کے اندر ہو۔اس میں "اظہار رائے" بھی ہے۔آج کی دنیا میں"آزادئ اظہار رائے"کا مخصوص نعرہ "مغرب"کا پید اکردہ ہے۔ یہ صرف ایک پر فریب نعرہ ہے جس کا مقصدآزادی نہیں،"مذہب اور اللہ سے آزادی"ہے۔دنیا جس نعرے کو "آزادی" سمجھتی تھی وہ اصل میں"مذہب اور اللہ"کے تصورسے نجات حاصل کرنا تھا۔ حالانکہ انسان کی فضیلت تو اسی بات پر تھی کہ محدود دائرے میں اختیا ر رکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو"خالق اور اُس کے قانون"سے آزاد نہیں رکھے گا اور نہ ہی سمجھے گا۔ایسی آزادی پر تو "سزا" رکھی گئی ہے جبکہ ماننے کی صورت میں "جزا"کا تصور ہے۔ایسی آزادی کے مقابلے میں مغرب نے"جدیدیت" کا نعرہ لگایا اور آزادی کا مفہوم ہی بدل دیا۔بس انسان جو چاہے،جیسا چاہے اور جب چاہے ،سب کچھ کر سکتا ہے۔ہاں یہ بات ہے کہ کچھ نہ کچھ پابندیاں بھی ہیں لیکن وہ ناکافی ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے:ہرشخص اپنی رائے رکھنے میں آزادہوگا۔کوئی اس کے اِس حق میں مداخلت نہیں کرے گا،معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں کوئی بھی چیز اُس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی" لیکن پھر بھی اس منشور میں"آزادئی اظہار" کی حدود متعین کی گئی ہے۔مثلا دوسروں کی عزت،شہرت اور حقوق متصادم نہ ہو،قومی سلامتی،امن عامہ،صحت عامہ یااخلاقِ عامہ متاثرنہ ہو" ۔

اسلام میں آزادی:اسلام نے زندگی کے ہرشعبے میں انسانی طاقت کے مناسبت سے"آزادی" دی ہے جیسا کہ:

عقیدے کی آزادی: کسی بھی انسان کو بزور طاقت اس کے مذہب سے دستبردا نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے:" :" لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ"[1]دین میں(کوئی)جبر نہیں ہے ۔"

مذہبی آزادی: میثاق مدینہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہر مذہب والے کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی۔

رائے کی آزادی:اسلام نے سب سے پہلے رائے کی آزادی کاتصور دیا ہے خود نبی علیہ السلام کی زندگی اس کا نمونہ تھی جیسا کہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔غزوہ احزاب کے موقع پر نبی علیہ السلام نے جنگی مشورہ طلب فرمایا ہر صحابی نے کھل کر مشورہ دیا ۔سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ مدینے کے تین اطراف میں تو پہاڑ ہے وہاں سے دشمن کا کوئی خطرہ نہیں ہیں،لیکن جس طرف کھلامیدان ہے اگر وہاں خندق کھودی جائے تو دشمن کاخطرہ ٹل سکتا ہے آپ ﷺ نے اس رائے پر اطمینان کا اظہار فرمایا اور صحابہ کو اس پر عمل کرنے کا ارشاد فرمایا:

" نبی علیہ السلام کو خندق کھودنے کا مشورہ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے دیاتھا"[2]

یہ اس "آزادئی اظہار" کا دوسرا رخ ہے مطلب یہ کہ انسان کو آزادی بھی دی گئی ہے اور پابند بھی بنا دیا گیا ہے ۔کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا۔تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ آج دنیا کا نظام جو کسی بھی طرح کی مکمل آزادی کی اجازت نہیں دیتا وہ"اسلام" کے نظام حدود وقیود پر تنقید کرتا ہے؟ اگر ہر ملک اپنے عوام کے لیے قانون بنانے(اور اس میں حدود وقیود رکھنے) میں خود مختار ہے تو اسلام جو ایک آفاقی اور نجات کا عالمی قانون ہے،اپنے ماننے والوں کو کیسے مکمل آزادی دے کر اُنہیں شتر بے مہار چھوڑ سکتا ہے؟مغرب کے دانشور اسلام کے "نظامِ حدود وقیود" پر طنز کرتے تھکتے نہیں ہیں لیکن وہ اسلام دشمنی میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ وہ اس بارے میں سوچتے بھی نہیں ہیں کہ جس نظام کو وہ"مثالی نظام" کہتے ہیں وہ نظام بھی حدود وقیود کے بغیر وجود میں نہیں آیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بیان کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے کہ:مثال کے طورپر کینیڈا[3] میں عیسائیت کی اہانت و منقصت کو جرم قرار دیاگیاہے۔ کیونکہ کینڈا کی حکومت کو اس بات کا خدشہ تھا کہ آزدئ اظہار کی مکمل آزادی انسان کو مذہب کی اہانت و منقصت پر اکساتی ہے۔ ممکن ہے ایک انسان خواہ وہ عیسائی ہو یا غیر عیسائی اسکے عقائد و نظریات کی توہین کا

---

[1] البقرة2:256

[2] عبد الملك بن هشام ،ابن ہشام،السيرة النبوية لابن هشام،ج4،ص182، دار الجيل – بيروت،الطبعة : الأولى ، 1411

[3] کنیڈا:دنیا میں رقبے کے لحاظ سے کنیڈا دوسرا بڑا ملک ہے جو براعظم شمالی امریکہ میں واقع ہے۔اس ملک کے جنوب اور شمال میں ریاستہائے متحد ہ امریکہ ہے۔تدریجی طور اس مملکت کی آزادی عمل میں آئی ہے۔طرز حکومت پارلیمانی جمہوریت اور آئینی شاہی کا مجموعہ ہے دس صوبوں پر مشتمل اس مملکت کی سرکاری زبان انگریزی اور فرانسیسی ہے،بہترین اور جدید ٹیکنالوجی کی حامل مملکت ہے صنعتی ترقی میں آگے ہے قدرت وسائل سے مالامال ہے۔تجارت کے ذریعے زر مبادلہ کماتا ہے تجارت زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ ہے ۔-/https://ur.wikipedia.org/wiki) مورخہ11/11/2017

مرتکب ہو یا وہ انسان کو عیسائیت کے خلاف ورغلا کر کسی دوسرے مذہب یا نظریہ کی دعوت نہ دے۔

27 جنوری 2003 میں ٹیلی گراف اخبار نے اسرائیلی وزیر اعظم کا خاکہ شایع کیا جس میں انہیں فلسطینی بچوں کی کھوپڑیاں کھاتا ہوا دکھایا گیا۔اس خاکہ پر اسرائیل[1] اور اسکے ہم نوائوں نے ہنگامہ کھڑا کردیا جس کے بعد اخبار نے معذرت کی۔ امریکہ جو پوری دنیا میں ماڈرن کلچر اور فریڈم آف اسپیچ کا دعویدار ہے وہاں بھی لوگوں کے فون ٹیپ کئے جاتے ہیں ۔

لیبیا [2]میں جس وقت توہین رسالت اور اہانت قرآن کے جرم میں مظاہرین نے امریکی ایمبسی کو نذر آتش کیااسکے فورا بعد اقوام متحدہ نے اس نازک مسئلے پر اجلاس طلب کیا۔ اجلا س سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہاکہ ''توہین رسالت و اہانت قرآن آزادیٔ رائے کی ایک شکل ہے، امریکی آئین اسے تحفظ دیتاہے۔ امریکی عوام کی اکثریت عیسائی ہے اسکے باوجود ہم عیسیٰ علیہ السلام کی توہین پر قدغن نہیں لگاسکتے ''۔ امریکی نظام کا دوغلاپن اور دہرا معیار اس وقت سامنے آتاہے جب وہ اپنے آئین میں امریکہ کے قومی پرچم کی توہین، قومی پرندے کی قید اور عدالتوں کی ہتک پر فرد جرم عائد کرتے ہیں ۔

بیلجیم [3]میں ایک قانون کے مطابق ہولوکاسٹ[4] کے خلاف لب کشائی کی اجازت نہیں ہے اگر کوئی ہولوکاسٹ کے ہونے کا انکارکرتاہے تو اسکے لئے قید اور جرمانہ کی سزا معین کی گئ ہے۔ اسی طرح کینیڈا میں بھی ہولوکاسٹ کی تردید پر سزا رکھی گئی ہے۔ کئ مغربی ممالک جیسے فرانس[5]، ناروے[1]، انگلینڈ[2]، ہالینڈ[3] اور کئی دیگر شہروں میں یہ قانون موجود

---

[1]اسرائیل:یہ علاقہ براعظم ایشیا میں واقع ہے۔اس کے جنوب میں مصر ،شمال میں لبنان،مشرق میں اردن اور مغرب میں بحیرہ روم واقع ہے۔اس علاقے میں یہودی اکثریت ہے۔دراصل یہ فلسطین کے علاقے پر قائم شدہ ایک ناجائز ملک ہے۔اقوام متحدہ نے 1947ء کا فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ منظور کیا۔1948ء میں گوریان نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا ۔اگلے روز کئی مسلم ممالک نے اسرائیل پر حملہ کیا ،مرکزی مقام تل ابیب ہے،صدر مقام یروشلم ہے۔سن دو ہزار چودہ کےمردم شماری میں اس کی کل آبادی 814600تھی جس میں 6110600یہودی تھے۔طرزحکمرانی پارلیمانی جمہوری ہے ایک ایوانی پارلیمان ہے دنیا کی 43 ویں بڑی معیشت اور ترقی یافتہ ملک ہے۔https://ur.wikipedia.org/wiki-)مورخہ11/11/2017

[2]لیبیا:ایک افریقی عرب ملک ہے جو شمالی افریقہ میں واقعہ ہے اس کا دارالحکومت طرابلس ہے۔قومی زبان عربی ہے۔جمہوری طرز حکومت ہے۔اطالیہ سے 24دسمبر 1951ء کو آزاد ہوا۔ اِس کے مشرق میں مصر ہے ۔ لیبیا رقبے کے حوالے سے دنیا کا ۱۷ ویں بڑا ملک ہے،۔ اور تقریباً ۹۵ (95) فیصدصحراہے-https://ur.wikipedia.org/wikiمورخہ11/11/2017

[3]بلجیم:4اکتوبر1830ء کو نیدر لینڈ سے آزادی حاصل کی۔اس کا دارالحکومت بر سلز ہے۔قومی زبان ولندیزی ہے،آئینی ملوکیت قائم ہے۔یورپی یونین کاحصہ ہے۔کل رقبہ 30528 مربع کلومیٹر ہے۔2007ء میں آبادی 10584534 کے لگ بھگ تھی(https://ur.wikipedia.org/wiki/%)۔ مورخہ11/11/2017

[4]ہولوکاسٹ: جسے انگریزی میں Holocaust اور فارسی میں مرگ انبوہ بھی کہا جاتا ہے۔جنگ عظیم دوم میں ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل کی طرف یہ لفظ منسوب ہے۔یہودی اسے "یہودیوں کی نسل کشی"کہتے ہیں۔یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کا معنی ہے"مکمل جلادینا"۔دراصل جو واقعات اس میں بیان کئے جاتے ہیں وہ مستند نہیں ہیں ؛بشتر محققین اس کی انکار کرتے ہیں۔یہودی اپنے آپ کو "قابل ہمدردی"ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کے 13ممالک جن میں فرانس اور جرمنی بھی شامل ہیں،میں ہولوکاسٹ پر تحقیق اور بحث کرنا قابل جرم ہے اور اس پر تین سے دس سال تک کا قید و جرمانہ بھی ہے۔ہولوکاسٹ پر لب کشائی ناقابل معافی ہے اور مذکورہ ممالک میں ایسے اظہار پر،جس میں ہولوکاسٹ کی انکار کی جاتی ہو،پابندی ہے۔ (https://ur.wikipedia.org/wiki/) مورخہ11/11/2017

[5]جمہوریہ فرانس: یہ مملکت یورپ کے مغربی حصے میں واقع ہے ۔جس کا صدر مقام پیرس ہے اس کے آس پاس ممالک میں بلجیمم ،جرمنی،اٹلی ، سپین ،برازیل۔اور نیدر لینڈ ہیں۔طرز حکومت نیم صدارتی جمہوری ہے۔دنیا کی پانچویں بڑی

ہے کہ کسی مذہب، عقیدہ، مسلک یا فرد کے افکار کے خلاف تقریر نہیں کی جاسکتی جو ہتک اور تضحیک پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں بھی ایسی تقاریر پر پابندی عائد ہے جو مذہبی جذبات برانگیختہ کرے اور کسی عقیدہ، مسلک یا فرد کی تضحیک کا سبب قرارپائے اور نقض امن کا ذریعہ بنے۔

حال ہی میں امریکہ نے سات مسلم ممالک کے شہریوں پر امریکہ میں داخلہ پر پابندی عائد کردی تھی جسکے خلاف امریکی عدالت نے سخت قدم اٹھاتے ہوئے اس فیصلہ کی مذمت کی اور پابندی کو ہٹانے کا حکم دیا۔ ابھی تک اس متنازع فیصلہ پر عدلیہ اورامریکی صدر کی انتظامیہ میں کشیدگی برقرار ہے مگر اس فیصلہ کے بعد مغرب کا اسلامو فوبیا کھل کر سامنے آتاہے۔ مسلمانوں کے امریکہ میں داخلہ پر پابندی عائد کرنے والی حکومت آزادئ اظہار کی کلّی اجازت کیسے دے سکتی ہے۔

اکثر میڈیا کے ذریعہ خبریں موصول ہوتی ہیں کہ فلاں مغربی ملک نے حجاب پر پابندی عائد کردی ہے۔ فلاں اسکول اور کالج میں حجاب پہننے پر روک لگادی گئی۔ فلاں یونیورسٹی میں قرآن کی تعلیم پر قدغن لگادیا گیا۔ جرمنی اور فرانس جیسے ملکوں میں بھی حجاب پر بین ہے۔ ہندوستان کے بھی کئی اسکولوں اور کالجوں میں حجاب پہننے پر پابندی عائد ہے۔ ہندوستانی بینکوں میں بھی اب اس طرح کی تختیاں آویزاں کی جارہی ہیں کہ بینک میں با حجاب اور بانقاب آنے کی اجازت نہیں ہے۔ایک وقت میناُن کے وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے'' سیکولر'' لفظ کے معنی میں اپنی حکومت کے نظریات کے مطابق ترمیم کی تھی۔ انہوں نے کہاتھاکہ سیکولر ہونے کا مطلب ''دھرم نرپیکش'' ہونانہیں ہے بلکہ ''پنتھ نرپیکش '' ہونا ہے۔ یعنی سیکولر ریاست میں مذہب کی آزادی نہیں ہوسکتی بلکہ صرف عقیدہ کی آزادی دی جاسکتی ہے۔مذکورہ وزیر کا مقصود تھاکہ سیکولر ریاست میں مذہب ریاست کا ہی عام ہوگا اور دیگر مذاہب کے افراد اپنے عقیدہ کے لئے آزاد ہونگے کیونکہ عقیدہ کا تعلق دل سے ہوتاہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتاہے کہ مغربی معاشرہ اور ہمارا سماج جس آزادی اظہار کی دہائی دیتاہے در اصل وہ خود اس کی مکمل اجازت کی حمایت نہیں کرتا۔ ہر نظام میں آزادی کی حدودوقیود بیان کی گئی ہیں مگر اسلام مخالف مفکر ین نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ فقط اسلام کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے نظام کی کمیوں اور خامیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی کچھ زیادہ ہی پڑھا لکھا طبقہ مغربی جھانسہ میں آکر لبرل اور سیکولر ازم کا ڈھنڈورچی ہوگیاہے۔ یا تو یہ لوگ مغرب کی اسلام دشمنی کی سازشوں کا دانستہ طوپر شکار ہیں یا نادانی میں شکار ہورہے ہیں ۔ ایسے حالات میں یہ کہنا کہ اسلام آزادئ اظہار کے خلاف ہے اور اسکا قانون فرد کی آزادی پر قدغن لگاتاہے

معیشت کی حامل اور ایک جدید ترقی یافتہ ملک ہے۔یورپی یونین اور نیٹو کاحصہ ہے اقوام متحدہ کے بانی رکن کی حیثیت سے سلامتی کونسل کا مستقل رکن ہے۔دنیا کی سات ایٹمی طاقتوں میں سے ایک ہے۔-https://ur.wikipedia.org/wiki/) مورخہ11/11/2017

[1]ناروے:دارالحکومت اوسلو ہے۔قومی زبان نارسک ہے۔طرز حکومت آئینی ملوکیت ہے۔7جون 1905ء کوسویڈن سے علحیدہ ہوا۔کل رقبہ385170مربع کلو میٹر ہے۔-https://ur.wikipedia.org/wiki/) مورخہ11/11/2017

[2]انگلینڈ

[3]ہالینڈیا ہولانت:یہ ملک نیدر لینڈ کا ایک علاقہ ہے جو دوحصوں میں تقسیم ہے ایک شمالی ہولانت اور دوسرا جنوبی ہولانت۔اس کاکل رقبہ 5488مربع کلومیٹر ہے۔جبکہ مجموعی آبادی2013ء میں 6314483 تھی۔-https://ur.wikipedia.org/wiki/) مورخہ11/11/2017

خلاف عقل اور مبنی بر عصبیت ہے۔ جس طرح دنیا کا ہر قانون فرد اور معاشرہ کی آزادی کے لئے قانون وضع کرتاہے تاکہ امن عامہ برقرار رہے اسی طرح اسلام بھی آزادی کا اپنا تصور پیش کرتاہے تاکہ معاشرہ فساد سے محفوظ رہے[1]۔

[1]عادل فراز ،لیکچر،مغرب میں آزادئ اظہار کاتصور اور اسلام 2017/11/02

خلاصۂ بحث،نتائج بحث،سفارشاتو تجاویز

خلاصۂ بحث

اس مقالے میں انسانی حقوق کے حوالے سےاقوام متحدہ کے منشور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اسی طرح مسلم امہ کے تحفظات کا بھی تذکرہ کیا گیا کہ منشور میں موجود بعض دفعات کس طرح اسلامی عقائد اور قرآن وسنّت کی تعلیمات سے تصادم رکھتے ہیں۔چونکہ یہ منشور ایک مخصوص نظریے کے تحت ایک خاص پس منظر میں مخصوص اقوام کے مفادات کے تحفظ کے لیے بنایا گیا ہے اس وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے عملاً اس کا مکمل شکل میں ماننا ناممکن ہے۔اسلامی قوانین کی برتری اور افادیت کو اگر موجودہ دنیا کی جدید اصطلاح میں بیان کیا جائے تو انسانی حقوق کے حوالے سے مغربی دنیا اور غیر مسلم اقوام کو یہ حقوق واضح طور پر نظر آئیں گے۔یہ منشو ر نہ تو بالکلیہ طور پر مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہے اور نہ ہی پورے منشور کو مستردکیا جاسکتا ہے۔انسانی حقوق کا تصور آج سے پندرہ سو سال پہلے اسلام نے دیا تھا اور عملی طور پر نافذکرکےدکھایا تھا۔ اوریہ کہنا بے جا ہے کہ اقوام متحدہ کے اس منشور سے پہلے کہیں بھی انسانی حقوق کا جامع تصور موجود نہیں تھا۔اگر خطبہ حجۃ الوداع پر نظر دوڑائی جائے تو یہ روز روشن کی طرح واضح ہو جائے

تھا کہ اصل منشور تو اسلام ہی نے دیا ہے کیونکہ اس خطبہ میں: **<u>اساسیات:</u>**(ایک رب کاتصور ،ایک باپ،فضیلت کا معیار تقویٰ،جاہلیت کے تمام غلط رسوم اورسود کاخاتمہ،جاہلیت کے خون کا خاتمہ،جان مال اور آبرو کا تحفظ،حج ا وراشہر حج کا احترام اور ظلم سے اجتناب)،**<u>اجتماعیات</u>**:(اخوت،حرمتِ نفس ،عزت ومال،امانت کی پاسداری،قرض کی ادائیگی،عورتوں غلاموں اور بوڑھوں سے حسنِ سلوک،شوہروں کی اطاعت،تحفظ نسب اورمعافی کی تلقین) اور**<u>دینیات، عقائد،عبادات،معاملات،اخلاقیات</u>**:(بلاوجہ جھگڑے سے پرہیز،شرک،قتل،زنا اور چوری سے بچاؤ،نماز،روزہ،حج اور زکوۃ ونفل صدقات کی ادائیگی،تحصیل علم کی وصیت،مسلمانوں کی خیر خواہی،امیر کی اطاعت اور اعمال کی پابندی)سب کچھ موجود ہیں۔

اس ابدی منشور (خطبہ حجة الوداع) کے نافذ ہوتے ہی قوموں وملکوں کی حالت بدل گئی۔تہذیب وتمدن نے نئے جلوے دیکھے اور ذہن وفکر کو نئی روشنی ملی۔لیکن تاریخ اسلامی کے طویل عرصہ کے بعد حالات نے رخ بدلا،لوگوں کے اندردولت کی بے جا محبت اور خود غرضی آئی اور باطل حکومتوں کا وجود عمل میں آیا تو اس الٰہی ونبوی منشور جس میں نہ صرف حقوق انسانی کا احترام ملحوظ ہے بلکہ سیاست ومعاملات اور عبادات کے معیار کوبھی متعین وواضح کیا گیا ہے، کی خلاف ورزی کی گئی اور طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے۔ عوام کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کے لیے مختلف ملکوں نے اپنے اپنے مفاد کے تحت متعدد منشور تیار کیے اور اس میں حقوق انسانی کا جس انداز میں استحصال کیا ہے وہ سب پر عیاں ہیں،بلکہ ان نکات میں جومثبت باتیں شامل ہیں ان پر بھی عمل کم ہی کیا جاتا ہے۔آخر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰/دسمبر ۱۹۴۸/میں حقوق انسانی کا چارٹر تیار کیا جسے دنیا کا بہترین عالمی منشور قرار دیا وہ بھی عیوب ونقائص اور خود غرضیوں سے خالی نہیں ہے،چہ جائیکہ اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے سلسلہ میں بظاہر اس کی رائے مختلف ہے[1]۔اس منشور کے متعلق ایک دانشور نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے:

‘‘اس نقطہ کی اہمیت ومعنویت ان لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ اجاگر ہوسکے گی جو یہ جانتے ہیں کہ عصر حاضر کی وہ دستاویز جو حقوق انسانی کی نقیب سمجھی جاتی ہے اور جسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰/دسمبر ۱۹۴۸/ کو منظور کیا تھا ،تجویز وسفارش سے زیادہ اہمیت نہیں تھی اور کسی مملکت کے لیے عالمی منشور برائے انسانی حقوق کا تسلیم کرنا لازمی ولابدی نہیں ہے۔ایک مصنف کے بقول:یہ منشور تحفظ حقوق انسانی کے معاملے میں بالکل ناکارہ اور ناقابل اعتماد دستاویز ہے اس منشور کی حیثیت سراسر اخلاقی ہے۔ قانونی نقطئہ نظر سے اس کا کوئی وزن ومقام نہیں ہے۔اس منشور کی رو سے جو معاشی اور سماجی حقوق منظو کیے گیے ہیں وہ ایک بالغ نظر مبصرکے مطابق، اس کے تسلیم شدہ مفہوم کی رو سے حقوق ہی نہیں ہیں۔ یہ تو سماجی اور معاشی پالیسیوں کے محض اصول ہیں۔بلکہ کمیشن برائے انسانی حقوق میں ۱۹۴۷/ کو طے کیے جانے والے اصول کی روشنی میں گویا منشور کے اعلان سے ایک سال قبل ہی یہ طے ہوگیا کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی،کوئی

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم ، شمارہ 10-11 ، جلد : 92 ذیقعدہ 1429 ھ مطابق اکتوبر - نومبر 2008ء

ملک چاہے تو اس منشور پر از خود رضا کارانہ طورپر عمل درآمد کرسکتا ہے اور چاہے تو ردی کی ٹوکری میں پھینک سکتا ہے۔[1]

قرآن کریم کی تعلیمات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اس بات پر عادل وشاہد ہیں کہ اسلام میں جبرو اکراہ کی گنجائش نہیں ۔دین کے معاملے میں ہر کوئی آزاد ہے۔ اس میں جو کچھ بھی بیان ہواہے وہ پوری انسانیت کے لیے ہدایت ورحمت ہے۔اس طغیانی دور میں بھی جو کوئی اس پر عمل کرے گا بلکہ عمل کرنے کی شدید ضرورت ہے تو عزت وبلندی کا مقام حاصل کرے گااور کبھی بھی کسی کے سامنے اور کہیں بھی ذلیل ورسوا نہ ہوگا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اول اور آخری حج میں جو خطبہ دیا وہ احکام الٰہی کا خلاصہ اور نچوڑ ہے ،جو پوری انسانیت کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہے۔یوں تو پورا قرآن ہی انسانیت کے لیے ہدایت ورحمت اور شفاہے،جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں تک پہنچاتے اور احکام الٰہی سے متعارف کراتے رہے۔اس میں نہ صرف انسانیت کے مقصد تخلیق کو واضح کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ نماز،روزہ،زکوٰۃ،حج کی ادائیگی کے مطالبہ کے ساتھ توحید کے اقرار کو لازم قراردیا گیا ہے،جس کے بغیر کوئی مومن ہی نہیں ہوسکتا۔اس میں سماجی ومعاشرتی احکام بھی ملتے ہیں تو روزوشب گزارنے کا پیمانہ بھی متعین کیا گیا ہے۔جائز وناجائز اور حلال وحرام کی تمیز کرائی گئی ہے تومعاملات کو بھی اس میں متعین کیا گیا ہے۔اگر جنگ وجدال کا حکم ناگزیر صورت میں دیا گیا ہے تو اس کے ساتھ مومن کی اچھی صفت یہ بیان کردی گئی ہے کہ وہ معاف کرنے والاہو۔شوہر اوربیوی کے حقوق وتعلقات کو ظاہر کیا گیا ہے تو ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کو حصول درجات کا ذریعہ بتایا گیاہے۔اگر اولاد کو اور مال کو فتنہ کہاہے تو اسے عزیز نعمت قرار دینے میں قرآن پیچھے نہیں ہے۔وقت اور حالت کے تحت دونوں کے مقا م ومرتبہ کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اعزہ و اقارب اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم ملتی ہے تواس میں اللہ کی دوسری مخلوق پر بھی رحم وکرم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔اگر اس میں تعلیم وتعلم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے تو تقویٰ کو شعار بنانے پر بھی زور دیا گیا ہے۔اگر اس کا تعلق ایام سابقہ سے ہے تو عہد حاضر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی بھی اس میں نشان دہی کی گئی ہے۔گویا کہ پورا قرآن سراپا ہدایت اور معلومات کا ایسا خزانہ ہے جس کے مثل کوئی کتاب ہوہی نہیں سکتی۔اسی قرآنی ہدایت کی تعلیمات کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔جس کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی شدید ضرورت ہے۔[2]

لہٰذامقالے کا پورا خلاصہ یہ ہے کہ انسان (مرد،عورت،بچہ،بوڑھا،جوان،والدین،رشتہ دار،ہمسایہ ،غلام وغیرہ)کو اسلام نےحقوق وفرائض کے حوالے سے جو اعلیٰ مقام دیا ہے وہ مقام دنیا کے کسی بھی قانون اور منشور نے نہیں دیا ہے۔اس وجہ سے اسلام جو آسمانی والہی ہدایات کا مجموعہ ہے،ہی دنیا کو بہتر ،انصاف کا حامل اور پائیدارنظام دے سکتا ہے جس میں تمام انسان برابر کے شریک ہوتے ہیں،جبکہ اقوام متحدہ کی نظر میں تما م اقوام/ممالک یکساں حقوق کے مستحق نہیں ہیں جو سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبر ممالک کی شکل میں موجود ہیں۔پس دنیا کو اسلام کے ابدی اور عدل ومساوات کے حامل نظام سے استفادہ

---

[1] حجة الوداع،پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد،ص: ۱۳۴ ،بیت الحکمت،لاہور، پاکستان، ۲۰۰۵

[2] ماہنامہ دارالعلوم ، شمارہ 10-11 ، جلد : 92 ذیقعدہ 1429 ھ مطابق اکتوبر - نومبر 2008ء

کرنےموجودہ اصطلاحات کی تشریح کرنی چاہیے تب جاکر دنیا چین وامن کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

نتائج بحث

1۔انسانی حقو ق کی اصطلاح نے حال ہی میں شہرت حاصل کی۔

2۔"عالمی منشور برائے انسانی حقوق " انسانی عقل کی اختراع ہے جو کہ ظاہر ہے،ناقص ہے۔

3۔منشور ایک خاص ایجنڈے کے تحت پاس کیا گیا ہے۔جس میں مخصوص ممالک کے مفادات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

4۔منشور کی تیاری میں آسمانی مذاہب کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے۔

5۔دنیا کے بڑے مذہب"اسلام" اور اس کے ماننے والوں کے عقائد کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی ہے۔

6۔انسانوں کو اُن کا اصل مقام اسلام نے دیا ہے جبکہ منشور سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہی منشور ہی انسانیت کا معیار ہے۔

7۔امت مسلمہ کے تحفظات مبنی بر حق ہیں۔

8۔آزادئی رائے کی آڑ میں آسمانی مذاہب کی حیثیت ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

9۔غلاموں کے حقوق کے حوالے سے اسلام پر شب خون مارنے کی راہ ہموار کی گئی ہے۔

10۔دنیا کے تمام ممالک کے لیے یکساں قانون بنانے میں ناکام ہوئے ہیں۔

11۔سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممالک کے ہاتھوں دنیا کو یرغمال بنایا گیا ہے۔

12۔عیسائیت،یہودیت اور ہولوکاسٹ کے حوالے سے آزادئی رائے کو پابندی جبکہ اسلام کے مقابلے میں آزادئی رائے کو کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔

13۔تیس دفعات کے اس منشور میں اللہ پرستی کا تصور مکمل طور پر معدوم ہے۔

14۔اس عالمی منشور میں "حقوق" لینے پر زور دیا گیا ہے جبکہ اسلام"حقوق" دینے کی تاکید کرتا ہے۔

15۔اسلام اور منشور میں مشترک اجزاء مساوات،عدل اور فرد کی آزادی ہے لیکن تشریح میں بہت فرق ہے۔

16۔یہ عین ممکن ہے کہ منشور پر عمل کیا جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے تحفظات کو دور کیا جائے ۔

17۔مسلم امہ کو جدید اصطلاح میں اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے لیے ایک مستقل ہوم ورک کرنا لازمی ہوگا۔

18۔"اجتہاد"کے مسلمہ اصول کو بروئے کار لا کر مختلف فیہ مسائل کا قابل عمل حل نکالنے کے لیے امت مسلمہ کا ایک نمائندہ کمیٹی/جماعت کا ہونا ازحد ضروری ہے جو مذہبی اختلاف کوپس پشت ڈال کر مغربی دنیا کا عملی میدان میں مقابلہ کر سکے۔

19۔دنیا کے مسلم ممالک میں سے چند ممالک نے (جس میں سعودی عرب اور پاکستان بھی شامل ہے)اس منشور پر گاہے بگاہے اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے۔اگر اُن پر مخلصانہ غور کیا جائے تو مسئلے کا حل ممکن ہے۔

20۔منشور نہ تو سو فیصد قابل عمل ہے اور نہ ہی بالکل مسترد کیا جاسکتا ہے۔

21۔متفقہ دفعات کو بنیاد بناکر مختلف فیہ دفعات پر بحث وتمحیص کا راستہ کھلا رکھنے سے مذہبی دنیا کے خدشات دور کیے جاسکتے ہیں۔

22۔پوری دنیاکواسلامی تعلیمات ہی حقوق وفرائض کے حوالے سے قابل عمل صورت دے سکتا ہے۔

23۔منشور میں اقوام کو برابری کے بنیاد پر حقوق نہ دینے سے اس کی اہمیت وافادیت کمزور ہو چکی ہے۔

24- انسانی خواہش کے احترام میں ہر اخلاقی ،معاشرتی اور قانونی تقاضہائے دنیا کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا ہے۔

25-اگر خطبہ حجۃ الوداع کو بنیاد بناکر جدید اصطلاح میں قوانین بنانے کی کوشش کی جاتی تو دنیا میں امن،سکون،حقوق وفرائض کی بروقت ادائیگی،ظلم وناانصافی کا خاتمہ اور انسانیت سے مزین معاشرہ کی تکمیل ممکن ہوجاتی۔

تجاویز وسفارشات

چونکہ یہ عالمی منشور اقوام متحدہ کی پلیٹ فارم سے منظور ہوا ہے اس وجہ سے اسےمکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اگر درجہ ذیل تجاویز وسفارشات پر عمل کیا جائے تو نہ صرف یہ مکمل طور پر قابل عمل ہو سکتا ہے بلکہ دنیا کے اُن ممالک کو بھی اس کی دعوت دی جا سکتی ہے جو ابھی تک اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

*(OIC) عالم اسلام کی نمائندہ تنظیم ہونے کی بناء پر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے طرز پر ایک سسٹم متعارف کرے۔جو کہ درجہ ذیل نکات پر کام کرے۔

1۔اسلامی قوانین کی برتری اور افادیت کو آج کے جدید دور کے اسلوب میں بیان کیا جائے۔

2۔جن دفعات پر مسلم امہ کے تحفظات ہیں اُن کو اجتہاد کے دائرے میں رہتے ہوئےآج کے عالمی عرف اور بین الاقوامی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ایڈجسمنٹ کے راستے سےحل کیے جائیں۔

3۔اجتہاد کے مسلمہ اصول کو بروئے کار لاکر مختلف فیہ مسائل و امورکی پوری طرح تجزیہ وتنقیح کے بعد جو موقف واضح ہو کر سامنےآجائے ،اسے مغرب کے سامنے پوری جرات کے ساتھ پیش کیا جائے۔

4۔متعلقہ موقف کے پیش کرنے کے لیے عالمی سطح پر ایک موثر لابنگ اور ذہن سازی کی جائے۔

5۔مغربی دنیا میں حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو جس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اُن کو اصل روح کے ساتھ مدلل انداز میں ہر سطح پر پیش کیا جائے۔

6۔جدید اصطلاحات کو سمجھا جائے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی تفصیلات بیان کی جائیں۔

7۔اللہ فراموشی کے نقصانات سائنسی بنیادوں پر بیان کئے جائیں۔

8۔رہبانیت کا دروازہ بند رکھنے کے لیے مذہبی تعلیمات عام کئے جائیں۔

9۔مادہ پرستی کے نتیجے میں جنم لینے والی ناامیدی کو ختم کرنے کی فضاء قائم کی جائے۔

10۔کسی علمی مرکز میں عالمی سطح پر ایک مستقل کام کے طور پر اس موضوع پر جید علماء کرام اور سکالرز کی ایک ٹیم اس منشور کا شق وار جائزہ لیں۔

11۔مذہبی گروہ بندیوں سے بالاترخالص قرآن وحدیث کو بنیاد بناکر تمام امت مسلمہ کی ایک نمائندہ علماء و سکالرز کی ٹیم ایک قابل عمل صورت دنیا کو پیش کریں۔

12۔یہ وضاحت ہونی چاہئیے کہ اس منشور میں کون کون سے دفعات امت مسلمہ کے لیے قابل عمل اور کون کونسے ناقابل عمل ہیں؟۔

13۔یہ واضح کر دینا چاہئیے کہ مسلم امہ کو اس منشور کے کن کن دفعات سے اختلاف ہے؟۔

14۔اختلاف کی وجوہ اور امت مسلمہ کی ترجیحات کیا ہیں؟

15۔یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ کیاعالمی سطح پر اختیارات صرف چند ہاتھوں (سلامتی کونسل کے مستقل پانچ ممبر ممالک)میں محصور رہنے سے دنیا کا امن برقراررہ سکتا ہے؟

16۔سلامتی کونسل میں مسلم امہ کی مستقل نمائندگی نہ ہونے کے نقصانات دنیا کے سامنے لانے چاہئیے۔کیونکہ جب اقوام متحدہ کوئی منشور/قانون بنائے گی تو ظاہر بات ہے کہ وہ مسلم امہ کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکیں گے۔

17۔منشور جب متفقہ طور پر اقوام عالم کے لیے قابل قبول بن جائے تو اس کے عملی نفاذ کے لیے ایک مرتب قانون بنایا جائے۔

18۔رہبانیت اور اللہ فراموشی دونوں انتہاؤں کے خاتمے کے لیےعملی اقدامات کیے جائیں۔

19۔تمام اقوام عالم کے لیے یکساں قوانین بنائے جائیں۔

20۔منشور کا ازسر نو جائزہ لےکر آسمانی ہدایات کی روشنی میں دوبارہ مرتب کیا جائے۔

21-عالمی منشور کے دفعات کی تشریح کے لیے وقتاً فوقتاً کنونشنز کا انعقاد کیا گیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اُن کنونشنز کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی منشور اور اسلامی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے۔یہ 9کونشنز ہیں۔

Abstract

In this thesis there is a compelte discussion on human rights about the manifesto of the U.N. Similarly the muslims who have some reservations on a few articles of the manifesto that comes in collision with the Islamic facts and teachingsof Islam.As the manifesto was designed in such away to the particular benefits of some nations of the UN.That's why islam and the Muslims can't practice them in complete shape.It's impossible for islam and the muslims to accept and follow it in compete shape.The West and Non-muslim nations will clearly see the human rights if the Islamic laws are in accordance with benefits in the modern way of definition.The manifesto can't be rejected nor acceptable for the muslims completely.This concept of human rights was given and practically implemented by the muslims fifteen hundred years ago.So saying that before the UN manifesto of human rights there was not any compete concept on the rights about humans. If we take a glimpse on the last address of the Holy Prophet (S.A.W.). This becomes clear (bright) that the manifesto real concept was presented by Islam. Because in this address there are several points:

ASASIYAT(Fundamentals/Basics): The concept of one God,One father,The Quality of standard piety, the elimination of incorrect customs of Illiteracy and interest, the elimination of ignorant murders,the protection of wealth and reputation, the respect of Pilgrimage and Abstinence from tyranny.

IJTIMAIYAT(Collective Actions): (Brotherliness, Sanctity, Soule esteem wealth, abidance of trust,payment of loan,good treatment with women, aged and children, obedience to husbands conservation of ancestry and inciting of forgiveness),

DINIYAT(religion Matters),AQAYAD(Faith worships/Beliefs),IBADATMUAMALAT(Mutual Interactions) and AKHLAQIYAT(ethics)toabstinence from fight without reason, polytheism, murder, fornication and theft prayer,Fast, Pilgrimage, Zakat payment of optional charities, request of muslims, obedience to leader, everything is included(submission and abidance by good deeds).

With the implementation of the last "address" the fate of many nations in countries has changed, culture and civilization has been fresh air and thinking abilities have been improved. But in Islamic history has become things of the fast and situation has changed now, people now love material wealth and become selfish and evil forms of governance come in to being. So this blessed manifesto of lord and his prophet

would not only religious rights but also political and social rights were given, has been violated and met many accusations. Many manifestos were made so that those countries could mess with human rights, and every body lenows it, and those positive points which were in those manifestoes were less heed give too, and were naver acted upon them, even tually the general assembly of the UN had to come up with a charter, promulgated on 10th December, 1948, which too was fought with many difficulties. So acting upon on it or not is too opposite opinions about this manifestoes the discussion of a scholar is worth reading[1]"

This point will come in mind of those people who know that the documents of human rights that has been passed by the UN on 10th December 1948 did not get more importance from regulations and recommendations and it is not important or essential for any countryto accept this with out there own well. A writer says" it is a useful document or manifesto for the human rights. The status of this manifesto is totally morel, but it has no value in law. These are not social and economical rights but policies about social and economical principles. If a country wants to adopt this, they can, but if a country does not they can ignore or reject this any time. No one can be forced to adopt this.[2]

The teachings of Quraan, sayings in practices of the holy prophet (SAW) clearly expresses that there is no concession in coercion. Every one is free in terms of religion, whatever is said or expressed in this is roadmap in mercy. In this deluged era those who accept them and it is needed to accept them will get a respectable and higher position and will naver be debased and arranted now here in form of anyone. The last address of the holy Prophet (SAW), in which he said on his first in last pilgrimage, as the gist of God's obligations and command, which is an accordance with the nature and requirement of the whole humanity. The holy Quran is totally guidance and mercy for humanity which holy Prophet (SAW) used to spread among the people and make them aware with commands and obligations of God. In the holy Quran not only the purpose of human is stated but along with it prayers, fast, zakat, performing hajj and confessing unity or compulsory without that no one can be a muslim. The way of living life is also giving as social obligations and command are also mentioned. If the order or permission of fight is given in certain un avoidable but alongside it is a good quality of a muslim ie to forgive others is also mentioned. The rights and relationship of husband and wife are given while well-treating parents is considered a way of getting/achieving higher Holy Prophet S.A.W and his lastaddress briefly , giving proper attention/focus to world which is utmostly needed[3].

According to the total summary of the thesis is" that islam has given much rights to human beings (man , woman , child , young , aged , parents , relatives , neighbors and slaves) as compared to any worldly

---

[1] Monthly Dar ul Uloom,Vol#10-11,Vol#92,Oct & Nov2008

[2] Hajjat ul Wada,Prof.Dr,Nisar Ahmad,page#134,Bait ul Hikmat,Lahore,Pakistan,2005

[3] Monthly Dar ul Uloom,Vol#10-11,Vol#92,Oct & Nov2008

law and manifesto.due to this reason only islam can give best and strong path which is all about divine teachings . in which all the human are equal while according to the UN declaration all the countries are not deserve same rights which is consist of 5 countries security council. So the only way to bring piece in the world as to accept all the rules, teachings and preachings of islam and Quran.

Conclusion

1: The scanter of human rights got fame nearly.

2:"UDHR"is human mind's innovation, which is clear not forbidden.

3: The Manifesto has been passed under a special agenda. In particular, the interests of specific countries were considered

4: Heavenly religions are not considered to be persuaded in the preparation of the manifesto

5: The great religion of the world "Islam" has been contradicted ,and the beliefs of its followers

6: Islam has given their original place to Humans, while it is inspiring with the manifestation, That It(UNDHR) is the quality of humanity

7: The reservations of Muslim Ummah is based on rightfulness.

8: They gave freedom of expression to eliminate the status of divinely faiths.

9: Rights regarding slaves were made clear ,especially bamboozling .

10:They failed to prepare parallel law for the entire worldor countries.

11:The five permanent countries of security council hostagethe world.

12:They banned freedom of expression of Christianity,Jewish and Holocaust ,while Islam discounted with the freedom of expression.

13:There is no concept of God worshiping in the whole Manifesto.

14:In this manifesto stressed upon to take rights while islam urge to give rights.

15: It is clear that the manifesto wile process. It is essential for this to eliminate all the reservation of muslim ummah.

16: It is important for muslim ummah to present the modern scatter of islamic preaching on permanent home work

17:Muslim community shall tackle their problem through IJTIHAD and shall set up a representative communityso that religious controversies are to be resolvend and as well to fight the western propaganda practically.

18:Few countries among the muslim countriesincluding Pakistan and Saudi Arabia expressed their bristling reservations on this manifesto. If this reservations processed with whole heartedly the problems can be solved.

19: The Manifesto is nor 100% workable neither rejectable.

20:Mutually agreed articles shall be made to tackle other articles and this way a path will be open to muslims to resolve their religious issues.

21:It can grive awareness or knowledge about the rights and obligations to the entire world.

22:This manifesto loses it's importance by not giving equal rights to all nations.

23:"Human desires" are given full respect.They ignore all rights of human including social economical etc

24:If modern rules are made in compatibility with and in the light of "The last address ",so in the whole world there will be peace, satbiltiy,right will be given in time,crulty and injustice will diminish,and this way a humanistic society full of reformations will eventually come out.

Suggestions and Recommendations

As this Declaration has been approved from international forum The U.N. Therefor it cannot completely be ignored but if the following Suggestions and Recommendations are taken into consideration, it would not one be feasible but those countries or states of the world,while are not ready to accept it now, could also be called invited to it.

1:The superiority and worth of the Islamic laws should be described in the modern routine style.

2:Those sections, on which the muslim ummah has reservations, should be resolved in the context of the process of legal reasoning by keeping international situation and general acceptation and its relationship and adjustment with them.

3: Boldly and confidently presenting in front of the western world that final new-point which comes into existence after proper analysis and investigations of contestable problems and behests in the light of the principles of “IJTIHAD”.

4: To do effective brain washing and lobbying to present the concerned view point.

5:To present those Islamic principles regarding rights, which are poorly presented in the western world in a reasonable manner and it original and real shape.

6: To understand the advanced terminologies and explain them in the light of the Islamic teachings.

7:To elaborate the short-falling’s of apostasy in scientific context.

8: To preach religious teachings and practices to present monasticism.

9: To create ground for preventing disappointment which is because of inaterialism.

10: As a permanent work a team of monumental scholars should take a fissile analysis of this manifesto globally in a literacy center.

11: To present in a feasible manner a team of ulamas and scholars to the world on the basis of Quran and hadith above all religious factions.

12: It should be explained that which sections of this manifesto are feasible for the myuslim Ummah and which are not.

14: What is the cause of disagreement and what are muslims preferances?

15:It is also note worthy that authority in a few hands will not be of benefit.

16: That muslim community is not a permanent member of security council so this problem is to be broughtbeforethe world. Because in absence of muslim representatives the manifesto will do more harm them good.

17:When a manifesto is agreed by all alike them and only then. It should be given the status of law.

18: Measures should be taken against atheists and agnostics.

19: Rules must be similar for the whole humanity.

20: Manifesto must be updated now and then to keep it current, in the light of scriptures.

فہرس آیات قرآنیہ

نمبرشمار	سورة	آیت	صفحہ
1	42	ولاتلبسواالحق بالباطل وتكتمواالحق وأنتم تعلمون	7

نمبر	آیت	الفاظ	صفحہ
2	71	قالواالآن جئت بالحق	7
3	180	حقاً على المتقين	6
4	184	وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ	145
5	221	وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ مِنْ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ	61
6	234	وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا	81
7	236	حقاً على المحسنين	6
8	256	لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ	217
9	286	لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ	172
10	3 آل عمران	نزل عليك الكتاب بالحق	7
11	18	شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لا إِلَهَ إِلا هُوَ وَالْمَلائِكَةُ وَأُوْلُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ	191
12	62	إن هذالهوالقصص الحق	6
13	10	إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ	14،152
14	11	يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ	80
15	24	وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ	241،307
16	28	يُرِيدُاللَّهُ أَن يُخَفِّفَ عَنكُمْ وَخُلِقَ الإِنسَانُ ضَعِيفًا	13،9
17	29	يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ	209

18	34	الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ	116،272
19	36	وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى	14،114
20	82	أفلا يتدبرون القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيرا	13
21	148	لا يُحِبُّ اللَّهُ الجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنْ الْقَوْلِ إِلاَّ مَنْ ظُلِمَ	19
22	المائده2	وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	321
23	8	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ	19
24	32	مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا	17
25	48	وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ	227
26	63	لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا	209
27	67	يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ	347
28	الانعام5	فقدكذبوابالحق لماجاءهم	5،6
29	38	ما فرطنا في الكتٰب من شيء	13
30	122	أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ	192

31	151	وَلَا تقتلوا النفسَ التِي حَرّمَ الله إِلاّ بِالحق	17،58،21 4
32	اعراف8	والوزن يومئذالحق	6
33	24 انفال	اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ	192
34	48	حتى جاءالحق وظهرأمرالله	6
35	12 یونس	وَإِذَامَسَّالإِنسَانَ الضُّرُّدَعَانَالِجَنبِهِ أَوْقَاعِدًاأَوْقَآئِمًا	9
6	15	وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا	243
37	32	فذلكم الله ربكم الحق	5
38	هود9	وَلَئِنْ أَذَقْنَاالإِنْسَانَ مِنَّارَحْمَةًثُمَّ نَزَعْنَاهَا	9
39	100	قدجعلهاربي حقاً	7
40	ابراهيم34	وَإِن تَعُدُّواْنِعْمَةَاللَّهِ لاَتُحْصُوهَاإِنَّالإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ	9
41	الحجر26	وَلَقَدْخَلَقْنَاالإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍمَّسْنُونٍ	9
42	النحل 4	خَلَقَ الإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍفَإِذَاهُوَخَصِيمٌ مُّبِينٌ	9
43	43	فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ	193،209
44	90	إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ	371
45	11 الاسراء	وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّدُعَاء هُ بِالْخَيْرِوَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً	10
46	32	وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا	81،129
47	67	{وَكَانَ الإِنْسَانُ كَفُورًا	10
48	70	وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ	18

		وفضلناهم	
49	81	وقل جاءالحق وزهق الباطل	6
50	مريم32	وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا	138،261
51	طہ114	رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا	189
52	المؤمنون6	إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ	241
53	12	وَلَقَدْخَلَقْنَاالْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍمِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةًفِي قَرَارٍمَكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَاالنُّطْفَةَعَلَقَةًفَخَلَقْنَاالْعَلَقَةَمُضْغَةًفَخَلَقْنَاالْمُضْغَةَعِظَامًافَكَسَوْنَاالْعِظَمَ لَحْمًاثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًاآخَرَفَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ	10
54	70	بل جاءهم بالحق وأكثرهم للحق كارهون	6
55	71	ولو اتبع الحق أهواءهم لفسدت السموات والأرض ومن فيهن	13
56	116	ولواتبع الحق أهواءهم	5
57	الفرقان 25	وَنُسْقِيَهُ مِمَّاخَلَقْنَاأَنْعَامًاوَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا	9
58	68	وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا	199
59	48	فلماجاءهم الحق من عندناقالوالولاأوتي مثل ماأوتي موسى	6
60	العنكبوت43	وَمَا يَعْقِلُهَا إِلاَّ الْعَالِمُونَ	190
61	الروم 30	فأقم وجهك للدين حنيفاً فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم ولكن أكثر الناس لا يعلمون	13
62	47	وكان حقاًعلينانصرالمؤمنين	7

78	11	يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ	189
79	التغابن15	إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ	91
80	الملک10	وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ ، أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ	190
81	المعارج 24،25	وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ	159،171
82	النبا39	ذلك اليوم الحق	7
83	التکویر8	وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ	87
84	العصر3	وتواصوابالحق	6

فہرسِ احادیث

». ان تقول فبخلكِ الله

8	قال رسول الله صلى الله عليه و سلم خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي وإذا مات صاحبكم فدعوه	109،70
9	عن جابر بن عبد الله قال بينما نحن قعود عند رسول الله إذ أتته امرأة فقالت السلام عليك يا رسول الله أنا وافدة النساء إليك الله رب الرجال ورب النساء وآدم أبو الرجال وأبو النساء وبعثك الله عز و جل إلى الرجال وإلى النساء فالرجال إذا خرجوا في سبيل الله فقتلوا فأحياء عند ربهم يرزقون وإذا خرجوا لهم من الأجر ما قد عملوا ونحن نخدمهم ونحلس فماذا لنا من الأجر فقال لها رسول الله (أقرئي النساء مني السلام وقولي لهن إن طاعة الزوج تعدل ما هناك وقليل منكن من تفعله	71
10	أشد الناس عذابا [يوم القيامة] اثنان امرأة عصت زوجها وإمام قوم وهم له كارهون	71،113
11	أَنَّ عَائِشَةَ ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا ، كَانَتْ تَقُولُ لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ {وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ} أَخَذْنَ أُزْرَهُنَّ فَشَقَّقْنَهَا مِنْ قِبَلِ الْحَوَاشِي فَاخْتَمَرْنَ بِهَا	72
12	كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالإِمَامُ رَاعٍ وَهْوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ رَاعٍ وَهْوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ ، وَهْيَ مَسْؤُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا وَالْخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَهْوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	72
13	قال لها النبي صلى الله عليه و سلم أذات زوج أنت قالت نعم قال كيف أنت له قالت ما آلوه الا ما عجزت عنه قال فانظري أين أنت منه فإنما هو جنتك ونارك	74
14	عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم أَيُّ الأَعْمَالِ أَفْضَلُ قَالَ الصَّلاَةُ لِوَقْتِهَا وَبِرُّ الْوَالِدَيْنِ ثُمَّ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ الله	77
15	عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ، وَالْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالاَ : قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ : لاَ يَرِثُ الصَّبِيُّ حَتَّى يَسْتَهِلَّ صَارِخًا،قَالَ : وَاسْتِهْلاَلُهُ أَنْ يَبْكِيَ وَيَصِيحَ أَوْ يَعْطِسَ	80
16	فَهَلا بِكْرًا تَعَضُّهَا وَتَعَضُّكَ	86

17	حدثنا سَلمَانَ بنَ عامِرٍ الضبيّ ، قال : سَمِعت رَسول اللهِ صلى الله عليه وسلم يقول : مَعَ الْغُلاَمِ عَقِيقَةٌ فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا وَأَمِيطُوا عَنْهُ الأَذَى	88
18	قَالَ « هَلْ مَعَكَ تَمْرٌ ». فَقُلْتُ نَعَمْ. فَنَاوَلْتُهُ تَمَرَاتٍ فَأَلْقَاهُنَّ فِى فِيهِ فَلاَكَهُنَّ ثُمَّ فَغَرَ فَا الصَّبِىِّ فَمَجَّهُ فِى فِيهِ فَجَعَلَ الصَّبِىُّ يَتَلَمَّظُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ -صلى الله عليه وسلم- « حُبُّ الأَنْصَارِ التَّمْرَ ». وَسَمَّاهُ عَبْدَ اللَّهِ.	89
19	عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ كَانَ يَأْخُذُهُ وَالْحَسَنَ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا ، أَوْ كَمَا قَالَ	90
20	عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ : خَيْرُ نِسَاءٍ رَكِبْنَ الإِبِلَ صَالِحُ نِسَاءِ قُرَيْشٍ - أَحْنَاهُ عَلَى وَلَدٍ فِي صِغَرِهِ وَأَرْعَاهُ عَلَى زَوْجٍ فِي ذَاتِ يَدِهِ	92
21	إِنْ كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم لَيُخَالِطُنَا حَتَّى يَقُولَ لأَخٍ لِي صَغِيرٍ يَا أَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ"	92
22	إن امرأة جاءت رسول الله صلى الله عليه و سلم فقالت فداك أبي وأمي إن زوجي يريد أن يذهب بابني وقد نفعني وسقاني من بئر أبي عنبة فجاء زوجها وقال من يخاصمني في ابني فقال يا غلام هذا أبوك وهذه أمك فخذ بيد أيهما شئت فأخذ بيد أمه فانطلقت به	95،96
23	◌َنَّ امْرَأَةً - يَعْنِى مِنْ غَامِدَ - أَتَتِ النَّبِىَّ -صلى الله عليه وسلم- فَقَالَتْ إِنِّى قَدْ فَجَرْتُ. فَقَالَ « ارْجِعِى ». فَرَجَعَتْ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ أَتَتْهُ فَقَالَتْ لَعَلَّكَ أَنْ تَرُدَّنِى كَمَا رَدَدْتَ مَاعِزَ بْنَ مَالِكٍ فَوَاللَّهِ إِنِّى لَحُبْلَى. فَقَالَ لَهَا « ارْجِعِى ». فَرَجَعَتْ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ أَتَتْهُ فَقَالَ لَهَا « ارْجِعِى حَتَّى تَلِدِى ».فَرَجَعَتْ فَلَمَّا وَلَدَتْ أَتَتْهُ بِالصَّبِىِّ فَقَالَتْ هَذَا قَدْ وَلَدْتُهُ. فَقَالَ لَهَا « ارْجِعِى فَأَرْضِعِيهِ حَتَّى تَفْطِمِيهِ ». فَجَاءَتْ بِهِ وَقَدْ فَطَمَتْهُ وَفِى يَدِهِ شَىْءٌ يَأْكُلُهُ فَأَمَرَ بِالصَّبِىِّ فَدُفِعَ إِلَى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَمَرَ بِهَا فَحُفِرَ لَهَا وَأَمَرَ بِهَا فَرُجِمَتْ وَكَانَ خَالِدٌ فِيمَنْ يَرْجُمُهَا فَرَجَمَهَا بِحَجَرٍ فَوَقَعَتْ قَطْرَةٌ مِنْ دَمِهَا عَلَى وَجْنَتِهِ فَسَبَّهَا فَقَالَ لَهُ النَّبِىُّ -صلى الله عليه وسلم- « مَهْلاً يَا خَالِدُ فَوَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ ». وَأَمَرَ بِهَا فَصُلِّىَ عَلَيْهَا فَدُفِنَتْ	96،97

فہرسِ اعلام

342	امام ضحاک رحمہ اللہ	103

فہرسِ بلاد واماکن

340	عراق	11
346	فارس	12
390	فرانس	13
242	فلسطین	14
241	کشمیر	15
388	کینیڈا	16
389	لیبیا	17
347	مصر	18
390	ناروے	19
390	ہالینڈ	20
305	ہندوستان	21
20	یورپ	22

فہرسِ مصادر ومراجع

*۔القرآن الکریم
1۔الخدمۃ الاجتماعیۃ مع الاسرۃ والطفولۃ والمسنین ،محمد حسن توفیق الدیب،مکتبۃ الانجلو المصریہ،القاہرہ،بدون تاریخ
2۔آخری مستند متن،عالمی منشوربرائے انسانی حقوق،محکمہ اطلاعات عامہ،اقوام متحدہ،نیو یارکopi/15-15377-june1965
3۔الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب،ابن عبدالبر،ابو عمر یوسف بن عبداللہ القرطبی، دارالجیل،بیروت، 1412ھ/1992ء
4۔اسد الغابہ،ابن الاثیر،ابوالحسن علی بن محمد ،تحقیق:عادل احمد الرفاعی،دار احیاء التراث العربی، بیروت 1417ھ/1996ء

5-اسلام اور انسانی حقوق(لیکچر،نومبر2004ء)، عمری، سید جلال الدین
6-"الإسلام وحقوق الإنسان : دراسة مقارنة ،القطب،د/ القطب محمد "،دار الفكر العربي ،ط الثانية 1404ھ
7-الاصابہ فی تمییز الصحابہ،ابن حجر، ابوالفضل احمد بن علی بن حجرعسقلانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ/1994ء
8-اضواء علی الرعایۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام وارتباط الخدمۃ الاجتماعیۃ بھابنائیاووظیفیا،محمدنجیب تو فیق حسن،مکتبۃ الانجلو المصریہ،القاہرہ،1984ء
9-الاعلام،الزرکلی، خیر الدین بن محمود، دار العلم للملائین، بیروت،1423ھ/ 2002ء
10-اقوام متحدہ کا منشور اور اسلامی نقطہ نظر، ابو عمار،زاہدالراشدی، الشریعہ اکادمی گوجرانوالا،1433ھ
11-البدایہ والنہایہ،ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی، دارالفکر، بیروت،1407ھ/1986
12-تاج العروس من جواہر القاموس،محمد مرتضیٰ ربیدی،منشورات دار مکتبۃ الحیاۃ بیروت،بدون تاریخ
13-تاریخ الاسلام ووفیات الاعلام والمشاہیر،الذہبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان ، دارالغرب اسلامی، بیروت، 1419ھ/1998ء
14-تذکرۃ الحفاظ،الذہبی،ابو عبداللہ محمد بن احمد،دار الکتب العلمیہ ، بیروت، 1419ھ/1998ء
15-تربیت الاولاد فی الاسلام
16-ترجمہ فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ
17-التشریع والفقہ فی الاسلام تاریخا ومنھجا، القطان ، مناع بن خلیل
18-التوقیف علی مہمات التعریف، المناوی، محمد عبدالرؤف،دارالفکر،بیروت،1410ھ
19-التعریفات،علی بن محمد،جرجانی،دارالکتاب العربی بیروت،1413ھ
20-تفسیر ابن جریر طبری،محمد بن جریر،دارالکتب العلمیہ بیروت1412ھ
21-تفسیرابن ابی حاتم، ابن ابی حاتم،عبدالرحمان بن ابی حاتم، دارالنشر:المکتبۃ العصریہ
22-تفسیرالقرآن العظیم ،ابن کثیر،اسماعیل بن کثیر،دارالطیبۃ للنشر والتوزیع،1420ھ
23-تفہیم القرآن،مودودی،سید ابوالاعلیٰ مودودی ، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور
24-تہذیب التہذیب،احمد بن علی،ابن حجر عسقلانی،دارالکتب العلمیہ بیروت،1415ھ
25-التوقیف علی مہمات التعریف، المناوی، محمد عبدالرؤف،دارالفکر،بیروت،1423ھ
26-تہذیب اللغۃ، الازہری ،محمد بن احمد، داراحیات التراث العربی،بیروت،2001م
27-جامع البیان العلم، ابن عبدالبر
28-الجامع الصحیح،امام بخاری،ابوعبداللہمحمدبن اسماعیل، دار ابن کثیر ،بیروت،1407ھ/1987ء
29-الجامع الصحیح،امام مسلم ، ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری،دار احیاء التراث العربی، بیروت،1415ھ/1994ء
30-جامع العلوم والحکم ، ابن رجب،عبدالرحمان بن شہاب، دار المعرفة – بیروت ،الطبعة الأولی ، 1408ہ
31-جامع بیان العلم وفضلہ ،یوسف بن عبداللہ،النمری ،مؤسسۃ الریان،دارالعلم،1424ھ
32-الجامع لاحکام القرآن(المعروف بقرطبی)،القرطبی ،محمد بن احمد ، دارعالم الکتب،الریاض،1423ھ

33-حقوق الانسان في الاسلام والرد علي الشبهات المثارة حولها ، الحقيل،سليمان بن عبدالرحمان،مكتبة الملك فهد،الرياض،طبع رابع1424ھ

34-دستور العلماء أو جامع العلوم في اصطلاحات الفنون، القاضي، عبد رب النبي بن عبد رب الرسول الأحمد ، دار الكتب العلمية -بيروت - 1421 هـ

35-رعاية المسننين بين العلوم الوضعية والتصور الاسلامی،الفقی،مصطفیٰ محمد احمد،المكتب الجامعی الحديث،جامعة الازھر قاہرہ2008ء

36-سلسلة الاحاديث الصحيحة، الالبانی ،ناصرالدين ، برنامج منظومة التحقيقات الحديثية،الاسكندريہ

37-سلسلة الاحاديث الضعيفة، الالبانی ،ناصرالدين ، برنامج منظومة التحقيقات الحديثية،الاسكندريہ

38-السنة،عمروبن ابی عاصم، المكتب الاسلامی،بیروت،1400ھ

39-سنن ابو داؤد،ابو داود، سليمان بن الاشعث السجستانی،مكتبة العصريہ، بيروت، 1414ھ/1993ء

40-سنن ابن ماجہ،محمد بن يزيد،داراحياء التراث العربی،بیروت،1395ھ

41-سنن ترمذی،محمد بن عیسیٰ،دارالکتاب العلميہ بیروت،بدون تاريخ

42-سنن دارقطنی،علی بن عمر،دارنشر الكتب الاسلاميہ لاہور،بدون تاريخ

43-سنن نسائی،النسائی،ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی، مکتب المطبوعات الاسلاميہ،حلب،شام، 1406ھ/ 1986ء

44-سير اعلام النبلاء ،الذہبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد، دار الحديث، قاہرہ، 1427ھ/2006ء

45-السيرة النبويہ،ابن كثير، ابو الفداء اسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقی، دار المعرفہ للطباعہ والنشر والتوزيع، بيروت ، 1395ھ/1976ء

46-شرح السنة ، البغوي ،الحسين بن مسعود ، المكتب الإسلامي - دمشق _ بيروت الطبعة : الثانية ، 1403هـ - 1983م

47-شرح صحيح بخاری لابن بطال، أبو الحسن ،علي بن خلف،ا بن بطال ،البكري، القرطبي،مكتبة الرشد ،الرياض ،الطبعة : الثالثة 1425ه

48-شرح مشكل الآثار، ابن سلامة،احمد بن محمد، مؤسسة الرسالة،1415ھ

49-شعب الايمان، البيہقی،احمد بن حسين، مكتبة الرشدللنشر،الرياض،1423ھ

50-الصحاح فی اللغة، الجوہری ،اسماعيل بن حماد،دارالعلم للملائين بيروت،طبع ثانيہ 1399ھ

51-صحيح الترغيب والترهيب، محمد ناصر الدين الألباني،المكتبة المعارف ، الرياض،الطبعة : الخامسة

52-صحيح وضعيف سنن الترمذی، الالبانی ،ناصرالدين ، برنامج منظومة التحقيقات الحديثية،الاسكندرية۔

53-صحيح وضعيف سنن النسائی، الالبانی ،ناصرالدين ، برنامج منظومة التحقيقات الحديثية،الاسكندرية۔

54-صفة الصفوة ،ابن الجوزی، ابو الفرج عبدالرحمن بن علی ،دار الحديث ، قاہرہ، 1421ھ/2000ء

55-الطبقات الكبری،ابن سعد،ابو عبداللہ محمد بن سعد بن منيع، مكتبہ الصديق، طائف، سعودی عرب، 1414ھ/1993ء

56-علم اصول الفقہ، الخلاف،عبداللہ، مكتبة الدعوة،

57-العناية شرح الهداية، البابرتى،محمد بن محمد ، ابو عبد الله ، الرومي ،البابرتي ، دار الفكر،
بدون طبعة وبدون تاريخ
58-عون المعبود شرح ابو داؤد، عظيم آبادی،محمد شمس الحق ، دار النشر ،المكتبۃالسلفیۃ،المدینۃ المنورة،1388ھ
59-العینی،شرح سنن ابو داؤد ،بدرالدین،مکتبۃ الرشد،الریاض،1420ھ
60-غريب الحديث،عبيدابن سلام، الطبعة: الاولى بمطبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية بحيدر آباد الدكن الهند سنة 1384 هـ / 1964 م
61-فتح الباری شرح صحیح بخاری ،ابن حجر،ابوالفضل احمد بن علی بن حجرعسقلانی، دار المعرفہ ،بیروت،1379 ھ/1959ء
62-فتوح البلدان ، البلاذری،احمد بن یحی،
63-فتوح مصر واخبارھا، ابن عبدالحکم،عبدالرحمان بن عبداللہ، دارالفکر ،بیروت،1416ھ
64-الفقہ الاسلامی وادلتہ، وھبۃ الزحیلی،دارالفکر دمشق،طبع ثانیہ 1405ھ
65-الفوائد البھیہ فی تراجم الحنفیہ،عبدالحئی لکھنوی،قدیمی کتب خانہ کراچی،بدون تاریخ
66-فیض الباری علی صحیح البخاری،کاشمیری،سید محمد انور شاہ کاشمیری،مجلس علمی ڈابھیل،1357ھ
67-القاموس المحیط،محمد بن یعقوب فیروز آبادی،دارالفکر بیروت،1415ھ
68-کتاب الام،محمد بن ادریس شافعی،دارسالکتب العلمیہ بیروت،1413ھ
69-کتاب الاموال، ابو عبید،قاسم بن سلام، دارالفکر ،بیروت،1401ھ
70-کتاب الطبقات، ابو عمرو،خلیفہ بن خیاط،دارالفکر،بیروت،بدون تاریخ
71-کتاب الطبقات، ابو عمرو،خلیفہ بن خیاط،دارالفکر،بیروت
72-کشف المشکل من حدیث الصحیحین، ابن
الجوزی،عبدالرحمان،دارالنشر/دارالوطن،الریاض،1418ھ
73-لسان العرب،ابن منظور،محمد بن مکرم،داراحیاء التراث العربی،بیروت،1408ھ
74-لسان المیزان ،ابن حجر، عسقلانی،ابوالفضل احمد بن علی، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت 1406ھ/1998ء
75-لسان العرب، ابن منظور،محمد بن مکرم ، دارصادر،بیروت،
76-المجالسۃ وجواھرالعلم، الدینوری،احمد بن مروان، دار ابن حزم:بیروت،1419ھ
77-المجتبیٰ من السنن، النسائی،(سنن نسائی) ،احمد بن شعیب، مکتب المطبوعات الاسلامیہ،حلب،1406
78-مجلہ منار الاسلام،ابو ظبی،جمادی الاولی،1400ھ
79-مجموع الفتاوٰی، ابن تیمیۃ،احمد بن عبدالحلیم، دارالوفاء،1426ھ
80-المحکم والمحیط الاعظم ، ابن سیدۃ ،علی بن اسماعیل، دارالکتب العلمیۃ،2000م
81-المحلی، ابن حزم،علی بن احمد، دارالفکرللطباعۃ والنشر التوزیع،بدون تاریخ
82-محمد شفیع،مفتی،معارف القُرآن،ادارۃ المعارف،کراچی،1422ھ
83-مداراۃ الناس ،ابن ابی الدنیا ،دارابن حزم،بیروت،1998ء
84-المدخل الفقہی العام،الزرقا،لمصطفیٰ الزرقا، دار الفکر ، ط التاسعة،بدون تاریخ
85-المدخل للفقہ الاسلامی،الدرعان،د/عبداللہ الدرعان ،مکتبة التوبة/ط الأولى 1413ھـ
86-مذکرۃ اصول الفقہ علی روضۃ الناظرللعلامۃ ابن قدامۃ رحمۃ اللہ علیہ ، الشنقیطی،محمد الامین بن المختار
87-مسند ابو داؤد الطیالسی، الطیالسی ،سلیمان بن داؤد، ھجر للطباعۃ والنشر،1419ھ

88-مسند احمد بن حنبل ، ابو عبداللہ،احمد بن حنبل، مؤسسۃ قرطبۃ،القاھرۃ،بدون تاریخ

89-مسند الدارمی ، الدارمی،عبداللہ بن عبدالرحمان، دار الكتاب العربي – بيروت،الطبعة الأولى ، 1407

90-مسند الشامیین، الطبرانی،سلیمان بن احمد، مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت،1405ھ

91-مسندالبزار،البزار،أحمدبن عمرو بنعبدالخالقالبصري،بدون تاریخ

92-المصباح المنیرفی غریب الشرح الکبیر ،الفیومی،احمد بن محمد،بدون تاریخ

93-مصنف ابن ابی شیبہ، ابن ابی شیبہ،عبداللہ بن محمد،دارالقبلۃالسعودیہ،طبع اولیٰ1427ھ

94-معرفۃ التاریخ ،الفسوی ، یعقوب بن سفیان،ابویوسف،الفارسي الفسوي،مؤسسة الرسالة، بيروت،الطبعة: الثانية، 1401 ھ-

95-معالم التنزیل ، البغوی،الحسین بن مسعود، دار طیبۃ للنشروالتوزیع،1417ھ

96-معالم السنن، الخطابی،احمد بن محمد، المطبعۃ العلمیۃ،حلب،1351ھ

97-معجم الصحابة ،عبد الباقي بن قانع ،أبو الحسين ، مكتبة الغرباء الأثرية - المدينة المنورة،الطبعة : الأولى ، 1418

98-المعجم الکبیر ،طبرانی،سلیمان بن احمد،داراحیاء التراث العربی،بیروت1404ھ

99-معجم المصطلاحات الاسلامیہ ،انور محمود زناتی،بدون تاریخ

100-المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم،عبدالباقي ،محمد فؤاد، دار الحديث - القاهرة / 1407ھ-

101-معجم مقاییس اللغۃ،احمد بن فارس، دارالفکر،1399ھ

102-معرفۃ الصحابہ،ابو نعیم،احمد بن عبداللہ، الاصبہانی، تحقیق: عادل بن یوسف العزاری، دار الوطن للنشر، ریاض، 1419ھ/1998ء

103-مغرب میں آزادئ اظہار کاتصور اور اسلام 2017/11/02، عادل فراز

104-مفتاح دارالسعادة،ابن قیم الجوزی،مكتبة حميدو،الإسكندرية ،بدون تاریخ

105-مقدمۃاصول التفسیر، ابن تیمیۃ ،احمد بن عبدالحلیم،دار مکتبۃ الحیات،بیروت،1490ھ

106-المنتقی شرح موطا مالک،الباجی،سلیمان بن خلف،المکتبۃ الشاملۃ

107-المنہاج شرح صحیح مسلم، النووی،یحی بن شرف،داراحیاء التراث العربی،بیروت،1392ھ

108-موسوعۃ الاسرۃ تحت رعایۃ الاسلام، صقر،الشیخ عطیۃ،مکتبہ وھبۃ القاھرہ،1424ھ

109-الموسوعة العربية العالمية (Global Arabic Encyclopedia http://www.mawsoah.net)

110-المؤطا،امام مالک،مالك بن انس بن مالك، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1406 ھ/1985ء

111-النووی،شرح صحیح مسلم،یحی بن شرف،دارالفکر بیروت،بدون تاریخ

112- النهاية في غريب الحديث والأثر ،ابن اثیر ،مبارك بن محمد،دارا الكتب العلمية – بیروت،1418ھ

113-https://ur.wikipedia.org/wiki/